دینی مکالمے
صفائی اور اسلام
داڑھی اور اسلام
لباس اور اسلام
کرکٹ
شراب اور اسلام
کیا دینی تعلیم ضروری ہے؟
جہیز اور اسلام
عصر حاضر کے اذہان کو سامنے رکھ کر
جدید انداز میں اثر انگیز دینی مکالمات
جو عام مسلمانوں اور دینی مدارس کے
طلبہ کے لئے یکساں مفید ہیں۔
مُصنّف
مولانا ذوالفقار احمد قاسمی
استاذ دارالعلوم فلاح دارین، ترکیسر، ضلع سورت (گجرات)
مکتبہ سعیدیہ
ترکیسر، ضلع سورت، گجرات

دینی مکالمے

عصر حاضر کے اذہان کو سامنے رکھ کر جدید انداز
میں اثر انگیز دینی مکالمات جو عام مسلمانوں اور
دینی مدارس کے طلبہ کے لیے یکساں مفید ہیں۔

مصنف

مولانا ذوالفقار احمد قاسمی

استاذ دارالعلوم فلاح دارین، ترکیسر، ضلع سورت (گجرات)

ناشر

مکتبہ سعیدیہ ترکیسر، ضلع سورت، گجرات

تفصیلات

نام کتاب: دینی مکالمے

مؤلف : (مولانا) ذوالفقار احمد قاسمی

استاذ دارالعلوم فلاح دارین، ترکیسر، ضلع سورت (گجرات)

صفحات : ۲۵۰

باہتمام :

سن طباعت: ۲۰۰۶ء مطابق ۱۴۲۷ھ (طباعت دوم)

تعداد : ۱۱۰۰

کمپوزنگ: محمد مہر علی قاسمی (دھنباد، جھارکھنڈ)، جامعہ اسلامیہ اشاعت العلوم، اکل کوا

ناشر : مکتبہ سعیدیہ ترکیسر، ضلع سورت، گجرات

قیمت :

ملنے کا پتہ

☆ ☆ ☆

مکتبہ سعیدیہ ترکیسر، ضلع سورت (گجرات)

MAKTABA-E-SAEEDIYAH

P.O.TADKESHWAR-394170

DIST. SURAT GUJARAT

بسم اللہ الرحمن الرحیم

انتساب

میں اپنی اس کتاب کو مادرِ علمی

”دارالعلوم دیوبند“

کے نام منسوب کرتا ہوں، جس کی آغوش نے مجھے کچھ بولنے اور لکھنے کے قابل بنایا۔

پیش لفظ

الحمدللہ! راقم الحروف کو زمانہ طالب علمی کے طویل دور اور اس کے بعد تدریس کے زمانے میں بہت سے دینی مکاتب و مدارس کے چھوٹے بڑے جلسوں میں شرکت کی سعادت نصیب ہوئی ہے، ان مواقع پر طلبہ کی طرف سے جو پروگرام پیش کیے جاتے ہیں ان میں قرأت، نعت، تقاریر، مقالات کے علاوہ مکالموں کو بھی کافی اہمیت حاصل ہے۔

مکالمہ ایک گفتگو ہے، سائل اور مجیب ایک عنوان کے تحت سوال و جواب کے ذریعہ ایک مدلل گفتگو کرتے ہیں، اس طرح ایک دعویٰ پر بہت سے امکانی سوالات قائم ہوتے اور ان کے جوابات سامنے آتے ہیں جن سے مسئلہ پوری طرح واضح ہو جاتا ہے۔

چوں کہ لوگ مکالموں کو شوق سے سنتے اور ان سے فائدہ اٹھاتے ہیں، اس لیے خیال پیدا ہوا کہ ایسے مکالمے تیار کیے جائیں جن میں کوئی اہم عنوان پر مثبت اور منفی مدلل گفتگو ہو، نہ کہ صرف ہنسنے ہنسانے والے جملے اور مختلف وضع قطع اختیار کر کے تھوڑی دیر کے لیے مجمع کو اپنی جانب متوجہ کرنے کی کوشش۔ بلکہ سب سے زیادہ اس کی کوشش ہونی چاہیے کہ کسی دینی عنوان پر مخالف کی طرف سے موجودہ دور سے متاثر لوگوں کے اعتراض کو سامنے لا کر مجیب کے ذریعے ان کا صحیح جواب دیا جائے تا کہ شرکاء اجلاس طلبہ کی استعداد، ان کے سوچنے کے ڈھنگ، کسی مسئلہ پر بحث کے طریقہ کار اور علمی حیثیت سے اس کو سمجھانے کی صلاحیت کا اندازہ لگا سکیں۔

مکالمہ کا یہ طریقہ جہاں معلومات افزا ہوگا، وہیں دینی مدارس و مکاتب اور ان کے شائستہ اجتماع کے وقار کے مناسب رہے گا، ورنہ دینی طلبہ کے لیے اسٹیج پر مذاق آمیز غیر علمی گفتگو قطعاً نازیبا ہے۔

خصوصاً جب کہ بعض اوقات یہ جلسے، کبھی درسگاہ یا مسجد میں منعقد ہو رہے ہوں، ان ہی باتوں کے پیش نظر، راقم الحرف کی برسوں سے یہ خواہش تھی کہ کبھی علمی موضوعات پر مدلل اور سنجیدہ مکالمے لکھے جائیں، لیکن درسی مشاغل اور علمی بے مائیگی کی وجہ سے اس کی ہمت نہ

ہو سکی کہ کتابی شکل میں کوئی چیز اس موضوع پر تیار کی جاتی، البتہ عزیز طلبہ کی فرمائش پر وقتاً فوقتاً انجمن اور سالانہ اجلاس کے لیے جو مکالمے لکھے گئے وہ احباب نے کافی پسند کیے اور شوق سے سنے گئے، بعد میں بعض احباب کا اصرار ہوا کہ مکاتب و مدارس کے جلسوں کے لیے عموماً مکالموں کی ضرورت رہتی ہے اس لیے ان سب کو کتابی شکل میں چھپوا دیا جائے، تو ان مکالموں سے طلبہ کو فائدہ ہوگا نیز ان کی روشنی میں ان کو دوسرے عنوانات پر مکالمے تیار کرنے میں مدد ملے گی۔

راقم اگر چہ اس مجموعہ کو اس قابل نہیں سمجھتا تھا کہ اس کو چھپوایا جائے، مگر احباب کے پیہم اصرار کی وجہ سے مجبور ہونا پڑا۔ بہر حال پراگندہ خیالات کی یہ کتاب اگر طلبہ کے لیے مفید ثابت ہو تو راقم الحروف اپنے لیے ذخیرۂ آخرت سمجھے گا۔

میں اس کتاب کے مسودہ کی تبییض کے لیے عزیز القدر مولانا بشیر احمد حسن صاحب خانپوری کا شکر گزار ہوں جنہوں نے چھوٹے بڑے مختلف کاغذات میں پھیلے ہوئے ان مضامین کو یکجا کرنے میں میری کافی مدد فرمائی۔ اللہ تعالیٰ ان کو اس معاونت کا بھرپور اجر عطا فرمائے۔ (آمین)

پہلے یہ کتاب دو حصوں میں شائع ہوئی تھی، سائز بھی چھوٹی تھی، اب دوبارہ بڑی سائز پر مکمل ایک ہی جلد میں شائع کی جا رہی ہے، نظر ثانی بھی کر لی گئی ہے جس کی وجہ سے ترمیم و تنسیخ عمل میں آئی ہے۔ نیز دس نئے اہم مکالمات کا اضافہ بھی کیا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ اس حقیر کوشش کو قبولیت سے نوازے۔ آمین!

احقر (سید) ذوالفقار احمد نزوری (قاسمی)
مقام: نزور، ضلع شیوپوری (ایم پی)
۱۲/ اکتوبر ۱۹۹۴ء

فہرست عنوانات

(۱) صفائی اور اسلام

شکیل: السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔

رشید: وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ۔

شکیل: رشید بھائی! کیا بات ہے؟ آپ تو بہت اجلے اجلے جھک پک نظر آرہے ہو، معلوم ہوتا ہے جیسے بادشاہ زادے ہو، طالب علم کا زمانہ اور ٹھاٹ باٹ! اللہ رحم کرے، کیا زمانہ آگیا ہے۔

رشید: شکیل بھائی! کیا ہوگیا کہ آپ اتنا افسوس کررہے ہیں، میں نے کونسا غضب ڈھایا۔ ارے دھلے ہوے صاف ستھرے کپڑے پہننا اور پاک صاف رہنا بھی کیا بری بات ہے۔

شکیل: جناب! اس سے زیادہ بری بات اور کیا ہوگی کہ آدمی اپنے ظاہر ہی کو سنوارنے میں لگا رہے۔ اسلام نے اس کو انتہائی ناپسند قرار دیا ہے۔

رشید: شکیل بھائی! آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ بھلا صفائی اور اسلام میں بھی تضاد ہوسکتا ہے، نظافت اور صفائی تو اسلام کے بنیادی احکام ہیں۔

شکیل: آپ کا کہنا ٹھیک ہے مگر صفائی سے مراد صفائی باطن اور تزکیۂ نفس ہے، نہ کہ ظاہر کی چٹک پٹک، بناؤ سنگار جو آج کل کے طلبہ نے شروع کیا ہے، یہ تو عورتوں کو زیب دیتا ہے، مرد کو تو مرد بن کر رہنا چاہئے، اس کو تو محنتی اور مضبوط بن کر رہنے کی ضرورت ہے۔

رشید: بھائی! اس کا مطلب تو یہ ہے کہ بدن کا صاف رکھنا، کپڑوں کا صاف رکھنا اور مکان کا صاف رکھنا بالکل غیر اسلامی چیز ہے، اگر آپ یہ سمجھتے ہیں تو یہ بات بالکل غلط ہے، معلوم ہوتا ہے آپ نے اسلام کا مطالعہ نہیں کیا۔ اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جس نے پاکی صفائی اور نظافت کے وہ احکامات دیئے ہیں جن کا وجود کہیں اور ملنا دشوار ہے، کیا آپ اسلام کے اس امتیاز کو ختم کرنا چاہتے ہیں، جس مذہب نے پانچ مرتبہ نماز کے لیے وضو کو ضروری قرار دیا ہو، جس شریعت نے جنابت کی شکل میں غسل کو فرض کیا ہو،

پیشاب کے بعد ڈھیلے استعمال کرنے کو کہا ہو، گھر اور اطراف کو پاک صاف رکھنے کا حکم دیا ہو، گندگی کی شکل میں فرشتوں کی تکلیف کا احساس دلایا ہو، خوشبوں کو پسندیدہ چیز قرار دیا ہو، مجامع میں اچھے لباس کی ترغیب دی ہو آپ کیسے فرمارہے ہیں کہ اسلام صفائی کو پسند نہیں کرتا بلکہ وہ تو صرف صفائی باطن کا طالب ہے، معلوم ہوتا ہے کہ آپ کتاب الطہارۃ کے سبق میں غیر حاضر رہے ہیں، یا درس میں رہ کر سوتے رہتے ہوں گے۔

شکیل: میاں! ذرا ہوش سنبھال کر بات کرو، کل کے بچے اور یہ انداز، مجھ سے کہتے ہو کہ "کِتَابُ الطَّهَارَةِ" نہیں پڑھی۔ اجی! کہاں کی "کِتَابُ الطَّهَارَةِ"۔ آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ میں حدیث کا طالب علم ہوں، تم نے ابھی نور الایضاح تو پڑھی نہیں ہے اور چلے مجھ جیسے عالم فاضل کو جواب دینے، جس کی ساری زندگی منشائے نبی کو سمجھنے میں گزر گئی، میاں شریعت کا منشاء یہ ہے کہ ظاہر کی پاکی میں مت لگو، دل کی دولت حاصل کرو، دل صاف کرو، اصل پاکی یہی ہے۔

رشید: آپ تو خفاء ہوگئے، میں آپ کے علم وفضل کا انکار نہیں کرتا بلکہ آپ کا احترام کرتا ہوں، یہ گفتگو تو اس لیے ہورہی ہے کہ میں آپ سے سمجھنا چاہتا ہوں کہ حق کیا ہے، اگر میں غلط سمجھا ہوں تو آپ مجھے مطمئن فرمائیں، گرم ہونے کی کیا بات ہے، آپ فرمارہے ہیں کہ اصل صفائی تو صرف دل کی ہے، تو کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ بس دل کو صاف رکھو، مکان کپڑے لتے اور ہاتھ پیر چاہے گندگی میں ملوث رہیں، میں سمجھتا ہوں کہ اسلام اس کو قطعاً برداشت نہیں کرسکتا۔ اسلام نے جہاں باطن کی صفائی کے لیے ابتدا میں کلمہ پڑھوا کر "لاالٰہ" کے ذریعہ غیر اللہ کی نفی کر کے عقیدے کو صاف ستھرا بنایا ہے وہیں نماز کے لیے وضو، غسل کو ضروری قرار دے کر ظاہری نجاستوں سے بھی پاک رہنے کی ہدایت کی ہے میرا خیال ہے کہ اگر ظاہری صفائی کو اسلام میں کوئی درجہ نہ دیا جاتا تو اسلام فطری مذہب ہی نہ ہوتا اور کوئی بھی نظیف الطبع انسان اسلام نہ لاتا۔

شکیل: ارے بچے حد سے مت بڑھ، باتیں مت بنا، میں جو کچھ کہہ رہا ہوں مدلل کہہ رہا ہوں۔ حدیث میں ہے: "البذاذۃ من الإیمان" یعنی سادگی پراگندہ حالی ایمان کی علامت ہے حدیث میں ہے کہ بہت سے پراگندہ بال و پراگندہ حال لوگ اللہ کے یہاں اتنا بڑا درجہ رکھتے ہیں کہ اگر کسی بات پر قسم کھا بیٹھیں تو اللہ تعالیٰ ان کی لاج رکھتے

ہیں، حدیث میں روزانہ کنگھا کرنے اور بن سنور کر رہنے کو پسند نہیں کیا گیا، صحابہؓ کی
زندگی سادہ تھی، وہ ایک جوڑا کپڑا رکھتے تھے، اسی کو دھولیا پہن لیا، ان کے یہاں ٹیپ
ٹاپ نہیں تھی، اکثر ان کے کپڑوں میں پیوند لگے ہوتے تھے، ان کے کپڑوں میں پسینے کی
بواور دھبے رہتے تھے، گھوڑے کی سواری، گرم علاقہ، پانی کی قلت پھر کپڑے بھی ان کے
پاس کم، اس حالت میں صفائی کا کیا سوال، مکان چھوٹے بلا کھڑکی کے، موٹا جھوٹا کھانا،
ان کی تو یہ زندگی تھی اور آپ ہیں کہ ٹھاٹ پر ٹھاٹ بڑھا رہے ہیں، قرآن میں ہے کہ اللہ
کے نزدیک ذی عزت وہ شخص ہے جو متقی ہو نہ کہ وہ جو کپڑے صاف پہنتا ہو، ایک مرتبہ
قارون اچھے کپڑے پہن کر نکلا اس کو دیکھ کر اہل ایمان نے للچائی نگاہ ڈالی، اللہ تعالیٰ نے
قارون کو دھنسا دیا۔ اس واقعہ سے اہل ایمان کو تنبہ ہوا کہ اچھے کپڑے پسندیدہ نہیں،
اسلام نے تو گندگی کی مقدار تک مقرر کر دی ہے کہ اتنی لگی ہو تو کوئی حرج نہیں، صرف
ڈھیلے سے استنجا کو کافی سمجھا گیا ہے، ہمارے اکابر نے کبھی اچھے کپڑے نہیں پہنے،
حضرت نانوتویؒ کو دیکھ کر کوئی پہچان بھی نہیں سکتا تھا کہ یہ عالم ہیں، سادہ لنگی، بٹن کی جگہ
کانٹے اور بات بھی سمجھ میں آتی ہے کہ جو زیادہ وقت ٹیپ ٹاپ پر لگائے گا وہ پڑھے گا
لکھے گا کب، ایسے بچے عموماً جاہل رہتے ہیں اس لیے بھائی بات مانو اور صفائی ستھرائی
سے باز آؤ۔

رشید: ہائے افسوس! آپ جیسا اپنے آپ کو عالم فاضل کہنے والا شخص اتنی بات نہیں سمجھ
سکا کہ اسلام میں گندگی اور ناپاکی کی کوئی جگہ نہیں اس کو اگر نفرت ہے تو گندگی سے
پھوہڑپن سے، حدیث میں ہے کہ اپنے گھر اور اس کے اطراف کو صاف رکھو، جو اسلام
گھر کے اطراف کو صاف رکھنے کو کہے بھلا وہ جسم پر گندگی کیسے برداشت کرے گا،
حدیث میں ہے کہ ایک صحابی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے، بال بکھرے ہوئے
پراگندہ حال، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کنگھا منگا کر خود ان کے بال سنوارے، تیل ڈالا
اور آئینہ دکھا کر فرمایا، دیکھو اب اچھے لگ رہے ہو یا پہلے اچھے لگتے تھے، اور فرمایا کہ
ذرا صاف ستھرے رہا کرو۔ "اَللّٰہُ جَمِیْلٌ وَ یُحِبُّ الْجَمَالَ" ۔ (ترجمہ: اللہ تعالیٰ
جمیل ہے اور جمال کو پسند کرتا ہے)۔ صاف رہنا آدمی کی فطرت ہے بل کہ جانور بھی
صاف رہنا پسند کرتا ہے، جانور اپنے بیٹھنے کی جگہ جھاڑ کر بیٹھتا ہے، اپنی زبان سے اپنے

جسم کو صاف کر لیتا ہے، صحابہؓ یقیناً اعلیٰ لباس نہیں پہنتے تھے، مگر صاف پہنتے تھے، دھوکر
پہنتے تھے، بلکہ ابتدائی حالات کے بعد جب اللہ تعالیٰ نے صحابہؓ کو خوشحال کر دیا تو بعض
صحابہؓ کرام اچھا لباس پہننے میں ممتاز تھے، البتہ لباس میں فخر، کبر وغرور نہ ہونا چاہئے
حدیث میں ہے کہ کپڑا جب تک صاف ستھرا رہتا ہے، اللہ تعالیٰ کی تسبیح کرتا رہتا ہے اور
جب میلا ہو جاتا ہے تو تسبیح چھوڑ دیتا ہے، بلکہ جمعہ کا غسل ابتدائے اسلام میں فرض اسی
لیے قرار دیا گیا تھا کہ لوگوں کے کپڑوں سے بو آتی تھی، گندے لباس سے فرشتوں کو اور
نظیف الطبع لوگوں کو تکلیف ہوتی ہے اور مسلمان کسی کو تکلیف نہیں دیتا مسلمان کا ظاہر اور
باطن دونوں جاذب نظر ہوتے ہیں ظاہر کی گندگی باطن ہی کی گندگی کا عکس ہوتی ہے جس
کا ظاہر پاک ہو سمجھ لو کہ اس کا باطن بھی ضرور پاک ہوگا، جبھی تو اس نے ظاہر کی پاکی پر
مجبور کیا، قرآن مجید میں قبا کے لوگوں کی تعریف ان کی زیادتی نظافت پر ہی کی گئی، طبی
لحاظ سے صفائی سیکڑوں امراض سے بچاتی ہے، کیا اتنی اچھی چیز کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم
اپنی تعلیمات میں جگہ نہ دیتے، بلکہ دس ۱۰ چیزوں کو حدیث میں خصال فطرت میں شمار
کرایا گیا ہے، جن میں سب کا تعلق صفائی سے ہے، مسلمان کی وہ عبادت جس کی وجہ سے
مسلمان غیر مسلم سے ممتاز ہے اس کی شرط اول ہے بدن کی پاکی، لباس کی پاکی، جگہ کی
پاکی ہے، ذرا سی پیشاب کی بے احتیاطی پر قبر کے عذاب کی کتنی بڑی وعید سنائی گئی ہے۔
افسوس! مسلمانوں نے اپنی ان متبرک اور مایۂ ناز تعلیمات کو بھلا دیا، اور میلے کچیلے رہنے
کی ایسی مثال قائم کر دی کہ آج لوگ مسلم محلّہ کا تعارف یوں کراتے ہیں کہ جہاں زیادہ
میلے کچیلے کپڑے والے بچے کھیل رہے ہو سمجھ لینا وہ مسلم محلّہ ہے۔ یاد رکھو! پانی کی اتنی
قلت والے علاقے میں جب اسلام نے صفائی پر اتنی توجہ دی تھی، تو اب پانی کی فراوانی
والے علاقوں میں تو اس پر دھیان نہ دینا اور بڑا ظلم ہوگا، یہ آپ نے جو احادیث پڑھی ہیں
اور جو آیات کا مطلب سمجھا ہے ان کا قطعاً یہ منشاء نہیں ہے کہ گندے اور میلے اور کچیلے
رہنے کی اسلام تعلیم دیتا ہے، بلکہ اس کا منشاء صرف اتنا ہے کہ مرد، عورتوں کی طرح سنگار
نہ کرے، اور حد سے بڑھے ہوئے طریقے اختیار نہ کرے، بلکہ صرف صفائی پر زور دے،
چاہے کپڑا معمولی ہو؛ اور اتنا وقت اس پر صرف نہ کرے کہ دینی مقاصد میں کوتاہی واقع
ہو، اگر بعض انتہائی خدا رسیدہ اور فانی فی اللہ یا مجذوب قسم کے اولیاء اللہ نے اپنی بے

خودی یا وارفتگی میں لباس و بدن کی صفائی کا لحاظ نہیں رکھا تو اس کو عام انسانوں کے لیے قانون نہیں بنایا جائے گا، صاف ستھرے انسان سے ہر ایک قریب ہونا چاہتا ہے، ہر شخص اس سے محبت کرتا ہے اس کی بات سنتا ہے، اسی لیے تمام انبیاء باوجود زاہدانہ زندگی کے صفائی کے عادی رہے ہیں؛ میرے بھائی اگر آپ میری ان باتوں کو غلط سمجھتے ہیں تو عقلی ونقلی دلائل سے ثابت کیجئے کہ گندہ سندہ رہنا اسلامی تعلیم ہے۔

شکیل: رشید! تم ہو تو بچے مگر تم نے باتیں بڑی سمجھ کی کی ہیں میں تو تمہارا امتحان لینے کے لیے صفائی کے خلاف بول رہا تھا تا کہ دیکھوں کہ تمہاری معلومات اور خیالات صفائی کے بارے میں کیا ہیں میں سنا کرتا تھا کہ تمہارے مدرسہ میں صفائی کا بڑا لحاظ ہے۔ مدرسہ کا ماحول بڑا صاف ستھرا ہے۔ وہاں کے مہتمم صاحب صفائی پر بڑا زور دیتے ہیں اور انہوں نے قابل تقلید صفائی کا ماحول بنا رکھا ہے، آج تم سے باتیں کر کے معلوم ہوا کہ صفائی کا ماحول ہی نہیں بنا رکھا ہے بلکہ صفائی کو عقیدہ کے طور پر دل و دماغ میں ایسا بٹھا دیا ہے کہ وہاں کا طالب علم صفائی کے خلاف سن نہیں سکتا، اور صفائی پر اچھا خاصا بیان دے سکتا ہے۔ الحمدللہ! میں نے جیسا سنا تھا ویسا ہی پایا۔ میں نے گفتگو کے درمیان جو تم کو برا بھلا کہا اس کو معاف کرنا، یہ سب تمہاری قوت برداشت کو دیکھنے کے لیے کہہ رہا تھا۔

رشید: شکیل صاحب! آپ بزرگوں ہی کی دعا کی برکت ہے کہ ہمارے مدرسہ میں یہ فضا قائم ہوئی ہے، آپ مزید دعا فرمائیں کہ تمام طلبہ صفائی ستھرائی کو جزو لازم سمجھ لیں اور اس کا ہمیشہ خیال رکھیں آپ نے مجھے کچھ برا بھلا نہیں کہا، بڑوں کا حق ہے کہ اپنے چھوٹوں کا امتحان لیتے رہیں، ان کو مناسب تنبیہہ کرتے رہیں، میں آپ کا بہت ہی شکر گذار ہوں۔ السلام علیکم

شکیل: وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔

(۲) لباس اور اسلام

سعید: رشید صاحب! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔

رشید: وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔

سعید: رشید صاحب! کل آپ کے صاحبزادے کا لباس دیکھا مسلمان اور یہ لباس افسوس کیا زمانہ آگیا ہے۔

رشید: ارے صاحب! آپ کیا فرما رہے ہیں کیا غضب ہوگیا کہ اس بھرے مجمع میں آپ مجھے اس طرح رسوا کر رہے ہیں۔

سعید: جی ہاں! یہ ہی زمانہ آگیا ہے کہ آپ کی اولاد غیر اسلامی کام کرے اور کسی کو ٹوکنے کا حق نہ ہو۔

رشید: مولانا صاحب! کیا غیر اسلامی کام ہوگیا، کیا کپڑے پہننا بھی غیر اسلامی کام ہے۔

سعید: نہیں صاحب! کپڑے پہننا غیر اسلامی فعل نہیں مگر اس طرح کے کپڑے پہننا ضرور اسلام پسند نہیں کرتا۔

رشید: اس کا مطلب تو یہ ہے کہ کپڑوں کے بارے میں بھی اسلام کوئی قانونی پابندی عائد کرتا ہے، میں سمجھتا ہوں ایسا نہیں ہوگا پابندیاں تو آپ جیسے خشک زاہدوں نے لگا رکھی ہیں ہم نے تو سنا ہے کسی بڑے اللہ والے کا قول ہے ’’درعمل کوش ہرچہ خواہی پوش‘‘ بھائی جو چاہے پہنو، اپنا باطن سنوارو، یہ ظاہر داری میں کچھ نہیں رکھا، آدمی کی اصل چیز اس کے نیک اعمال ہیں وہ اچھے ہوں پھر اس کا ظاہر کیسا بھی ہو، ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ’’اِنَّ اللّٰهَ لَا يَنْظُرُ اِلٰى صُوَرِكُمْ وَ لَا اِلٰى اَجْسَامِكُمْ وَ لٰكِنْ يَّنْظُرُ اِلٰى قُلُوْبِكُمْ‘‘۔ بھلا جس نبی کا یہ ارشاد ہو، کیا وہ ظاہر داری پر کوئی قدغن لگائے گا؟ صحابہ اپنی اپنی حیثیت کا جو چاہتے تھے لباس پہنتے تھے، نبی نے کبھی ان پر کوئی روک ٹوک نہیں کی۔ شیخ سعدی نے کیا اچھی بات کہی:

’’دلقت بچہ کار آید و تسبیح و مصلی۔ خود راز عمل ہائے نکوہیدہ بری دار‘‘

اپنے آپ کو برے اعمال سے بچاؤ، ورنہ کوئی بھی عبادت اور گدڑی پوشی کام آنے والی نہیں۔ میں سمجھتا ہوں لباس کے سلسلے میں لوگوں کو آزاد چھوڑ دینا چاہئے۔

سعید: ہائے افسوس! آپ نے تصویر کے صرف ایک رُخ کو دیکھا، آپ کو معلوم ہونا چاہئے ظاہر اور باطن دونوں آپس میں جڑے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کا عکس دوسرے پر پڑتا ہے۔ اگر باطن اچھا ہوگا اس میں للّٰہیت ہوگی، دل میں تواضع اور انکساری ہوگی تو اس کا اثر ظاہر پر ضرور پڑے گا، بھلا وہ اسلام جو ظاہر و باطن دونوں کے درست کرنے کا مدعی ہے وہ صرف ایک ہی پہلو پر کیسے زور دیتا، نیک صورت نیک سیرت کا عکس ہوتی ہے اہل اللہ کے لباس کا اقتدا کرنے والے ہی درحقیقت وہ لوگ ہیں جو اپنے دل میں صفائی رکھتے ہیں، ظاہر میں غیروں کی اتباع اور باطن میں ولایت کا دعویٰ یہ درحقیقت نفس کا بہت بڑا دھوکا ہے، حدیث میں ہے ''مَنْ تَشَبَّہَ بِقَوْمٍ فَھُوَ مِنْھُمْ'' جو شخص جس قوم کے طرز پر رہن سہن اور وضع قطع اختیار کرے گا کل قیامت میں اس کا حشر اسی قوم کے ساتھ ہوگا، اس لیے اگر ایک مسلمان چاہتا ہے کہ آخرت میں اس کو اہل اللہ کی معیت نصیب ہو تو اس کو ان کی اتباع کرنی پڑے گی؛ آپ نے جو حدیث پڑھی ہے اس کا حاصل یہ کہ اللہ صرف اجسام اور صورتوں کو ہی نہیں دیکھتے، بلکہ اس کے ساتھ ساتھ قلوب کی صفائی بھی ضروری ہے، یعنی یہ بات اس موقع پر کہی جا رہی ہے، جب آدمی اس غلط فہمی میں مبتلا ہو کر صرف ظاہری وضع قطع ہی اصل ہے، تو اس کی تردید میں کہا گیا کہ صرف ظاہر ہی مطلوب نہیں بلکہ باطن بھی مطلوب ہے، تو گویا دونوں ہی مطلوب ہیں یہ ہی مطلب ہے ان اہل اللہ کے ارشادات کا جن میں باطن کے اعمال کو درست کرنے کو کہا گیا ہے، یعنی مطلب یہ ہے کہ صرف ظاہر کی درستی کافی نہیں بلکہ دونوں مطلوب ہیں یعنی حقیقت بھی مطلوب اور صورت بھی مطلوب؛ مگر لوگ اس کا غلط مطلب سمجھ کر گمراہ ہو رہے ہیں، کیا وہ اولیاء اللہ جن کے مقولے آپ نے پڑھے ہیں۔ ان میں کسی کا ظاہر اہل اللہ کے ظاہر سے مختلف تھا۔

رشید: اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی اسلامی لباس اور اہل حق کا لباس مقرر ہے، جس کو پہننا ضروری ہے، چاہے آپ کسی ملک میں، کسی علاقے میں رہتے ہوں۔ ارے خدا کے بندو! ہر ملک کی آب و ہوا الگ، بھلا وہ لباس جو کناڈا جیسے سرد ملک کے باشندے کے

لیے ضروری ہے۔ اس کو عرب کے گرم ترین علاقے کا آدمی کیسے پہن سکتا ہے۔ اسی طرح عرب کا لباس سرد ملکوں میں کیسے پہنا جا سکتا ہے، لباس تو لوگوں میں ملکوں کی آب و ہوا کے پیش نظر رواج پاتا ہے، لہٰذا اس پر پابندی کوئی مذہب کیوں لگانے لگا، خصوصاً اسلام جو ہمہ گیر اور بین الاقوامی مذہب ہے جس کے ماننے والے دنیا کے ہر ملک میں آباد ہیں وہ لباس کی حد بندی کیوں کرنے لگا لباس ایک ایسی ضرورت کی چیز ہے، جس کا معیار ہر ملک ہر شخص کے حالات کے لحاظ سے بدلتا رہتا ہے۔ ظاہر ہے جو غریب کا لباس ہے وہ امیر کا لباس نہیں ہو سکتا، اگر امیر، غریب جیسا لباس پہنے گا تو ''وَ اَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّکَ فَحَدِّثْ'' کے خلاف کرے گا، اس لیے میرے محترم آپ جو کچھ سمجھے ہیں وہ بالکل غلط ہے، آپ اپنی غلطی کا احساس فرمائیں۔

سعید: جناب! اس سے کون انکار کرتا ہے کہ ہر ملک و خطے کے لوگ اپنے اپنے ملک کی آب و ہوا کا لحاظ کر کے لباس پہنیں، اس میں شک نہیں کہ اسلام نے کسی مخصوص قسم کے لباس کو بطور یونی فارم کے منتخب نہیں کیا ہے کہ مسلمان صرف وہ کہلائے گا جو لنگی کرتا پہنے ورنہ کافر ہو جائے گا، بلکہ اسلام نے کچھ اصول لباس کے سلسلے میں بنائے ہیں، جن کا لحاظ کر کے ہر قسمی لباس پہنا جا سکتا ہے اور وہ اسلامی لباس ہی کہلائے گا۔

رشید: اچھا! تو وہ اصول کیا ہے؟

سعید: وہ اصول یہ ہیں: لباس ایسا ہو جو ساتر ہو، تا کہ جن اعضاء کا چھپانا ضروری ہے وہ ظاہر نہ ہوں، لباس ایسا ہو جس میں کبر و غرور کی بو نہ ہو، عورتوں کا لباس مرد اور مردوں کا لباس عورتیں نہ پہنیں، مسلمان ایسا لباس نہ پہنیں جو کسی قوم یا فرقے کا علامتی اور مخصوص لباس ہو جس کے پہن لینے سے مسلمان کا پہچاننا مسلمانوں کے لیے دشوار ہو جائے، لباس ریشم اور حریر کا نہ ہو، لباس میں ان رنگوں کا انتخاب نہ کیا جائے جو عورتوں کے لیے مخصوص رنگ سمجھے جاتے ہیں، لباس میں اس کی رعایت ہو کہ جس علاقے میں وہ پہنا جا رہا ہے وہ لباس وہاں کے نیک لوگوں اور شریف اور دیندار لوگوں کا لباس ہو، یہ نہ ہو کہ وہ لباس وہاں کے آوارہ اور بد دین لوگوں میں رائج ہو۔ اس کو مثال کے طور یوں سمجھئے، ہر ملک میں چاہے وہ مشرقی ملک ہو، چاہے مغربی، دو قسم کے لوگ ہوتے ہیں: کچھ لوگ شریف اور اعلیٰ اخلاق کے ہوتے ہیں، اور کچھ آوارہ اور غیر مہذب، اور دونوں

کے لباس ان ملکوں میں بھی الگ الگ ہوتے ہیں، کچھ نہیں تو تھوڑا بہت فرق ضرور ہوتا ہے، بس اب اسلامی تعلیم یہ ہے کہ ہر ملک والا اپنے یہاں کے نیک اور اچھے لوگوں والا لباس پہنے، اسی کو اسلامی لباس سمجھا جائے گا۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ اسلام نے لباس کی تراش خراش اور پیائش مقرر کر رکھی ہے کہ اتنے انچ اور گرہ کی کلی ہو، اور اتنے کی مہری ہو، ظاہر ہے کہ اگر ایسا ہوتا تو انتہائی تنگی ہو جاتی، ہمارے ملک ہندوستان میں بھی دو قسم کے لباس ہیں: ایک آوارہ لوگوں کا لباس ہے جو انتہائی چست، بدنما، بدن کو تکلیف دہ ہے، دوسرا اہل دین اور شریف لوگوں کا لباس ہے، اب جو شخص جیسا لباس پہنے گا، اس کا شمار اسی میں ہوگا۔ یہ وہ زریں اصول ہیں جو اسلام نے لباس کے سلسلے میں طے کئے ہیں، جو مسلمان ان اصولوں کی رعایت رکھ کر لباس اختیار کرے گا اس کو قطعاً ملامت نہیں کی جائے گی۔

رشید: محترم آپ نے جو بات فرمائی ہے وہ بہت اچھی ہے، میں ان باتوں کی قدر کرتا ہوں، مگر آپ سے سوال کرتا ہوں کہ جو نوجوان کالجوں میں پڑھتے ہیں یا دفتروں میں ملازمتیں کرتے ہیں اگر آپ کے کہنے کے مطابق ملک کے نیک لوگوں کا جو لباس ہے وہ پہنیں تو نفسیاتی طور پر ان کو اپنے ساتھیوں کے سامنے، اپنے اسٹاف کے سامنے ذرا شرمندگی ہوگی، کبھی کبھی وہ احساس کمتری کا شکار ہو جائیں گے۔ ظاہر ہے اہلِ دین یا نیک لوگوں کا لباس سادہ ہوگا، اس میں کر وفر نہیں ہوگا۔ اب دفتر میں سب لوگ ایک طرح کا لباس پہنتے ہیں اور مسلمان دوسرے لباس میں جائے تو ذرا اوپرا پن معلوم ہوتا ہے، اجنبیت سی معلوم ہوتی ہے، لوگوں کی نگاہیں اٹھتی ہیں، بعض دفعہ مذاق اور تمسخر تک نوبت آجاتی ہے، تو کیا ایسی شکل میں کوئی رعایت نہیں مل سکتی۔

سعید: آپ نے جو بات فرمائی وہ آپ کے دل کی بات تھی، جو آپ نے اب کہی کاش کہ اس کو ابتداء ہی میں کہہ دیتے تو بات جلد ختم ہو جاتی، بھائی صاحب آپ نے جو بات کہی یقیناً اسی میں سارے مسلمان مبتلا ہیں، جہاں تک اصولی گفتگو کا تعلق ہے تو یہ کم ہمتی کی بات ہے کہ آدمی اپنے لباس کو اوروں کے لباس کے مقابلہ میں ہیچ سمجھے، جب خود آپ ہی ہمت ہار دیں گے تو دوسرے فائدہ اٹھائیں گے، آخر جب انہوں اپنے لباس کو تمہاری نگاہ میں مرغوب بنایا، آپ ان پر کیوں اثر نہیں ڈال سکتے۔ خیر! اگر یہ نہ ہو سکے تو

کم از کم اپنے خود کے ارادے میں پختہ رہیں کیا سکھ قوم نے اپنے یونیفارم، اپنی دستار، پگڑی کو ملٹری جیسی ملازمت میں باقی نہیں رکھا، کیا دفتر میں جانے کے لیے انہوں نے کبھی ڈاڑھی منڈائی، جب ایک قوم کی مثال ہمارے سامنے ہے تو ہم اپنی وضع قطع میں کیوں عار محسوس کریں؟ یہ عار اس لیے محسوس ہوتی ہے کہ کچھ مسلمانوں نے اپنا رویہ بدل دیا ہے، اگر سارے مسلمان لباس اور وضع قطع کے بارے میں ایک طرز اختیار کریں تو ان کا یہ قومی شعار کہلائے گا، کوئی ان کو نہیں چھیڑ سکتا، بلکہ دنیا ان کا احترام کرے گی، اور حکومت بھی اس کو تسلیم کرنے پر اپنے آپ کو مجبور پائے گی، آج بھی بہت سے ہندو اپنی دھوتی اور کرتے میں بڑے بڑے عہدوں میں کام کرتے ہیں، انہیں کوئی شرم نہیں، وہ اسی لباس میں غیر ملکی سفر کرتے ہیں، کاش کہ مسلم نوجوان اپنے ارادوں کو مضبوط کریں، اگر کچھ نہیں ہو سکتا تو کم از کم حد سے تو نہ بڑھیں کہ ہر آنے والے فیشن کا استقبال مسلمان بھی غیروں کی طرح کرنے لگے، خدا کے واسطے اپنے آپ کو سنبھالو، ارادوں کو مضبوط کرلو، اللہ تعالیٰ آپ کی مدد کرے، ہم تو چاہتے ہیں کہ کچھار محمدی کا شیر الگ سے پہچانا جائے۔

رشید: جناب! آپ نے تو میری روح کو بیدار کر دیا آپ کتنے اچھے آدمی ہیں، آپ سے مل کر ہمیں بڑی خوشی ہوئی، اگر آپ جیسے ذہن کے لوگ مسلم قوم کو سمجھاتے رہے تو انشاء اللہ ضرور کچھ نتائج حاصل ہوں گے، آج اصل مسئلہ یہ ہی ہے کہ لوگ خود سے تھوڑا بہت پڑھ کر اپنی سمجھ سے الٹا سیدھا جو سمجھ لیتے ہیں اسی کو اسلام سمجھتے ہیں، اگر وہ اہل علم سے ملیں، اپنے شبہات ان کے سامنے رکھیں تو انشاء اللہ ان کو فائدہ ہوگا، نیز عوام و خواص میں ایک ربط پیدا ہوگا۔

سعید: مجھے بھی آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی، خصوصاً اس بات سے کہ آپ نے کسی بات کے معلوم کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں کی، آپ میری بات کو مسلم نوجوانوں تک ضرور پہنچائیے جو لباس کی حد تک شرعی حدود سے بہت آگے بڑھ گئے ہیں۔

رشید: میں انشاء اللہ آپ کی بات اپنے بچوں کے سامنے رکھوں گا، اب اجازت دیجئے۔ السلام علیکم۔

سعید: وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ۔

(۳) انجمن

یوسف: السلام علیکم یونس صاحب!

یونس: وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔

یوسف: یونس صاحب! کیا بات ہے دو تین روز سے آپ سبق میں نظر نہیں آرہے ہیں کیا بیمار تو نہیں ہو۔

یونس: نہیں صاحب! خدا کا شکر ہے، میں صحت مند ہوں۔

یوسف: پھر اسباق میں غیر حاضری کیوں؟

یونس: ارے بھائی! اپنی انجمن اصلاح الکلام کا سالانہ جلسہ ہونے والا ہے میں اس کی تیاری میں مصروف ہوں، آپ تو انجمن سے ایسے الگ تھلگ رہتے ہیں جیسے انجمن کی آپ کے نزدیک کوئی اہمیت ہی نہ ہو۔

یوسف: یونس صاحب! سچ یہ ہے کہ میں انجمن کو زمانۂ طالب علمی میں قطعاً مفید نہیں سمجھتا، یہ زمانہ تحصیل علم کا ہوتا ہے نہ کہ انجمن سازی کا، یہ سب شیطانی فریب ہے جس میں مبتلا ہو کر طالب علم اپنا وقت برباد کرتے ہیں۔

یونس: یوسف صاحب! مجھے آپ کے اس خیال سے اختلاف ہے آپ سے مجھے یہ توقع نہیں تھی کہ آپ اتنی مفید اور حوصلہ افزاء تنظیم کو ان الفاظ سے یاد کریں گے۔

یوسف: جی ہاں! بعض مرتبہ مفید چیز بھی مضرت کا سبب بن جاتی ہے۔

یونس: اچھا! تو یہ بتلایئے انجمن اور اس کے تحت ہونے والے امور میں کیا مضرت ہے۔

یوسف: یہ کیا کم مضرت ہے کہ آپ انجمن کے جلسہ کی تیاری کے لیے تین دن سے اسباق میں غائب ہو۔

یونس: صدیق مکرم! میں اتنی بات سے ضرور اتفاق کرتا ہوں کہ یہ میری کوتاہی ہے مگر انجمن نے مجھے ایسا کرنے پر مجبور نہیں کیا یہ میرا ذاتی فعل تھا، میں خود اپنے کو قصوروار سمجھتا ہوں لیکن اسباق کی پابندی کے ساتھ ساتھ طلبہ خارجی وقت میں اپنی انجمن بنائیں اس کے تحت دار المطالعہ چلائیں کتابیں پڑھنے کا ذوق پیدا کریں تحریر و تقریر کی مشق کریں اخبارات اور رسائل کا مطالعہ کریں جس سے ان کا ذہنی ارتقاء ہو ان میں آپس میں ملکر

کام کرنے کا جذبہ بڑھے تو کیا حرج ہے۔

یوسف: کیا یہ سب کام فراعت کے بعد نہیں ہو سکتے۔

یونس: نہیں! فراغت کے بعد ہمیں یہ زمانہ کہاں نصیب ہوگا ساتھ مل کر رہنے کا جو موقع اس وقت نصیب ہے اس کی قدر کرنی چاہیے یہی وقت سیکھنے سکھانے کا ہے اگر زمانہ طالب علمی میں تقریر کی مشق کی ہوگی تو بعد میں بھی تقریر کر سکیں گے اگر زمانہ طالب علمی میں تحریر کی مشق کی ہوگی تو بعد میں بھی لکھ سکیں گے اگر زمانہ طالب علمی میں کسی انجمن کا نظم ونسق کیا ہوگا تو بعد میں بھی ہم کسی انجمن یا سنستھا کو چلا سکیں گے، اگر زمانہ طالب علمی میں سب کو ساتھ لے کر کام کرنے کا ذوق ہوگا تو بعد میں بھی کسی آبادی میں دین کا کام کرنے کے اہل ہوں گے اگر زمانہ طالب علمی میں مطالعہ اور کتابوں کو جمع کرنے کا ذوق رہا ہوگا تو بعد میں بھی یہ ذوق باقی رہے گا۔

یوسف: محترم میں نے اپنے اسلاف کے حالات پڑھے ہیں انہوں نے انجمن وغیرہ نہیں بنائی۔ مگر تم نے جن اوصاف کو بیان کیا وہ ان میں یکتا تھے اور ہم انجمن کے ذریعہ مشق کر کے بھی ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے اس سے معلوم ہوا کہ یکسوئی کے ساتھ درسیات میں لگا رہنا ہی سب کچھ ہے۔

یونس: یوسف صاحب! اسلاف بہت اچھے تھے مگر ان جیسا ذوق، ان جیسی محنت، ان جیسا جذبہ، ان جیسی لگن آج ہمارے اندر کہاں آج جیسے لاپرواہی اور غفلت کے دور میں تو یہ ہی غنیمت ہے کہ طالب علم کسی نہ کسی طرح دینی کتابوں کے مطالعہ دینی تحریر اور دینی تقریر میں لگا کر رکھا جائے خدانخواستہ اگر انجمن کا وجود نہ ہو تو درسیات سے کم ذوق رکھنے والے طلبہ کا تو ناس ہی ہو جائے، ان کے سارے اوقات غیر دینی مشاغل میں گزرنے لگیں گے، انجمن کے ذریعہ ان کو دینی کتب کے مطالعہ اور تحریر و تقریر میں مشغول رکھا جاتا ہے تا کہ ان کی صلاحیتیں بیکار نہ جائیں اور آپ نے جو کہا کہ درسیات ہی اصل ہیں، اس میں شک نہیں مگر درسیات کے ساتھ ساتھ تحریر و تقریر کی مشق اور نظم ونسق کے ساتھ کسی انجمن کے کام کو انجام دینا بھی فائدے سے خالی نہیں، دیکھو اسی انجمن اصلاح الکلام کے ذریعہ جس کے سالانہ جلسہ میں ہم اور آپ جمع ہیں، تقریباً چار سو کتابیں جمع ہوئیں جن سے سال بھر میں سیکڑوں طلبہ فائدہ اٹھاتے، اور اپنے علم میں اضافہ کرتے ہیں، اور اصلاحی پرچوں کے ذریعہ کتنے ہی طلبہ نے مضامین لکھنا سیکھا، کتنے طلبہ کے خط ٹھیک

ہوئے۔ بالآخران پرچوں کی کتابت یہ ہی طلبہ تو کرتے ہیں، کتنے ہی طلبہ میں تقریر کی صلاحیت پیدا ہوئی، بہت سے طلبہ بہترین قراءت قرآن مجید کرنے لگے، بہت سے طلبہ اچھی نعت پڑھنے لگے، بہت سے اخبارات ورسائل آج ہماری لائبریری میں آتے ہیں۔ جن سے ہم دینی معلومات کے ساتھ بین الاقوامی حالات سے باخبر ہوتے ہیں، کتنے ہی طلبہ بڑے بڑے جلسوں میں سیکڑوں کے مجمع کے سامنے اپنے مافی الضمیر کوادا کرنے لگے، کیا انجمن کے یہ نفع کم ہیں، اگر آپ برانہ مانیں تو میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ ذرا آپ بتلائیں گے کہ ہندوستان میں فرقہ پرست جماعتیں کون کونسی ہیں، جو آئے دن مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلتی ہیں۔

یوسف: کہاں ہولی کھیلی جارہی ہے اور کون کھیل رہا ہے مجھے علم نہیں۔

یونس: افسوس! آپ کہاں رہتے ہیں اتنا بڑا افسادا بھی کچھ دن ہوئے جمشید پور میں ہوا آپ کو علم ہی نہیں سیکڑوں ہزاروں مسلمان بے گھر ہوگئے، آپ کو علم ہی نہیں، اورمت آیئے انجمن میں۔ ایسے ہی بدھو رہو گے، اچھا بتلانا ہندوستان میں اردو کے مشہور ادباء میں کس کس کا شمار ہے جنہوں نے اپنے قلم سے اس زبان کی خدمت کی ہے۔

یوسف: یہ میرے علم میں نہیں۔

یونس: افسوس! آپ کو کون پڑھا لکھا آدمی کہے گا، اوراسی پر کہتے ہو کہ انجمن کی کیا ضرورت ہے خدا کے واسطے فوراً انجمن سے وابستہ ہوجاؤ، ورنہ تیلی کے بیل کی طرح رہو گے، جو ایک دائرے میں گھومتا رہتا ہے۔

یوسف: اچھا یونس بھائی! مجھے آپ اس مجمع میں زیادہ شرمندہ نہ کریں میں آج ہی سے انجمن اصلاح الکلام کا ممبر بنتا ہوں۔

یونس: لایئے! ایک روپیہ فیس۔

یوسف: لیجئے۔

یونس: آئندہ جمعرات سے مغرب کے بعد درسگاہ نمبر ۳ رحلقہ نمبر ۴ رمیں آپ کا نام درج کردیا جائے گا۔

یوسف: بہت بہت شکریہ۔

یونس: السلام علیکم۔

(۴) کیا دینی تعلیم ضروری ہے؟

طارق: فرید صاحب! السلام علیکم۔

فرید: وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

طارق: فرید صاحب! میں آپ سے کئی بار مل چکا مگر یہ نہ معلوم کرسکا کہ آپ تعلیم کہاں حاصل کررہے ہیں اور آپ کے مضامین کیا ہیں؟

فرید: جناب طارق صاحب! میں دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوں اور علوم دینیہ میرے مضامین ہیں۔

طارق: فرید صاحب! دارالعلوم سے فراغت کے بعد آپ کیا کریں گے۔

فرید: مسلم عوام کی دینی خدمت۔

طارق: اس خدمت کے بدلہ میں آپ کو کیا ملے گا۔

فرید: جناب! دینی خدمت کا دنیا میں کوئی بدلہ نہیں لیا جاتا اور نہ کوئی چیز اس کا بدل ہوسکتی ہے۔

طارق: تو پھر آپ اپنی زندگی کیسے گزاریں گے؟

فرید: زندگی کا کفیل اللہ ہے اس نے زندگی دی ہے وہ ہی اس کا کفیل ہے۔

طارق: فرید صاحب! آپ تو عجیب قسم کی باتیں کررہے ہیں آخر یہ دنیا ہے اس میں بنا پیسے کے زندگی گزارنا دشوار ہے، آپ نے کونسا راستہ اختیار کیا ہے۔ آپ تو اچھے بھلے ہونہار آدمی ہیں آپ کسی کالج میں پڑھتے، ڈگری حاصل کرتے، کسی اعلیٰ پوسٹ پر ملازم ہو جاتے، آپ کی اقتصادی حالت بھی ٹھیک ہوتی، آپ کے گھر والے جو انتہائی غریب لوگ ہیں ان کو بھی اطمینان کا سانس لینا نصیب ہوتا، آپ کی باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی مولانا صاحب نے آپ کو بہکا کر دین کی خدمت کا نام لے کر یہ راستہ دکھلایا ہے، خدا کے واسطے کسی کی باتوں میں مت آؤ ہم نے بہت سے دین کی خدمت کرنے والوں اور مولانا لوگوں کو انتہائی غربت اور پریشانی کا شکار دیکھا ہے، اس تعلیم سے کوئی مالی

فائدہ نہیں ہوتا، قوم بھی قدر نہیں کرتی، رات دن کام لے کر بے چارے مولوی کو سو دو سو
روپیہ ماہانہ دیتی ہے، جس کی وجہ سے بیچارے ہر وقت پریشان رہتے ہیں، میں آپ کو اپنا
سمجھ کر مشورہ دے رہا ہوں کہ انگریزی اور عصری تعلیم حاصل کرو تا کہ ماسٹر، ڈاکٹر، وکیل،
انجینیئر، کلرک، تحصیلدار، گورنر، منسٹر کچھ نہ کچھ بن جاؤ گے، اور چین کی زندگی
گذارو گے۔

فرید: طارق صاحب! میں آپ کے خیالات سے بڑا صدمہ محسوس کر رہا ہوں، آپ
مسلمان ہو کر اسلامی تعلیم حاصل کرنے والے طالب علم کو ایسا مشورہ دے رہے ہیں،
آپ کی نظر میں اعلیٰ زندگی وہ ہے جو زیادہ تنخواہ اور اونچے عہدے پا کر حاصل ہو، یاد
رکھئے! جس طرح انسان کو زندگی گذارنے کے لیے پیسے اور چیزوں کی ضرورت ہے
ایسے ہی اس کو دین کی ضرورت ہے، دین کے بغیر انسان، انسان نہیں حیوان ہے، جتنی
اچھائیاں اور اخلاقی قوتیں ہیں وہ سب دینداری سے پیدا ہوتی ہے، جب یہ بات ہے تو
سماج میں دین کو بتلانے والوں کی بھی ضرورت ہے اور ظاہر ہے کہ جب تک دین کے علم
کو سیکھا نہیں جائے گا اس وقت تک لوگوں کو کیسے بتلایا جا سکتا ہے، اس لیے میں سمجھتا
ہوں کہ جیسے دنیا میں اور علوم وفنون سیکھے جاتے ہیں اور کچھ لوگ ان پر اپنا وقت صرف
کر کے ان میں کمال حاصل کر کے، قوم کی خدمت کرتے ہیں۔ اسی طرح کچھ لوگوں کو
دین کے علوم میں مہارت حاصل کر کے قوم کو دین کی باتیں بتلانا چاہئے تا کہ لوگ
اچھائیوں اور برائیوں کے مابین فرق کریں اور دنیا میں امن وامان قائم ہو، خلاصہ یہ کہ
جس طرح قوم کو ڈاکٹر، ماسٹر، وکیل، انجینئر کی ضرورت ہے، ایسے ہی مدرس، مفتی معلم،
مؤذن، امام، واعظ، مصلح اور مربی کی بھی ضرورت ہے، رہ گیا غربت کا مسئلہ تو میں نہیں
سمجھتا کہ کوئی عالمِ دین بھوکا سوتا ہے، مسلمان کا عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ رزاق ہیں، وہ ہر
شخص کو رزق دیتے ہیں مسلم عوام آج بھی علماء کی خدمت کرتے ہیں، اور اگر کچھ
دشواریاں آتی بھی ہیں تو کیا خالص دنیادار اس سے بری ہیں، جب وہ دنیا کے لیے سختی
جھیل سکتے ہیں تو ایک عالم، دین کے لیے بدرجۂ اولیٰ سختی برداشت کر سکتا ہے۔

طارق: مگر قوم کے اور لوگ اس کام کو کریں، تم کیوں اس وادیٔ خار دار میں چلے گئے۔

فرید: جی ہاں! ہر آدمی یہی سوچ لے کہ میں کیوں مشقت اٹھاؤں تو پھر دین کا کام کون

کرے گا؟ مجھے آپ پر تعجب ہے کہ سیکڑوں، ہزاروں وہ مسلم بچے جو دنیاوی تعلیم میں
لگے ہیں ان میں سے کسی کو دین کی تعلیم کی رغبت نہیں دلاتے، مگر ان ہزاروں لاکھوں
میں سے جو کچھ بچے اس تعلیم کو حاصل کر رہے ہیں، ان کو آپ بہکا رہے ہیں، افسوس صد
افسوس! اگر کوئی موٹر چلانا سیکھے وہ آپ کے نزدیک کام ہے، کوئی علاج کرنا سیکھے وہ آپ
کے نزدیک کام ہے، کوئی مشین بنانا سیکھے وہ آپ کے نزدیک کام ہے، تجارت کرنا،
نوکری کرنا، منسٹر بننا، گورنر بننا یہ سب آپ کے نزدیک کام ہیں اور ضروری کام ہیں، لیکن
اگر کام نہیں ہے تو اذان دینا کام نہیں، نماز پڑھانا کام نہیں، قرآن پڑھنا، پڑھانا کام
نہیں، مسئلہ بتانا کام نہیں، خدا کے واسطے کچھ سوچو! کیا یہ کام ضروری نہیں، کیا مسلمان
صرف کھانے کمانے کے لیے پیدا ہوئے ہیں۔ یاد رکھو! وہ خدا جس نے دنیا کی یہ ساری
نعمتیں عطا فرمائی ہیں اس کو یاد کرنا، اس کی عبادت کرنا، اس کی مرضیات پر دوسروں کو
چلانا اور لوگوں کو خدا کا پسندیدہ انسان بنانا، اگر دنیا میں کوئی کام ہے تو فقط یہی کام ہے،
جو لوگ اس کام میں لگے ہیں ان سے بہتر دنیا میں کوئی انسان نہیں، قرآن نے کہا: "وَ
مَنْ اَحْسَنُ قَوْلاً مِّمَّنْ دَعَا اِلَى اللّٰهِ وَ عَمِلَ صَالِحًا وَّ قَالَ اِنَّنِیْ مِنَ
الْمُسْلِمِيْنَ"۔ آج دنیا میں سیکڑوں علوم رواج پا رہے ہیں، مگر غفلت برتی جا رہی ہے،
تو علوم شرعیہ سے، ان پر محنت کم ہو گئی ہے، ان کے سیکھنے سکھانے کا کام ڈھیلا ہوتا
جا رہا ہے، اگر کچھ لوگ اس چراغ کو گل ہونے سے بچا رہے ہیں تو آپ کہتے ہیں کہ
کیوں اپنا وقت برباد کرتے ہو، افسوس صد افسوس! یاد رکھو ہر گاؤں کے لیے ایک عالم کی
ضرورت ہے، جو وہاں کے مسلم بچوں کو قرآن کی تعلیم دے، پانچوں نمازوں کی امامت
کرے، لوگوں کو دین کی باتیں بتائے، جنازہ کی نماز پڑھائے، نکاح پڑھائے، شہر میں
یہ ضرورت اور بڑھ جاتی ہے، کئی کئی علماء کی وہاں ضرورت ہوتی ہے، ظاہر ہے یہ ضرورت
جب ہی پوری ہوگی، جب کچھ بڑے ادارے، دین کے مکمل علم رکھنے والے ماہرین پیدا
کریں گے اس لیے ضرورت ہے کہ قوم کے کچھ فرزند اپنے آپ کو اس علم سے مزین
کریں، جو علم انسان کو خدا سے ملائے، جو علم اللہ کی معرفت کرائے، جو علم نیکی بدی میں
امتیاز بتلائے، جو علم اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کے پاک علم پر مشتمل ہو، وہ دنیا کے تمام
علوم سے بڑھا ہوا ہے، دنیا کے سارے علوم صرف دنیا تک ساتھ دیں گے، مگر وہ علم جو

دنیا کے ساتھ ساتھ قبر وحشر اور خدا کے پاس تک ساتھ رہنے والا ہے، وہ قرآن کا علم ہے، شریعت کا علم ہے، آج پورے عالم میں تمدن بڑھ رہا ہے، چیزیں بڑھ رہی ہیں، اسباب عیش بڑھ رہے ہیں، مکان اعلیٰ، فرنیچر اعلیٰ، کھانے اعلیٰ، کپڑے اعلیٰ مگر انسانی اخلاق، انسانیت، ہمدردی، محبت، دوستی، سچائی، خلوص بے نفسی، بے غرضی فنا ہو رہی ہے اور مٹ رہی ہے، کمزور ہو رہی ہے، مگر اس کی طرف قطعاً توجہ نہیں ہے، اور جو چیز یعنی دین جو اس کی طرف توجہ کا داعی ہے، اس کو غیر ضروری کہا جا رہا ہے، افسوس صد افسوس !اور پھر مسلمان اس کو غیر ضروری کہے یہ اور ظلم ہے۔

ع ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہیے

طارق: فرید صاحب! آپ کی باتیں سر آنکھوں پر، میں اپنے اعتراض پر نادم ہوں، مگر سوال یہ ہے کہ دینی مدارس کو طلبہ کے مستقبل کے لیے تو کچھ کرنا چاہیے، ان کو کوئی ایسا ہنر بھی سکھا دیں۔ جس سے وہ اقتصادی پریشانی کا شکار نہ ہوں۔

فرید: جی ہاں! یہ بھی تو وہ مشورہ ہے جو اچھے اور ماہر عالم پیدا کرنے کے راستے میں رکاوٹ ہے، جب کوئی درزی، درزی کا کام سیکھتا ہو، اسی وقت میں وہ مٹھائی بنانا بھی سیکھے تو کبھی بھی وہ ماہر درزی نہیں بن سکتا۔ انسان ایک وقت میں چند ہنر سیکھنے کی کوشش کرے گا، تو وہ کسی میں بھی ماہر نہیں ہو سکے گا۔ اگر یہ چند لوگ جو اپنا وقت فارغ کر کے دین میں مہارت پیدا کرنے آئے ہیں، ان کو دوسرے ہنروں میں لگا دیا گیا، تو یہ قطعاً علم میں کامل دست گاہ حاصل نہیں کر سکیں گے، بلکہ نہ ادھر کے رہیں گے نہ اُدھر کے۔

ہمارا تو مقصد ہی یہ ہے کہ یہ لوگ دین کے کام کے علاوہ کچھ نہ جانیں، تا کہ مجبور ہو کر دین کے کام کو اوڑھنا بچھونا بنا لیں، اگر ان کو کوئی دوسرا کام آتا ہوگا، تو ذرا سی بھی دین کے راستہ میں مشکلات پا کر اس ہنر کے غرّے میں دین کا کام چھوڑ دیں گے۔ آپ کو تو یہ چاہیے کہ آپ یہ کہتے کہ قوم کو یہ احساس دلایا جائے کہ جن لوگوں نے قوم کے لیے اپنے اوقات فارغ کر کے زندگی وقف کی ہے، قوم ان کی معاشی کفالت کی ذمہ داری اپنے ذمہ لے لے، اور ان کا پورا خیال رکھے، ان کی اس قربانی کی قدر کرے، ان کو بوجھ نہ سمجھے۔ ان سے دینی فائدہ اٹھا کر ان کی دنیاوی ضرورتوں میں مدد کرے۔ الحمدللہ! مسلم قوم کوئی بانجھ قوم نہیں ہے، ابھی اس میں یہ احساس موجود ہے، مگر آپ جیسے لوگ

اس احساس کو ختم کر رہے ہیں، اس لیے خدارا اپنی حالت کو سدھاریئے، اور ایک مسلمان ہونے کی ذمہ داریوں کو پہچانئے۔

طارق: فرید صاحب! آپ تو بڑے مستقل مزاج، صاحب عزم وحوصلہ اور دینی حمیت وغیرت سے سرشار نظر آتے ہیں، دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ ہم کو دین کا ایسا ہی جذبہ عطا فرمائے، اور نفس وشیطان کے دھوکے سے حفاظت فرمائے۔ میں نے آپ کے شان میں گستاخی کی ہے، اس کی میں معافی چاہتا ہوں۔

فرید: گستاخی نہیں ہے، آج کل مسلم نوجوان عام طور پر اسی انداز پر سوچنے کے عادی ہو گئے ہیں، اچھا ہوا آپ نے اظہار کر دیا کہ تبادلۂ خیالات کا موقع مل گیا۔

طارق: اچھا آپ کا بہت بہت شکریہ۔ السلام علیکم۔

فرید: وعلیکم السلام۔

(۵) بدعت

عزیز: بڑے میاں! السلام علیکم۔

بڑے میاں: جیتے رہو بیٹے اللہ تمہاری عمر دراز کرے۔

عزیز: میاں صاحب! اس وقت کہاں سے تشریف لا رہے ہیں؟

بڑے میاں: بیٹے میں اپنے اس لڑکے کو لے کر اجمیر شریف خواجہ غریب نوازؒ کے عرس میں حاضری دینے اور چادر چڑھانے گیا تھا، اس بچہ کی ماں نے منت مانی تھی کہ اے غریب نواز اگر میرا بچہ زندہ رہا تو جب وہ دس سال کا ہوجائے گا تو اس کو تیری درگاہ پر بھیج کر چادر چڑھاؤں گی اور رجب کے مہینے میں امام جعفر صادق اور بیوی صاحبہ کا سوا سیر کا کونڈا ابھروں گی۔ بزرگوں کی برکت سے اور خواجہ صاحب کی دین سے اب بچہ اس قابل ہوگیا، تو میں اس کو اجمیر شریف لے کر گیا تھا۔

عزیز: بڑے میاں! آپ تو بدعتی معلوم ہوتے ہیں، بھلا کہیں خواجہ صاحب میں یہ طاقت ہے کہ بچہ کو زندہ رکھیں، منت تو سوائے خدا کے کسی سے مانگنا شرک ہے، میں تو سمجھتا تھا کہ تم بڑی عمر کے آدمی ہو، تمہارا ایمان پختہ ہوگا، خدا کے واسطے عورتوں کی باتوں میں نہ پڑو، اہل علم سے معلوم کرو، پھر دیکھو تمہارے یہ کام شرعاً کتنے غلط ہیں۔

بڑے میاں: ارے بیٹا! تم تو وہابی معلوم ہوتے ہو، میں نے تو تمہاری ٹوپی سے ہی پہچان لیا تھا کہ تم کسی دیوبندی جماعت کے ہتھے چڑھ گئے ہو، اللہ ان لوگوں سے بچائے، انہوں نے لوگوں کے ایمان واعتقاد کو خاک میں ملا دیا ہے، وہ ولی اور بزرگ جن کے مزار کی زیارت نورِ ایمانی تھی، جن کے عرس باعثِ برکت، جن کی فاتحہ خوانی گھر بار کی فلاح کا سامان تھی، ان کم فہموں نے سب کو ناجائز کر رکھا ہے۔

دسواں، چالیسواں، جو مردوں کے بخشوانے کا سامان تھا سب کو حرام کر دیا، شب برأت کا حلوہ، محرم کا کھچڑا، خواجہ کی دیگ، امام جعفر کی ٹکیاں، پیرانِ پیر کی ہنسلی، مدار شاہ کا مالیدہ، بابا کپور کا پراٹھا، صابر صاحب کے الائچی دانے، کلکلی شاہ کے پسندے، ہرے بھرے

شاہ کا زردہ، احمد رضا کی اڑد کی دال، خواجہ خانوں کا دلیہ، غوث صاحب کی فیرنی، بختیار کاکی کا کلاوہ، حسنؓ حسینؓ کی سیلی، اور غراب شاہ کی سینکی، نظام الدین اولیاء کا صندل، زین خاں کا بکرا، مستان بابا کی روشنی، مخدوم بابا کا عرس، آخر کون کون سی چیزیں ہیں، جن کو اِن نام نہاد ملاؤں نے ناجائز نہیں کیا، حالاں کہ ان بزرگوں کی جو کرامات اور کرشمے ہیں، ان ملوں کو اس کی ہوا بھی نہیں لگی، اللہ ان کو ہدایت دے، سچ پوچھو تو ان وہابیوں نے دین وایمان کا ناس کر ڈالا، دنیا کو بزرگوں سے دور کر دیا، بڑے بڑے مدرسے کھول رکھے ہیں، جن میں سوائے دین سے پھرانے کے صبح سے شام اور کوئی بات ہی نہیں ہوتی، تم بھی شاید انہیں وہابیوں کے مدرسے میں پڑھتے ہوگے، کون سا مدرسہ ہے۔

عزیز: فلاح دارین ترکیسر میں پڑھ رہا ہوں۔

بڑے میاں: ارے! اس کے پاس تو کوٹھوا گاؤں ہے، وہاں ہمارے مخدوم بابا کا مزار ہے ہزاروں آدمی وہاں جمعرات کو جاتے ہیں، بڑے بڑے مریض بابا کی دعاؤں سے ٹھیک ہوجاتے ہیں، ترکیسر میں بھی ایک قبر موسی جیؒ کی ہے، لیکن اللہ تعالیٰ رحم کرے ان گاؤں والوں پر کہ سال میں ایک عرس بھی اس مزار پر ان بخیلوں سے نہیں بن پڑتا، اور ایک قبر بہت بڑے بابا کی تھی اس پر ان لوگوں نے مسجد بنا ڈالی بابا کی روح تڑپ رہی ہے کہ ان کو مخلوق سے ان لوگوں نے اوجھل کر دیا، کبھی کبھی اس پر سبز جھنڈا لگ جاتا تھا اور لوگ باہر سے آکر فاتحہ پڑھ جاتے تھے، جس کی وجہ سے گاؤں میں ایک نور تھا، اب وہ بھی بند ہوگیا، بس اب قیامت کو قریب سمجھو جب سے بزرگوں کو سجدہ کرنے سے روکا جا رہا ہے، دنیا میں فساد پھیل رہا ہے، ایک وہ تبلیغی جماعت نکل پڑی ہے، وہ بھی انہیں کی پالی پوسی بچی ہے، ایسی میٹھی میٹھی باتوں اور دل فریب اداؤں سے لوگوں کو گھر سے باہر لے جا کر ایسی پٹی پڑھاتی ہے کہ پھر وہ بجائے مزار کے مسجد اور بجائے عرس کے اجتماع اور بجائے چادر کے چلہ اور بجائے دیگ کے دعوت میں مست ہوجاتے ہیں، سچ پوچھو تو اس نے وہابیوں کی رہی سہی کسر کو پورا کر دیا، مگر آنے والے ہی ان کے داؤ میں آتے ہیں، مجھ کو تو ان کے سائے سے بھی نفرت ہے۔

عزیز: بڑے میاں! آپ نے تو بہت کچھ کہہ ڈالا اب میں آپ سے گزارش کروں گا کہ

تھوڑی دیر کے لیے آپ میری باتوں کو سمجھنے کی کوشش کریں، اگر سمجھ میں آجائے تو مانیں
ورنہ آپ کو اختیار ہے، میں آپ سے عمر میں چھوٹا ہوں چھوٹا منہ بڑی بات ہے۔ مگر آپ
سے امید ہے کہ آپ ضرور سنیں گے۔

بڑے میاں: کہو کیا کہتے ہو؟

عزیز: بڑے میاں! اسلام ایک دستوری اور قانونی مذہب ہے، اس نے انسان کو بڑے
بیش قیمت عقیدے دیئے ہیں، جن کے ذریعہ خالق ومخلوق کے فرق کو واضح کیا ہے، کوئی
بندہ چاہے نبی کیوں نہ ہو وہ خدا نہیں ہوسکتا، اور خدا کی مخصوص صفات اس میں پیدا نہیں
ہوسکتیں، انسان کی سب سے بڑی بھول یہ ہے کہ اس نے ان بزرگوں کو جو انسان کو خدا
سے ملانے آئے تھے، ان کو خدا بنالیا اور خود ان سے مرادیں مانگنے لگا، اور ان کے ناموں
کو کھانے کمانے کا ذریعہ بنالیا، بھلا سوچو تو اگر انہیں کاموں کے لیے اسلام تھا تو صحابہؓ
کو سب سے اچھا موقع تھا کہ وہ نبی علیہ السلام کی پرستش شروع کردیتے۔ اور ان کی
دیگ اور چادر کے بہانے اپنے آپ کا بھلا کرتے، مگر انہوں نے ایسا نہیں کیا، اس لیے
کہ وہ جانتے تھے کہ یہ اسلام اور پیغمبر کی تعلیم کے خلاف ہے، علماء اور دیوبندیوں کو بھلا
بتاؤ تو کیا حلوہ، مانڈہ کھانا برا لگتا ہے کہ وہ اس کی برائیاں کرتے ہیں، ضرور ان بدعات
میں شرک کی بو ہوتی ہے، جب ہی تو یہ حضرات اس سے منع کرتے ہیں۔ ہم بزرگوں کی
عزت کرتے ہیں، مگر ان کو خدا نہیں کہتے، اور نہ خدائی صفات ان کے لیے مانتے ہیں،
ہم کو تو یہ دیکھنا چاہئے کہ وہ کونسے اعمال ہیں، جو اللہ کو اتنے پسند ہیں، جن کے مسلسل کر
نے کی وجہ سے ان بزرگانِ دین نے یہ درجہ پایا کہ دنیا میں ان کا نام روشن ہے، ہم ان
کاموں پر عمل کریں اور اپنے آپ کو ان کے اس طریقہ پر چلائیں جو اتباع نبوی صلی اللہ
علیہ وسلم سے ان کو حاصل ہوا تھا، نہ کہ ان کی شخصیت ہی کو پوجنے لگیں۔ بلکہ ہم اس شخص کو
اپنے بزرگان دین کی ہی فہرست ہی سے نکال دیں، جس کی زندگی اسوۂ نبی سے ہٹی ہوئی
ہو، یہ باتیں شاید آپ کی سمجھ میں اس وقت نہ آرہی ہوں، مگر میں آپ سے سچ کہتا ہوں
کہ آپ لوگ بزرگانِ دین کی عزت کرنے اور ان سے عقیدت رکھنے کے طریقے سے
ناواقف ہیں، آپ ذرا قرآن وحدیث کے درس میں بیٹھئے اور سنئے کہ کیا ان میں کہیں
ان باتوں کا ذکر آتا ہے، جن کو ہمارے آباء واجداد غیر قوموں سے متاثر ہوکر بزرگان

دین کے ساتھ کرنے لگے تھے، اس ملک میں انگریزوں نے مسلمانوں میں تفریق
ڈالنے کے لیے احمد رضا اور مرزا غلام احمد کے ذریعہ وہ فتنہ پیدا کرایا کہ ایک قوم کی آپس
کی نفرت انتہا کو پہنچ گئی۔

دو کس بنام احمد گمراہ کنند جہاں را
مرزا غلام احمد احمد رضا بریلی

آپ سے درخواست کہ آپ ہمارے مدرسہ میں تشریف لائیے اور علماء سے قریب ہوکر
بات کو سمجھنے کی کوشش کیجئے، یہ علماء جو رات دن قرآن وحدیث پڑھتے پڑھاتے ہیں، آخر
وہ کچھ سمجھے ہی ہوں گے، جبھی تو ان باتوں کو غیر اسلامی بتلاتے ہیں۔

بڑے میاں: بچے تم اس بوڑھے کو بھی جال میں پھنسانا چاہتے ہو، مگر خیر میں تمہارے
کہنے سے تمہارے بڑے مولانا کے پاس چلتا ہوں، چلئے۔

بڑے میاں: مولانا صاحب! اس نے مجھے بدعتی کہا، کیا تم یہ بتا سکو گے بدعت کس کو
کہتے ہیں؟

مولانا: بدعت ہر اس کام کو کہا جاتا ہے جو دین نہ ہو مگر اس کو دین سمجھ کر کیا جائے۔

بڑے میاں: دین کس کو کہتے ہیں؟

مولانا: دین نام ہے ان عقائد واعمال واحکام کا جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ
سے ثابت ہوں اور ان کے زمانہ میں ان اعمال کو دین سمجھ کر کیا گیا ہو۔

بڑے میاں: اس کا مطلب یہ ہوا کہ مدارس کا قائم کرنا، قرآن مجید کا چھاپنا، جمعہ کی چھٹی
کرنا، دینی کتابیں شائع کرنا، جلسے کرنا، ان میں زردہ بریانی کھانا، جماعت بنا کر محلہ محلہ
پھرنا، یہ سب کام بھی دین نہ ہونے چاہئے، ان کو بھی بدعت کہو۔ اس لیے کہ یہ اعمال بھی
دورِ نبوی اور دور صحابہ میں اس ترتیب کے ساتھ نہیں کیئے گئے، حالانکہ لوگ ان کاموں کو
دین سمجھ کر آجکل کررہے ہیں۔

مولانا: بڑے میاں! آپ کو معلوم ہونا چاہے کہ نئی بات نکالنے یعنی احداث وبدعت کی دو
قسمیں ہیں: ایک ''احداث فی الدین'' ہے، اور ایک ''احداث للدین'' ہے۔
دین میں کوئی بات نہ ہو اور اس کو دین کا ایک جز مان کر کرنا اور اس کو دین میں شامل کرنا
''احداث فی الدین'' کہلاتا ہے جو ممنوع اور بدعت ہے، لیکن اگر دین کی اشاعت

اور پھیلانے کے لیے نئی نئی ترتیب سوچی جائے تو وہ ''احداث للدین'' ہے نہ کہ ''احداث فی الدین''، اور ''احداث للدین'' جائز ہے، جیسے دین کی اشاعت کے لیے رسائل وقرآن چھاپنا، کتابیں شائع کرنا، دارالعلوم کھولنا، اس کا نظام اور قانون بنانا، تبلیغی جماعت کے ذریعہ تعلیم، گشت، بیان، جوڑ، اجتماع وغیرہ یہ سب کام جائز ہوں گے۔

بڑے میاں: ہاں! بس ناجائز تو ایک کام ہے بزرگوں کے مزار پر مت جاؤ، عرس مت کرو، منت مت مانو، دیگ مت پکاؤ، کسی کے نام پر بکرا مت کاٹو، فاتحہ مت دلاؤ، دسواں چالیسواں مت کرو۔

مولانا: جی ہاں! یہ سب کام اسلام کے مزاج، اس کے عقیدہ توحید اور ایک خدا کو کارساز جاننے کے منافی ہیں، ان سب کاموں میں مشرکوں اور کافروں کی اتباع کی جاتی ہے، اس لیے یہ کیسے جائز ہو سکتے ہیں؟ یہ سب کام ''احداث فی الدین'' کی فہرست میں آتے ہیں جو ممنوع ہے۔

بڑے میاں: آج تو میں جاتا ہوں پھر اس مسئلہ پر اور گفتگو کر کے تسلی حاصل کروں گا۔ اچھا السلام علیکم۔

مولانا: وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔

(۶) تبلیغ

اقبال: رشید صاحب! آج آپ کہاں سے آرہے ہیں، میں آپ کو بدلہ ہوا دیکھ رہا ہوں، معلوم ہوتا ہے کہ آپ کسی سفر سے لوٹ رہے ہیں۔

رشید: جی ہاں! اقبال صاحب میں ابھی ابھی ایک طویل سفر سے واپس آرہا ہوں، اللہ قبول کرے بڑا مبارک سفر تھا۔

اقبال: کیا آپ کہیں ٹور پر گئے تھے، آخر مجھے کیوں نہیں بتلایا، میں بھی چلتا اچھا تو جلد بتلاؤ کہاں کہاں کی سیر کر کے لوٹے ہو۔

رشید: اقبال صاحب! ٹور نہیں یہ تبلیغی سفر تھا، میں ایک جماعت کے ساتھ ایک چلہ کے لیے نکلا تھا، الحمد للہ! مختلف شہروں میں ہماری جماعت کام کرتی ہوئی مرکز پر بھی حاضر ہوئی، ماشاء اللہ ہر جگہ خوب بات ہوئی، احباب جڑے، گشت، تعلیم کے حلقے، ذکر و تسبیحات کی پابندی رہی ہر جگہ خوب تشکیل ہوئی، کافی جماعتیں بنیں، اللہ ہماری اس محنت کو قبول فرمائے۔ آمین!

اقبال: رشید بھائی! اگر آپ اجازت دیں تو میں آپ سے تبلیغی جماعت کے بارے میں کچھ سوالات کروں، مگر شرط یہ ہے کہ آپ خفا نہ ہوں، میں صرف اپنے اشکالات کو حل کرنے کے لیے آپ سے پوچھتا ہوں، ورنہ اور کوئی نیت نہیں ہے۔

رشید: اقبال بھائی ضرور پوچھئے، دین کے سلسلہ میں ہر شخص کو پوچھنے کا حق ہے، اس میں خفگی کی کیا بات ہے؟ اللہ چاہیں گے تو میں جواب دوں گا، وہ ہی جواب دلوانے والے ہیں، انشاء اللہ۔

اقبال: بھائی رشید! میں نے اللہ کے فضل سے اسلامیات کا کافی مطالعہ کیا ہے اور ملک کے مشہور علماء، مفکرین کی کتابیں پڑھی ہیں اور پڑھتا رہتا ہوں، مگر اپنے مطالعہ کی حد تک مجھے تبلیغی جماعت جن اصولوں اور نمبروں کو لے کر امت کو تیار کر رہی ہے، اس کا ثبوت قرن اول اور کتاب وسنت کی روشنی میں نہیں ملتا، صحابہؓ کے زمانہ میں کفار کو ضرور تبلیغی کی

جاتی تھی مگر ایسی کوئی مثال نہیں کہ مسلمان، مسلمان کی جان کھاتے ہوں، لوگ مؤمن ہیں، مسلم ہیں، خواہ مخواہ ان کے گھروں پر جا کر ان کو تنگ کرنا، ان کو شرمندہ کرنا، ان سے مجمع میں کلمہ سننا، نہ سنانے پر کہنا کہ ہائے افسوس! مسلمان کو کلمہ بھی یاد نہیں، پھر اس میں غلو کہ بعض مستحبات کو فرض کے درجے میں لاکر بیان کیا جاتا ہے، ارے آدمی اپنی فکر کرے اس کو غیر کی کیا پڑی؟ دوسرے کا سوال ہم سے تھوڑا ہی ہونے والا ہے، قرآن نے تو بار بار کہا: لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی (دوسری جگہ: لَا تُسْئَلُوْنَ عَمَّا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ۔اور ایک جگہ تو کھلے لفظوں میں ہے: یاایھا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا عَلَیْکُمْ اَنْفُسَکُمْ لَایَضُرُّکُمْ من ضَلَّ اِذَا اهْتَدَیْتُمْ ۔کہ تم صرف اپنی فکر کرو۔ دوسرے کا گمراہ ہو جانا تم کو کوئی نقصان نہیں دے گا، اگر خود تم ٹھیک ہو۔)

ع تجھے غیر کی پڑی کیا اپنی نبیڑ تو

(یقیناً اسلام دعوتی مذہب ہے، مگر اس کا جو مطلب ہے اس پر کوئی عمل نہیں کرتا کہ غیر مسلموں کو اسلام کی دعوت دیں، جیسا کہ انبیاء اور صحابۂ کرام نے دی۔ مسلمان، مسلمان ہے، آخرت کو، قیامت کو، قبر کو مانتا ہے، وہ خود اپنے اعمال کی فکر کرے، اور اگر نہ کرے تو یہ اس کا قصور ہے کہ جان بوجھ کر عمل نہیں کرتا، ہم اس کے ٹھیکے دار نہیں ہیں،)

پھر یہ کہ آج کل مسلمان کے اقتصادی حالات خراب ہیں، وہ ذلیل ہے، اس کی جیب خالی ہے، آپ اور اس کی جیب پر ان طویل سفروں کا بوجھ ڈال کر اس کو قلاش کیے دے رہے ہیں، ایک اجتماع میں آنے والوں کا کرایہ اور دوسرے اخراجات شمار کرو تو لاکھوں کا خرچ ہو رہا ہے۔ کاش! مسلمان تعلیمی کاموں پر یہ روپیہ خرچ کرتا تو آج اس کے نوجوان بے روزگار نہ پھرتے، پھر یہ لوگ باتیں ایسی کرتے ہیں کہ جو سمجھ سے باہر ہیں، ایک صاحب کہتے تھے کہ بس نکل پڑو چاہے گھر کے حالات کیسے ہی ہوں، اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّ ثِقَالًا۔ کسی نے کہا کہ میں تو مزدور ہوں جتنا کماتا ہوں اتنا بچوں کو کھلاتا ہوں تو تبلیغی صاحب کہنے لگے کہ تم مر گئے تو پھر کون کھلائے گا، اب ان سے کوئی دریافت کرے کہ جب مر جائے گا تو اس کے ذمہ بچوں کو کھلانا فرض کہاں رہے گا، جب تک زندہ ہے نان و نفقہ فرض ہے، فرض کو چھوڑ کر تبلیغ میں کیسے چلا جائے، جب کہ تبلیغ کے ثبوت ہی میں کلام ہے (ایک آدمی سورت تک جاتا ہے وہاں جا کر کہتا ہے کہ بھائی ہم مہاجر ہیں اور تم انصار

مدد کرو۔ بھلا بتلائیے مہاجر اور انصار کی وہ مخصوص اصطلاحات یہ بھلا آدمی کہاں استعمال کر رہا ہے، صحابہ اور بزرگان دین کے عشق، جذب اور حال کے وہ قصے جو ان کے مخصوص احوال اور کیفیت کے بارے میں مذکور ہیں، ان کو سُنا سُنا کر سارے مسلمانوں سے ان پر عمل کا مطالبہ کرنا (جب کہ اسلام نے قطعاً سب انسانوں کو اس کا مکلف نہیں بنایا) کہاں تک درست ہے، ان لوگوں کی باتیں سن کر ایسا لگتا ہے کہ اسلام مکمل نظامِ عبادت، ریاضت اور رہبانیت ہی کا نام ہے، دوسری سب چیزیں اسلام سے قطعاً خارج ہیں، یہ درحقیقت اسلام کی غلط تصویر ہے۔)

(مدارس دینیہ جو اسلام کی صحیح تعلیم دے رہے ہیں، بعض تبلیغی ان پر تعریض کرتے ہوئے اپنے مجمعوں میں کہتے ہیں کہ لوگو! قریب قریب آجاؤ۔ دیکھو ہم چندہ لینے نہیں آئے بلکہ بندہ لینے آئے ہیں، حالاں کہ یہ حضرات وقت کا چندہ کرتے ہیں، جس کا دینا پیسے سے بھی زیادہ دشوار ہے، کوئی کہتا ہے کہ مدارس والے نابالغوں پر محنت کرتے ہیں، جن پر نماز روزہ فرض نہیں، اور ہم تبلیغ والے بالغوں پر محنت کرتے ہیں۔)

رشید: اقبال بھائی! آپ کی گفتگو سے پتہ چلتا ہے کہ آپ کو (مودودی) جماعت کی ہوا لگ گئی ہے، اللہ تعالیٰ آپ کو ہدایت دے، دین کی سیدھی سادی باتیں بھی لوگوں کے لیے معمہ بن گئیں، مسلمان کہاں تک گر گیا ہے، میں نے آپ کی بات چیت کو غور سے سنا، میں اس نتیجہ پر پہونچا ہوں کہ آپ کے اشکالات کی کئی قسمیں ہیں۔

آپ کو نفس تبلیغ جس میں مسلمان، مسلمان کو تبلیغ کرے، اسی کے ثبوت میں کلام ہے۔

دوسرا اشکال، تبلیغ کی ہیئتِ ترکیبیہ پر ہے یعنی وہ امور جن پر وہ مشتمل ہے۔ تیسرا اشکال اقتصادی ہے۔ (چوتھا اشکال تبلیغی جماعت کی پریشان خیالیوں پر ہے۔)

میں کوشش کروں گا کہ آپ کے ہر سوال کا نمبروار جواب دوں۔ سب سے پہلے تو بھائی اقبال! آپ یہ ذہن نشین فرمالیں کہ اسلام ایک مکمل نظامِ حیات ہے، اس میں زندگی کے تمام ہی شعبوں میں انسان کی رہنمائی کی گئی ہے، عبادت ہو، خواہ معاملات ہوں، سماج اور معاشرے سے متعلق مسائل ہوں، انفرادی یا اجتماعی مسائلِ حیات ہوں، کسی بھی حیثیت کو خالی رہنے نہیں دیا ہے؛ اور یہ بھی عادت اللہ کی رہی ہے کہ اس دین کے قیام کے لیے ہر دور میں اللہ تعالیٰ نے شخصیات کو پیدا کر کے دین کا کام لیتا رہا ہے، کسی

جماعت نے قرآن کے مضامین بیان کئے اس کی تفسیر کی ذمہ داری لی، کسی نے حدیث
کی شرح وتفصیل کا کام انجام دیا، کسی نے اسلامی قانون میں اجتہاد واستنباط کے جوہر
دکھلائے، کسی نے یونانی فلسفہ کے مقابلہ میں اسلامی عقائد کو منقح اور واضح کیا، کسی نے امر
بالمعروف ونہی عن المنکر کو اپنا وظیفہ بنایا، کسی جماعت نے رشد وہدایت کے لیے خانقاہی
سلسلہ اپنایا، غرض ہر ایک اسلام ہی کی خدمت اور اشاعت میں لگا نظر آتا ہے، چوں کہ یہ
سب کام دین کے لیے ہیں، اگر ان میں بالفرض کچھ چیزیں ایسی نظر آئیں جن کی
موجودہ ہیئت دور نبوی صلی اللہ علیہ وسلم یا صحابہؓ میں نہیں تھیں، تو ان کو غیر اسلامی نہیں کہا
جائے گا بلکہ اس کا شمار ''احداث للدین'' میں سمجھا جائے گا جو جائز بلکہ بعض صورتوں
میں ضروری ہے۔

ہمارے موجودہ مدارس اور ان کا موجودہ نظم اسی احداث کی ایک کڑی ہے۔ ہاں!
''احداث فی الدین'' جائز نہیں، وہ بدعت سیئہ ہے یعنی دین کے اندر کوئی نئی بات
گھسانا یہ بُرا ہے، جس سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر دین کو ناقص چھوڑنے کا الزام آتا ہے۔

اس کے بعد یہ سمجھئے کہ ہر جماعت کا اپنا دائرہ کار ہے وہ ایک دائرے میں کام کا آغاز کرتی
ہے، اسی میں سردھڑ کی بازی لگا دیتی ہے تاکہ اس حصے اور شعبے کی تکمیل ہو جائے، اب
اگر کوئی اس سے کہے کہ دوسرے شعبوں کو کیوں نظر انداز کیا جارہا ہے، تو یہ سوال ایسا ہی
ہوگا کہ کوئی کپڑا بیچنے والے سے کہے کہ تم حلوہ کیوں نہیں بیچتے۔ ارے بھائی! اس نے
کپڑے کی دوکان کھولی ہے، حلوہ دوسرے بیچ رہے ہیں ہر شخص بیک وقت سارے کام
کیسے کرسکتا ہے اور اگر کرے گا تو نقص رہ جائے گا۔

اس تمہید کے بعد میں آپ سے عرض کرتا ہوں کہ آج سے بہت عرصہ پہلے بعض اکابر نے
محسوس کیا کہ اس ملک اور دوسرے تمام ممالک میں ایمان ویقین فکر آخرت اور عبادت کا
پہلو بہت کمزور ہوتا جارہا ہے، جس پر سارے عالم کی بنیاد ہے، لوگوں کی توجہ اس پہلو پر
بہت کم ہے، لہٰذا اللہ تعالیٰ کا نام لے کر اس پہلو کی درستگی کے لیے لوگوں نے قرآن
وحدیث کی روشنی میں ایک نظام بنایا، جس کی بنیاد چھ نمبروں پر رکھی، جن کی طرف توجہ
دلانا انتہائی ضروری تھا، اور اپنے اس دائرہ میں اتنی فکر اور محنت سے کام کیا کہ آج اس
کے ثمرات اس ملک ہی میں نہیں دنیا کے کونے کونے میں نمایاں ہیں، لوگوں میں ایمان

مضبوط ہوا، خوف آخرت پیدا ہوا، غلط لوگوں کی زندگیاں بنیں اور بنتی جارہی ہیں، اللہ
تعالیٰ ان حضرات کو جزائے خیر دے۔ (آمین)

آپ کا جو پہلا اعتراض ہے کہ قرآن وحدیث کی روشنی میں صرف اتنا پتہ چلتا ہے کہ
آدمی اپنی فکر کرے دوسرے کی اس کو کیا فکر، مسلمان کا مسلمان کو تبلیغ کرنا تبلیغ نہیں ہے۔

یہ کہنا قرآن وحدیث سے ناواقفیت کی علامت ہے۔ قرآن وحدیث نے امر بالمعروف
اور نہی عن المنکر کی بے شمار جگہ ہدایت کی ہے جس کا تعلق مسلمان ہی سے ہے بلکہ ایک
جگہ تو اس امت کی غرض وغایت ہی یہ بتلائی کہ یہ پیدا ہی ''امر بالمعروف ونہی عن المنکر''
کے لیے ہوئی ہے ''کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّۃٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ... الخ'' گویا امت کا ہر فرد
اس کا مخاطب ہے اور یہ اعلیٰ درجہ ہے کہ امت کا ہر شخص لوگوں کی اصلاح کی فکر کرے،
پھر دوسری جگہ قرآن نے کہا کہ اچھا چلو یہ اعلیٰ درجہ کی ہر شخص فکر کرے، نہ حاصل ہو تو
دوسرا درجہ یہ ہے کہ تم میں ایک ایسی جماعت ہونی چاہئے جو لوگوں کو خیر اور بھلائی کی
طرف بلاتی رہے ''وَلْتَکُنْ مِّنْکُمْ اُمَّۃٌ'' آپ چاہتے ہیں کہ نہ تو مسلمان اعلیٰ درجہ پر
عمل کریں اور نہ ادنیٰ پر، بس اپنی صلاح پر قانع رہیں، آپ نے جو آیتیں پڑھیں ان کا
ہرگز وہ مطلب نہیں جو آپ نے سمجھا، وہ آیتیں تو یہ بتلا رہی ہیں کہ اگر لوگ تمہاری بات
نہ سنیں تو پھر تم کوئی ایسے مکلف نہیں ہو کہ ان کی گمراہی تم کو لے ڈوبے، تمہارا فریضہ ابلاغ
ہے، لیکن اگر بلا تبلیغ کے تم نے ان کو چھوڑ دیا تو پھر تم بھی ماخوذ ہوگے، حضرت صدیق
اکبرؓ فرمایا کرتے تھے: لوگو! تم کو یہ آیت دھوکے میں نہ ڈالے۔ یاد رکھو! تمہاری خاموشی
سے اگر عذاب آیا تو وہ نیک لوگوں کو بھی نہیں بخشے گا، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک کشتی
کے سواروں کی مثال سے اس مسئلہ کو خوب واضح کیا ہے، اگر ان آیات کا مطلب یہ ہی
ہوتا جو آپ نے سمجھا ہے تو قرآن میں امر بالمعروف کی کوئی آیت ہی نہ ہوتی بلکہ ان
آیات سے تو ان حضرات کی بے انتہا فکر کا پتہ چلتا ہے کہ امر بالمعروف کے فریضے کو اتنا
انجام دیتے تھے کہ جب لوگ اس محنت کے باوجود ان کی نہیں سنتے تھے تو ان کی مایوسی پر
اللہ تعالیٰ نے تشفی دیتے ہوئے کہا، تمہارا فریضہ پورا ہوگیا، اب ان کی گمراہی تم کو نقصان
نہیں دے گی، تو امر بالمعروف کی آیت سے پتہ چلا کہ آپ کا یہ اعتراض غلط ہے کہ
مسلمان سے مسلمان کو تبلیغ کرنے کا مطالبہ قرآن میں نہیں کیا گیا ہے۔

دوسرا اشکال جو آپ نے فرمایا کہ تبلیغ اس شکل وصورت اور ان نمبروں اور اصولوں کے ساتھ دور اول میں نہیں تھی، تو محترم اگر بالفرض اس کو مان بھی لیا جائے تو میں تمہید میں کہہ چکا ہو کہ دین کے فروغ اور اس کی اشاعت کے لیے اپنے اپنے دور میں علماء وصلحاء جو بھی شکل اور پروگرام بنائیں وہ ''احداث للدین'' ہے ''احداث فی الدین'' نہیں، تبلیغ کا موجودہ ڈھانچہ دین ہی کی خاطر اور اس کی اشاعت کے لیے عوامی سطح پر اصلاح امت کا الہامی پروگرام ہے، جو اللہ تعالیٰ کے فضل سے بے حد کامیاب ہے، اور اگر اس کی اس ہئیتِ ترکیبیہ پر کلام ہوا تو پھر تصوف علم کلام مشائخ کی خانقاہیں، سب اعتراض کی زد میں آجائیں گی، چناں چہ ان پر اعتراض ہو چکے ہیں۔ آپ کا تیسرا اعتراض اقتصادی ہے، اس میں شک نہیں کہ تبلیغی اسفار اور اجتماعات پر خرچہ آتا ہے، مگر یہ خرچ اس کا عشر عشیر بھی نہیں ہے جو مسلمان عرسوں، تماشوں، شادی غمی کی ناجائز تقریبوں، سنیما بینیوں اور فحاشی وعیاشی پر بے دریغ کر رہا ہے، جن میں سوائے گناہ کے نیکی کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا؛ امت کا صالح طبقہ سمجھا سمجھا کر پریشان ہے، مگر مسلمان اس زبوں حالی میں بھی ان بیہودہ خرچوں سے رُکنے کا نام نہیں لیتا، بہت سے سفر سیر وتفریح اور وقت گزاری کے لیے ہوتے ہیں، اس کے مقابلہ میں اگر کچھ سفر جن کے اخراجات دنیا کے تمام سفروں سے کم ہیں جو خالص دین کے لیے زندگی بنانے کے لیے، آخرت کی فکر اور رونے دھونے کے لیے کئے جائیں، تو آپ کہتے ہیں کہ مسلمان اس سے قلاش ہو جائے گا، میں کہتا ہوں بالفرض اگر قلاش ہو بھی جائے تو یہ افلاس مبارک ہے، جو دین اور آخرت کی زندگی بنانے کا سبب بنے، کیا آپ حج کے اس بین الاقوامی اور ہمہ گیر اجتماع کے خرچ اور سفر کو بھی مسلمانوں کا اقتصادی نقصان کہہ سکتے ہیں جس پر مجموعی طور پر اربوں روپیہ سالانہ مسلمان خرچ کرتا ہے، تو اس معمولی خرچ کو اسراف کیسے کہہ سکتے ہیں۔ رہ گیا آپ کا تبلیغ والوں پر ان کی پیچیدہ باتوں یا بعض غلط انداز بیان یا بعض غیر مستند قصوں کے بیان کا اعتراض، تو میرے بھائی یہ بیچارے ہمارے ہی سماج کے وہ لوگ ہیں، جن کو زیادہ علم نہیں ہے۔ کون سی ایسی جماعت ہے جس میں خامیاں نہیں! ایک بڑے نفع کی خاطر ان معمولی باتوں کو گوارہ کرلینا پڑتا ہے، ہماری تو دعوت ہے کہ اچھے اور پڑھے لکھے لوگ نکلیں تا کہ امت کی صحیح رہنمائی ہو، تبلیغ والوں کو تو اپنے ہی دائرہ میں رہ کر گفتگو کرنے

اور اکابر سے سنی ہوئی باتوں ہی کو نقل کرنے کی ہدایت ہے، پھر بھی بشر ہیں، اگر تعبیر میں یا بیان میں غلطی ہو، تو اعلیٰ نفع اور کام کی اہمیت کے پیش نظر برداشت کرلینا چاہئے۔

آپ کا یہ کہنا کہ مسلمان کا مسلمان کو تبلیغ کرنا، یا تبلیغ کی یہ شکل اور ہیئت ترکیبیہ جو آج شروع کی گئی ہے دورِ اول میں نہیں تھی۔ اس سلسلہ میں عرض ہے کہ اُس دور میں پہلے تو اسلام لانے کے بعد مسلمان ایسا پختہ دین عمل کرتا تھا کہ اس کو مستقل مشن بنا کر، گاؤں گاؤں پھر کر ان اعمالِ اسلامی پر تنبیہ کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ ہاں! انفرادی طور پر اگر کسی سے کوئی غلطی یا عمل میں سستی مسلمان دیکھتے تو اس پر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ضرور کرتے تھے اور یہ امر بالمعروف مسلمان مسلمان ہی کو کرتا تھا۔

رہ گیا جماعت بنا کر اس شکل میں نماز، روزہ، کلمہ اور اسلامی اعمال واخلاق کی ترویج کے لیے موجودہ شکل میں گاؤں گاؤں پھرنا تو بعینہ یہ شکل اگر اس وقت نہ بھی ہو تب بھی امر بالمعروف کرتے رہنے کی ہدایت کے تحت اس کا جواز موجود ہے بلکہ اگر بے دینی عام ہو تب تو اس کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے۔

اقبال: نماز کے بعد تعلیم کے نام سے فضائل کی کتاب پڑھنے کی کیا ضرورت، جب کہ بعض دفعہ پڑھنے والے صحیح پڑھ بھی نہیں پاتے، خواہ مخواہ لوگ اپنی ضرورت چھوڑ کر بیٹھنے پر مجبور کئے جاتے ہیں۔

رشید: آج لوگ دنیا میں بیحد مصروف ہیں اور دینی معلومات سے قطعاً بے پرواہ ہیں جو نماز کے لیے آتے ہیں ان کی دینی معلومات صفر کے درجہ میں ہیں، ایسی صورت میں اگر روزانہ ایک دو صفحے کسی دینی کتاب کے سنا دیئے جائیں تو کیا یہ بیکار ہوگا، کم از کم لوگوں کے کان اپنے صحابہؓ کے نام سے آشنا ہو ہی جاتے ہیں، اگر یہ سلسلہ نہ رہا تو ہوسکتا لوگ آئندہ اپنی ناواقفیت کی وجہ سے یہ پوچھیں کہ حضرت عمرؓ کون تھے؟ دین کے لیے تھوڑی دیر بیٹھنا نفع سے خالی نہیں، جو جماعت میں مستقل نہیں نکل سکتے ان کے لیے فضائل کی مقامی تعلیم سے کچھ نہ کچھ فائدہ ضرور ہوتا ہے، ورنہ ان لوگوں کو مستقل مدرسہ میں جا کر وقت لگانا دشوار ہے۔

اقبال: لوگوں کو گھر سے باہر دوسرے شہروں کے چکر کھلانے سے کیا فائدہ ہے۔

رشید: اس سے ایک تو مکمل وقت سیکھنے سکھانے کے لیے فارغ مل جاتا ہے، گھر رہتے

ہوئے انسان اتنا وقت نہیں نکال سکتا۔ دوسرے اس میں ان کو بے عزتی سے بھی بچانا ہے، اس لیے کہ ایک ساٹھ سال کا بوڑھا جب اپنے ہی گاؤں میں نماز سنانے کے حلقے میں بیٹھے گا، اور الحمد للہ یا کلمہ یا التحیات یاد نہ نکلیں گے تو اپنے جان پہچان والے لوگوں میں شرمندہ ہوگا، بلکہ بعض دفعہ اس کے پوتے نواسے حلقے میں ہوں گے، ان کے سامنے شرمندہ ہوگا، وہ کہیں گے کہ دادا کو کلمہ صحیح یاد نہیں ہے؛ باہر جا کر اس کو جاننے والا دوسرے صوبوں کے شہروں میں کوئی نہیں ہوگا۔ وہاں شرمندگی کا سوال نہیں، کچھ دن میں صحیح سیکھ کر آ جائے گا۔

اقبال: مگر یہ لوگ تو پڑھے لکھے لوگوں کو بھی نکلنے پر مجبور کرتے ہیں۔

رشید: اس کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ اپنے وطن میں آدمی کتنا بھی نیک ہو، بعض کمزوریاں اس میں ضرور ہوتی ہیں، جو وطن والوں کے علم میں ہوتی ہیں، وطن والے اس کو آڑ بنا کر اس کی بات نہیں سنتے، باہر والے ان کمزوریوں سے ناواقف ہوتے ہیں، اس لیے وہ اس اجنبی کی بات کو غور سے سنتے اور اس سے نصیحت حاصل کرتے ہیں۔

اقبال: تبلیغ میں رد بدعت کیوں نہیں ہوتا جب کہ وہ ضروری ہے؟

رشید: ہوتا ہے، مگر نظر نہیں آتا خاموشی سے ہوجاتا ہے زبان کے بجائے عمل سے ہوتا ہے، مثلاً ایک بدعتی جب جماعت میں جڑ کر جماعت والوں کے اعمال دیکھتا ہے، ان کی نمازیں، طہارت، ذکر، اکرام مسلم اور سنت کے مطابق چلنا پھرنا، سونا جاگنا، اٹھنا بیٹھنا دیکھتا ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کی فکر اور مستحبات تک کا خیال، جب وہ دیکھتا رہتا ہے، انہیں ایام میں کبھی محرم، کبھی گیارہویں، کبھی شعبان کے ایام آجاتے ہیں تو وہ دیکھتا ہے کہ یہ لوگ اتنے سنت کے پابند ہیں، مگر تعزیہ نہیں بناتے، فاتحہ نہیں دلاتے، چادر نہیں چڑھاتے، عرس نہیں کرتے، آتش بازی نہیں کرتے؛ معلوم ہوا کہ یا تو یہ کام حرام ہیں، یا یہ بدعمل ہیں، اس کا دماغ یہ سوچتا رہتا ہے، پھر وہ خود ہی ان حضرات کی اتباع سنت دیکھ کر فیصلہ کرتا رہتا ہے کہ یہ بدعمل نہیں ہوسکتے ہیں، یہ کام حرام ہوں گے، تبھی یہ لوگ نہیں کرتے، وہ خود ہی یہ سوچتا ہے اور فیصلہ کرتا ہے خود تبلیغ والے اس قسم کے بیانات یا رد بدعت کے جھگڑے سے دور رہتے ہیں، ان کے بیان میں خالص اعمال پر زور ہے، ان کی زندگی خود ہی اثر ڈالتی ہے، انہوں نے اپنے بیانات میں مثبت انداز

اختیار کیا ہے، انہوں نے وہ منفی انداز قطعاً ترک کر دیا، جو علماء سو سال سے اختیار کئے ہوئے تھے، اس سے اختلافات اور بڑھے کم ہونے کا کیا سوال مثلاً بجائے اس کے کہ معین الدین سے کچھ نہیں ہوسکتا، علاء الدین صابری کسی کو بچہ نہیں دے سکتے، بڑے پیر کسی کی مشکل حل نہیں کرسکتے، کسی پیر اور ولی میں نظام عالم بدل دینے کی کوئی طاقت نہیں، یہ بیانات ایسے تھے جن کے سننے سے ایک اولیاء اللہ کو ماننے والا یہ سمجھتا کہ یہ لوگ بزرگوں کو بے حیثیت سمجھتے، اور ان کی تحقیر کرتے ہیں، مگر تبلیغ والوں نے وہی بات اس انداز میں کہی کہ سب کچھ اللہ سے ہوتا ہے، پتا بھی بلا اس کے حکم کے ہل نہیں سکتا، وہ پالتے ہیں، اللہ سے پلنے کا یقین پیدا کرو، وہی رب ہے دوکان سے کچھ نہیں ہوتا۔ کھیت سے نہیں پلتے، نوکری نہیں پالتی، اللہ پالتے ہیں، مخلوق سے پلنے کا یقین ختم کرو، سب کچھ خالق کرتے ہیں، دنیا کی ساری طاقت صرف اللہ کے ہاتھ میں ہے، اس بیان کی سچائی کا کوئی انکار نہیں کرسکتا، اور اسی کے ذریعہ یہ بات صاف طور سے دل میں اتر جاتی ہے، کہ مخلوق سے کچھ نہیں ہوتا چاہے وہ کوئی بھی کیوں نہ ہو، تو بات وہی تھی، مگر کہی مثبت انداز میں تو کوئی برا نہیں مانتا، اللہ سے ہونے کا یقین یہ مثبت انداز بیان زیادہ مؤثر ہے، اس سے کہ فلاں بزرگ سے کچھ نہیں ہوتا، مقصد اس طرز سے زیادہ حاصل ہوتا ہے، دشمنی بھی نہیں بڑھتی؛ نیز تبلیغ والے ان شخصیات کے نام بھی نہیں لیتے، جو بدعتیوں کے نزدیک مختلف فیہ رہی ہیں۔

اقبال: تبلیغ والے ہر کس و ناکس سے کیوں بیان کراتے ہیں، جبکہ وہ اسلام کی ابجد سے بھی واقف نہیں ہوتا، وہ اسلام کی ترجمانی کیا کرے گا، یہ کام تو علماء کرام کا تھا۔

رشید: تبلیغ والے مسائل واحکام اور فتاویٰ بیان نہیں کراتے، ان کو تو فضائل اعمال بیان کرانا ہے، چھ نمبر بیان کرانا ہے، جس کو وہ سکھا دیتے ہیں، اس سے وہ بیان کرا دیتے ہیں، اس کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ نفسیاتی طور پر انسان یہ سوچتا ہے کہ جو بیان کرے اس کو گناہ سے بچنا چاہئے۔ مولانا منع کرتے رہتے ہیں، مولانا برائیوں سے بچیں، ہمیں کیا ضرورت ہے؟ یہ ذہن ہے کہ داعی کو بچنا چاہئے، اس کو نیک ہونا چاہئے، تو تبلیغ والوں نے سب کو داعی بنا دیا، تاکہ سب ہی بچیں، اور نیک اعمال کریں، تاجر سے بھی بیان کرواتے ہیں، کاشتکار سے بھی بیان کراتے ہیں، مزدور سے بھی بیان کراتے ہیں، تاکہ

وہ یہ سوچے کہ جب میں مصلی پر کھڑا ہو کر دوسرے کو روکنے لگا تو مجھ کو تو ضرور بچنا چاہیے ، جب وہ ایک دو دفعہ بیان کر چکا ہوگا، تو اب اس کی ہمت نہیں ہوگی نماز چھوڑے، یا سینما میں جائے، وہ یہ سوچے گا کہ لوگ مجھے کیا کہیں گے کہ کل ہم کو مسجد میں نصیحت کرتا تھا، اور آج سینما دیکھتا ہے، اس ڈر سے وہ خود ہمت نہیں کرے گا، ہر داعی، داعی بن جانے کے بعد بُرا کام کرتے ہوئے ڈرتا ہے، تو تبلیغ والوں نے سب کو ہی داعی بنا دیا تا کہ سبھی برے کاموں سے بچنے لگیں، یہ اصلاح کی ایسی ٹیکنک ہے کہ دنیا کے سارے اصلاحی فلسفے اس کے سامنے ماند پڑ گئے، اللہ تعالیٰ مولانا الیاسؒ کی قبر کو نور سے بھر دے، آمین۔ کیا حکمتِ عملی سے کام لیا ہے۔)

اقبال : رشید صاحب! مجھے آپ سے تبادلۂ خیالات کر کے بڑی خوشی ہوئی، میرے بہت سے شبہات کا آپ نے ازالہ فرمایا، آپ کا بہت بہت شکریہ انشاء اللہ آئندہ بھی میں آپ سے ملاقات کرتا رہوں گا؛ اچھا! اب اجازت چاہوں گا، السلام علیکم۔

رشید: وعلیکم السلام۔

(۷) تبلیغی اجتماع

سلیم : قاسم صاحب! السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔

قاسم: وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ۔

سلیم : آپ دو تین روز سے نظر نہیں آئے، کیا کہیں چلے گئے تھے؟

قاسم : جی ہاں! میں تین روز سے عالمی تبلیغی اجتماع میں شرکت کے لیے گودھرا گیا ہوا تھا، آج ہی واپسی ہوئی ہے۔

سلیم : ہاں! ہم نے بھی سنا تھا کہ گودھرا میں بڑا بھاری اجتماع ہو رہا ہے۔

قاسم : کاش کہ آپ اس عالمی اجتماع میں شریک ہوئے ہوتے، دین کی نسبت پر اللہ کے بندوں کا پروانوں کی طرح دنیا کے گوشے گوشے سے اتنی کثیر تعداد میں جمع ہونا، اس گئے گزرے دور میں مسلمانوں کی اسلام دوستی اور دین سے لگاؤ کی اعلیٰ مثال تھی، اجتماع تقریباً ۵ رکلومیٹر کے رقبہ میں پھیلا ہوا تھا، چالیس کاشتکاروں کی تقریباً سوا ایکڑ زمین اجتماع گاہ کے لیے تیار کی گئی تھی، دس شامیانے بنائے گئے تھے، جن میں ایک سب سے بڑا شامیانہ ایک ہزار میٹر لمبا اور سات سو میٹر چوڑا تھا، باقی ۹ رشامیانے ۳۰۰ بائی ۳۰۰ (300x300) میٹر تھے، بڑے شامیانے میں تقریباً ڈیڑھ لاکھ آدمیوں کے بیٹھنے کی جگہ تھی، دوسرے ۹ رشامیانوں میں سے ہر ایک میں تیس ہزار آدمیوں کے بیٹھنے کی گنجائش تھی شامیانوں اور شطرنجیوں پر دو لاکھ میٹر کپڑا صرف ہوا، اور تقریباً ڈیڑھ لاکھ میٹر تو سورت کے تجار نے فراہم کر دیا تھا، اس کے علاوہ سورت کے تاجروں نے تین دن تک تقریباً ۲۵۰۰۰ رآدمیوں کو جن میں علماء وفضلاء تھے اپنی طرف سے کھانا کھلایا، اجتماع گاہ میں پانچ ہزار فٹ پائپ لائن صرف ہوئی، ۱۲ رحوض بنائے گئے تھے، جن میں ایک حوض پختہ اور تین سو بائی تین سو (300x300) فٹ تھا، ایک ہزار بیت الخلاء بنائے گئے تھے اور ۵۰۰ راستنجے خانے، ہر شامیانے کے ساتھ بیت الخلاء استنجے خانے اور پانی کے حوض بنائے گئے تھے، شامیانے میں صوبہ وار ترتیب سے لوگوں کو ٹھہرایا گیا تھا،

سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ گودھرا کے بچے، جوان بوڑھے خدمت کے لیے اس طرح وقف تھے کہ گویا ان کے گھر مہمان آئے ہوئے ہیں، شہر کی ہر مسجد میں انہوں نے کھانا کھلانے کا نظم کیا تھا، گھر والوں نے اپنے بیت الخلاء، استنجے خانے خالی کر دیئے تھے، راستوں پر بچے پانی پلاتے ہوئے نظر آتے تھے ۲۰۰ ٹرک لوگوں کو ایک جگہ سے دوسرے جگہ لانے لے جانے کے لیے تیار کھڑے رہتے تھے۔

سلیم : جناب! میں آپ سے پوچھنا چاہوں گا، یہ تبلغی جماعت کیا ہے، کیوں وجود میں آئی، بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ سر پھرے لوگوں کی جماعت ہیں وہ کہتے ہیں کہ تبلیغی جماعت نے مسلمانوں کے لاکھوں روپئے اجتماعات اور اسفار میں ضائع کئے اور کرتے جارہے ہیں، ایک ایک چلہ پر قوم کا سیکڑوں روپئے برباد ہوتا ہے۔ ہمارے دشمن خوش ہو رہے ہیں کہ اچھا ہے، مسلم قوم صرف نماز روزہ سیکھنے پر لاکھوں روپیہ ریل، موٹروں کے کرائے میں برباد کرے، اور دوسروں کو ان سے کمانے کا موقع ملے، آج جب کہ مسلم قوم انتہائی زبوں حالی، غربت اور بے کاری کا شکار ہے اس کے پیسے کو پانی کی طرح بہانا کہاں کی عقلمندی ہے، اگر ان پیسوں سے اسکول کھولے جائیں، کارخانے قائم ہوں، صنعتیں وجود میں آئیں، تو لاکھوں مسلم بچوں کو روزگار ملے، سیکڑوں گھرانوں کی روزی روٹی کا مسئلہ حل ہو، یتیم بیواؤں کی مدد ہو، مریضوں کے لیے ہسپتال کھولیں، نوجوانوں کو تجارت کے لیے پیسے دیئے جائیں، تاکہ اس کی قوم کو بھی اپنے ہم وطنوں کے ساتھ برابری کی ہمت ہو، اس کی حیثیت تسلیم کی جائے، وہ اپنا مقام بنا سکے، عزت کی زندگی حاصل کرے۔ دنیا ان کو حقارت سے نہ دیکھ سکے، کوئی ان کی اہمیت کو نظر انداز نہ کر سکے۔

قاسم: آپ نے جو باتیں ارشاد فرمائیں وہ بجا، مگر آپ کو اتنا سمجھ لینا چاہئے کہ مسلمان کے نزدیک عزت آبرو، مالداری، جاہ وجلال، دنیوی سربلندی، قومی برتری، تجارت صنعت وحرفت، ملازمت وکاشتکاری، روٹی وکپڑا، مکان، اسکول و یونیورسٹی، یہ سب دوسرے درجے کی چیزیں ہیں، اصل پونجی جو اس کے پاس ہے، وہ اس کا ایمان اور سنت کے مطابق زندگی گزارنا ہے، اگر مسلمانوں کو کچھ نہ ملے مگر یہ دونون چیزیں حاصل ہوں تو وہ کامیاب وکامران ہے، اور اگر دنیا کی ساری نعمتیں ملیں، مگر وہ ایمان وسنت والی زندگی

سے محروم مرا تو ہمیشہ کے لیے ذلیل اور انتہائی ناکام اور نامراد مرا خواہ وہ دنیا میں بادشاہ ہی کیوں نہ رہا ہو، اگر آپ اتنی بات سمجھ گئے ہیں تو میری بات سنئے۔

عرصۂ دراز سے ہمارے مسلمان نوجوان ہاتھ سے نکلے جارہے تھے، ہمارا معاشرہ دین سے بہت دور ہو چکا تھا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتیں مٹتی جارہی تھیں، اسلامی احکامات اور روزمرہ کی دعائیں مسلمانوں کے دل سے محو ہو چکی تھیں، نماز روزہ تو بڑی چیز ہے، کلمہ تک بھلایا جارہا تھا ان سب حالات کو دیکھ کر بعض اہل اللہ کو اللہ نے توفیق بخشی، چناں چہ انہوں نے باوجود حالات کی ناسازگاری کے، آہستہ آہستہ بڑی محنت سے مسلمانوں میں اسلامی زندگی پیدا کرنے کے لیے نقل وحرکت کرائی لوگوں کے دروازے دروازے پھرے سفر وحضر میں ان کو ساتھ رکھا، ان کا کلمہ ان کی نمازیں درست کیں، ان کو ہر وقت کی دعائیں یاد کرائیں، ان کو جگہ جگہ کے مسلمانوں کے بگڑے ہوئے حالات کا مشاہدہ کرایا تاکہ اصلاح کی ضرورت کا احساس ہو۔۔۔ ایک طویل جدوجہد کے بعد اللہ نے ایک بیداری پیدا کی۔ بڑے بڑے جواری شرابی تائب ہوئے، مسلمانوں نے ٹوپی لگانا، ڈاڑھی رکھنا سیکھا، مسجدیں آباد ہوئیں، محلوں میں اذانیں سنی جانے لگیں، گھروں میں قرآن کی تلاوت ہونے لگی، بچے مکتب جانے لگے امراء مدارس قائم کرنے لگے، بوڑھے تسبیح پڑھنے لگے، ہزاروں لوگ تہجد واشراق کے عادی بنے، تاجر ہو کہ ملازم، کاشتکار ہو کہ مزدور، سب ہی اللہ کے نام کی مالا جپنے لگے، دین کی تبلیغ کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے، اپنی جان اپنا مال قربان کرنے لگے؛ یہ سب تبدیلی اسی نقل وحرکت کی بدولت ہے، جس کو آپ سر پھرے لوگوں کا فعل بتلا رہے ہیں، کیا یہ کام جو اس جماعت کی نقل وحرکت سے وجود میں آیا، ایک بڑا انقلاب نہیں ہے؟ کیا اس کا نفع اب کسی سے ڈھکا چھپا ہے؟ کیا اب اس عظیم الشان کام میں پیسے خرچ کرنا، اس کے لیے سفر کرنا، اس کے لیے اجتماعات منعقد کرنا بے کار ہے؟ کیا اسلامی شعائر کو رواج دینا اور ہر شخص کو اس کا خوگر بنانا برا کام ہے؟ ہرگز نہیں تو اس کے لیے تن من دھن کی بازی لگانا بھی بیکار نہیں۔

سلیم : مگر میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ آخر وہ کام جو مسلمانوں کی اقتصادیات اور معاشی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں، اس کو تبلیغی جماعت اپنا نصب العین کیوں نہیں بناتی؟ کیا یہ کام اسلامی روح یا اس کی تعلیمات سے علیحدہ ہیں۔

قاسم: نہیں! ہرگز نہیں!!! اسلام ایک جامع مذہب ہے، اس کی تعلیمات میں دنیا و آخرت دونوں جگہ کی سربلندی حاصل کرنے کے سامان موجود ہیں، مگر آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ ہر جماعت کا ایک دائرہ کار ہوتا ہے، جس کو وہ اپنے عمل کے لیے اپنی مقدور کے مطابق متعین کرتی ہے، تبلیغی جماعت کا دائرہ کار بھی محدود ہے، اس نے صرف ۶ رنمبروں کو اپنے کام کا محور بنایا ہے، تا کہ یہ بنیادی باتیں درست کردی جائیں، زندگی اسلامی بنادی جائے، مزاج آخرت سے ڈرنے والا بنادیا جائے، چوں کہ اس میں لگنے والوں کی زیادہ تر تعداد عوام پر مشتمل ہے، اس لیے بس اتنا ہی کام اس جماعت نے اپنے ذمہ لیا ہے، اس سے زیادہ کا اس سے مطالبہ کرنا ایسا ہے، جیسے حلوائی سے کپڑا بیچنے کا مطالبہ کرنا جب مسلمانوں کو ایمان ویقین کے ذریعہ صحیح رخ اس جماعت نے دے دیا، ان کی روزمرہ کی عبادت صحیح کرادی، کلمہ نماز کی درستی کردی، تو آگے کی زندگی کے لیے شرعی مسائل اور ان کی رہبری کے لیے علماء یا اصلاحی جماعتیں آگے بڑھیں اور اپنا فریضہ انجام دیں۔

سلیم: میں آپ سے ایک سوال کرنا چاہوں گا وہ کہ ہمارے ایک پڑوسی گودھرا کے اجتماع میں گئے تھے، وہ فرمارہے تھے کہ تین دن تک اجتماع دیکھا، بیانات سنے، مگر کسی اللہ کے بندے نے ایک دفعہ بھی باآواز بلند نہ درود پڑھا، نہ سلام وصلوٰۃ پڑھا، نہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں کوئی قوالی سنائی گئی، نہ ہاتھ کی تال نہ طبلے کی تھاپ، بس بھیڑ بکریوں کی طرح خاموش انسانوں کا ایک میلہ لگا ہوا تھا، فرمارہے تھے کہ میں خون کے آنسو روتا ہوا واپس ہوا، اور ہمیشہ کے لیے توبہ کرلی، کہ میں ان جمبوڑیوں کے مجمع میں کبھی نہیں جاؤں گا، میرا کہنا ہے کہ آخر جماعت والے اس طرح کے لوگوں کے عقائد کی تردید اپنے بیانات یا اجتماعات میں کیوں نہیں کرتے تا کہ ساتھ ساتھ بدعات کا بھی رد ہو جایا کرے۔

قاسم: جناب! جماعت میں ہر طبقہ کو دعوت دی جاتی ہے، کسی کے عقیدے یا طریقۂ کار سے تعارض نہیں کیا جاتا، وہ جب اس جماعت کے کام میں لگتا ہے، تو اسلام کے صحیح خدوخال اس کے سامنے آجاتے ہیں، غیر اسلامی عقیدے اور افعال اس سے خود بخود دور ہونے لگتے ہیں، اس طریقہ کار کا یہ اثر ہوا کہ ہر مکتبِ فکر کا آدمی اس سے جڑنے لگا

ہے، اس طرح مسلمانوں کی بڑی اکثریت ایک پلیٹ فارم پر آگئی ہے، جب کہ صدیوں کی دوسرے طرز کی محنت ان کو ایک جگہ نہ لاسکی تھی، بلکہ خلیج بڑھتی جارہی تھی۔

سلیم: قاسم صاحب! آپ کا بہت بہت شکریہ، آج آپ نے میرے بہت سے شبہات دور کردیئے، اور مسلمانوں میں دینی بیداری اور احساس پیدا کرنے والی جماعت تبلیغ کی صحیح پوزیشن واضح کی، میں ہمیشہ آپ کا شکر گذار رہوں گا۔

قاسم: سلیم بھائی! میں بھی آپ کا شکر گذار ہوں کہ آپ نے میری باتوں کو توجہ اور خلوص سے سنا میں اتنی بات کی آپ سے اور درخواست کروں گا کہ آپ کسی نہ کسی اجتماع میں ضرور شریک ہوں۔ انشاء اللہ آپ میری گذارشات کی تصدیق کرنے پر مجبور ہوں گے۔ اچھا تو خدا حافظ۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔

سلیم: وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ۔

(۸) فن قرأت

عزیز: السلام علیکم ڈاکٹر شفیع صاحب۔

ڈاکٹر شفیع: وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔

عزیز: کہئے آپ کو ڈاکٹری کلاس میں داخلہ ملا یا نہیں؟ آپ کی بڑی کوشش چل رہی تھی۔

ڈاکٹر شفیع: جی ہاں! آپ کی دعا سے داخلہ تو مل گیا ہے، مگر کورس بہت مشکل ہے بڑی محنت کرنی پڑتی ہے، یہ بائی لوجی، سائنس بڑی مشکل ہے۔

عزیز: جناب! فن تو سبھی مشکل ہوتے ہیں ہر آدمی اپنے فن کو مشکل بتلاتا ہے۔

ڈاکٹر شفیع: نہیں عزیز صاحب! یہ مشکل بتلایا نہیں جارہا ہے، ہے ہی مشکل! مثلاً میں آپ کو بتلاتا ہوں کہ دیکھئے یہ سر ہے، ہم کو تو بس یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک ہڈی کی بنی ہوئی کٹوری سی ہے، مگر یہ مختلف ہڈیوں پر مشتمل ہے، مثلاً اس میں ایک ہڈی ہوتی ہے، اس کا نام فرنٹل بون ہے، دو ہڈیاں اور ہیں جن کا نام پیرائٹل بون ہے، اور ہڈیاں ہیں، جن کا نام ٹیمپورل بون ہے، ایک اور ہڈی ہے جو اسفی نوئڈل بون کہلاتی ہے، پھر دو ہڈیاں اور ہیں جو اتھموئڈل بون کہلاتی ہیں، یہ تقریباً نو ہڈیاں ہوجاتی ہیں، ان کے نام یاد رکھو! پھر ان کو شناخت کرو، پھر ان کی بناوٹ پر غور کرو، دیکھئے کتنا مشکل کام ہے، یہ ہمارے ساتھی اقبال ہیں، یہ بھی بائی لوجی پڑھتے ہیں، ان سے معلوم کیجئے کتنی دقت ہے اس فن میں۔

اقبال: آپ نے سچ کہا ہر علم مشکل ہے، اگر حقیقی معنی میں اس میں کمال حاصل کیا جائے۔

عزیز: جی ہاں! آپ عالمیت کے کورس کو دیکھئے ایک عالم کو کتنی محنت کرنی پڑتی ہے، عربی زبان ایک اجنبی زبان ہے، پہلے اس کے صرف نحو کو پڑھئے۔ پھر زبان سمجھئے، پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کو پڑھئے۔ احادیث میں بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بے پناہ تعارض ہے، اس کو حل کیجئے، ائمہ کا یہ حال ہے کہ ان کا اکثر مسائل میں اختلاف موجود ہے، عوام کو کیا؟ پکی پکائی مل گئی، ان کو کیا پتہ، یہ مسئلے اور قانون شرعی کس طرح قرآن

وحدیث سے نکل کر ہم تک آئے ہیں۔ مثلاً دیکھئے قرآن میں چودہ سجدے ہیں، حنابلہ کہتے ہیں کہ پندرہ ہیں۔ مالکیہ کہتے ہیں کہ گیارہ ہیں۔ شوافع کہتے ہیں کہ ہیں تو چودہ ہی، لیکن سورۂ ''صٓ'' کا سجدہ نہیں ہے، اور سورۂ حج میں دو ہیں۔ امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ ہیں تو چودہ، مگر سورۂ حج کا صرف ایک ہے اور سورۂ صٓ کا بھی واجب ہے۔ اس طرح تعداد چودہ ہوتی ہے۔ اب ہر ایک کے ثبوت کی روایت تلاش کرنا، پھر اپنے امام کی مرجحات کو ذکر کرنا؛ بس ایک مجاہدہ ہے جو اس طالب علم کو کرنا پڑتا ہے۔

لوگ سمجھتے ہیں کہ مولوی صاحب اُجلے کپڑے پہنتے ہیں، ان کو کیا کام ہے؟ ارے! پہلے اس فن کو پڑھو، جب اس کی مشکلات کا اندازہ ہوگا۔

اقبال: ارے عزیز صاحب! یہ آپ کے ساتھ کون صاحب ہیں۔

عزیز: ارے اقبال صاحب! آپ ان کو نہیں جانتے یہ قاری جی جی ہیں، جو جھنجھانہ کے رہنے والے ہیں۔

اقبال: ہاں صاحب! بس مزے قاریوں کے ہیں، اس علم میں نہ کوئی محنت، نہ مجاہدہ، ایک دو رکوع ذرا زور سے پڑھ دیئے اور بس آرام۔

قاری صاحب: کیا کہا، خبردار! ہوش سنبھال کر بات کرو۔

اے کہ شخصے منت حقیر نمود
تا درشتی ہنر نہ پنداری

یاد رکھو! ہر علم کی بڑائی اس کے معلوم کی اعتبار سے ہوا کرتی ہے، جوتا بنانا ایک علم ہے مگر اس کا معلوم جوتا ہے جو کوئی اہم چیز نہیں ہے، اس لیے اس کے جاننے والے کو زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی؟ اسی طرح قرآن کا علم بھی ایک علم ہے مگر اس کا معلوم اللہ کی ذات و صفات اس کے احکام و اوامر ہیں، اور اللہ کی ذات سے بڑی دنیا میں کوئی ذات نہیں، تو اس کے علم سے بڑا کوئی علم نہیں، افسوس کہ آپ اس علم کو جو مینڈک چیر پھاڑ کر اور کتے گدھوں کے آپریشن کر کے سیکھا جاتا ہے، اہم بتلا رہے ہیں، اور قرآن مجید کے پڑھنے کے علم کو آپ نے آسان سمجھ رکھا ہے، اچھا تو سنئے میں آپ کو بتلاتا ہوں کہ یہ فن کتنا مشکل ہے۔ دیکھو یہ لفظ ''اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ'' جو آپ آسانی سے پڑھ لیتے ہیں، جانتے بھی ہو کہ علم قرأت میں اس کے ایک ایک حرف پر کتنی بحث ہوتی ہے کہ یاد کرتے کرتے

دماغ کے ٹانکے ڈھیلے ہوجاتے ہیں۔

''اَلْحَمْدُ'' میں پانچ حرف ہیں، ایک ایک حرف کے بارے میں قاری کو کتنی باتیں یاد کرنی پڑتی ہیں، اس کو سنئے اور اندازہ لگایئے، ایک ایک حرف کا تعارف کرانا کتنا مشکل ہے، اس سے آپ کو معلوم ہوگا، کہ فن قرأت دنیا کے مشکل ترین فنون میں سے ہے، اس کے پڑھنے پڑھانے والے کتنی عرق ریزی سے کام لیتے ہیں، چوں کہ وقت کم ہے، اس لیے بطور نمونہ کے میں صرف الحمد کے ہمزہ کے بارے میں آپ کو بتلاتا ہوں، ''اَلْحَمْدُ'' اس کے شروع میں ہمزہ ہے، ہمزہ کا مخرج اقصاء حلق ہے، ہمزہ حروف حلقی کہلاتا ہے، ہمزہ میں صفت جہر پائی جاتی ہے، جہر ہمس کی ضد ہے، اس صفت کو ادا کرتے وقت آواز میں بلندی اور قوت ہوتی ہے، جس کے اثر سے سانس بند ہوجاتی ہے۔

ہمزہ میں ایک صفت شدت پائی جاتی ہے، شدت رخوۃ کی ضد ہے، اس صفت کو ادا کرتے وقت آواز بالکل بند ہوجاتی ہے، ہمزے میں ایک صفت استفال ہے، یہ صفت استعلاء کی ضد ہے، اس صفت کو ادا کرتے وقت زبان کی جڑ تالو کی طرف نہیں اٹھتی، جس کی وجہ سے ہمزہ باریک پڑھا جاتا ہے، ہمزے میں صفت انفتاح پائی جاتی ہے، یہ صفت اطباق کی ضد ہے، اس صفت کو ادا کرتے وقت زبان کا درمیانی حصہ تالو سے نہیں ملتا، جس کی وجہ سے آواز کھلی ہوئی اور باریک نکلتی ہے، ہمزے میں صفت اصمات پائی جاتی ہے، یہ صفت ازلاق کی ضد ہے، اس صفت کو ادا کرتے وقت حرف اپنے مخرج سے جماؤ اور دیر کے ساتھ ادا ہوتا ہے، ہمزے میں تسہیل، ابدال، یہ صفات عارضہ پائی جاتی ہے، ہمزہ وہ حرف ہے، جس کی مستقل آواز تو ہے مگر مستقل صورت نہیں، ہمزہ کبھی موافقت حرکت اور مناسبت تخفیف کے لحاظ سے الف، واو، اور یاء کی صورت میں لکھا جاتا ہے اور کبھی محذوف الرسم ہوتا ہے، اسی طرح ادا میں بھی کبھی محذوف ہوتا ہے، اور کبھی ثابت اور ثابت ہوکر کبھی تخفیف کے ساتھ پڑھا جاتا ہے، کبھی تحقیق کے ساتھ، ہمزہ کے لیے جھٹکا لازمی ہے، اسی وجہ سے کلام عرب میں ثقیل سمجھا جاتا ہے۔

بہر حال فن، صرف، وقف، تجوید، قرأت رسم الخط میں ہمزہ مشکل سمجھا گیا ہے، اور یہ تو ابتدائی باتیں ہیں، ورنہ اس فن کی جو اہم دقیق باتیں ہیں، وہ تو آپ سمجھ بھی نہیں سکتے، سنا آپ نے! یہ ہے فن قرأت۔

اقبال: ارے! یہ تو کافی مشکل فن ہے، قاری صاحب! آپ مجھے معاف فرمائیں، مجھ سے آپ کی شان میں گستاخی ہوئی۔!

قاری صاحب: نہیں، کوئی بات نہیں ہے، میں نے آپ کو اس لیے نہیں ڈانٹا ہے کہ میری کوئی توہین ہورہی ہے، بلکہ آپ کے طرزِ بیان سے قرآن اور اس کے علوم کی توہین ہورہی تھی، اس لیے مجھے ضروری تھا کہ میں آپ کو اپنا بھائی سمجھ کر اس حرکت پر متنبہ کروں۔

اللہ ہم کو اور آپ کو اس بات سے محفوظ رکھے۔ آمین!

اچھا! السلام علیکم۔

اقبال و ڈاکٹر شفیع: وعلیکم السلام۔

(۹) رویت ہلال

ارشد: اسلم صاحب! السلام علیکم۔

اسلم: وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔

ارشد: اسلم صاحب! آپ کے یہاں اس مرتبہ عید کس دن منائی گئی۔

اسلم: ہمارے یہاں چہارشنبہ کو عید کی نماز پڑھی گئی۔

ارشد: کیوں؟ ایسا ہوا، بمبئی میں دوشنبہ کو عید ہوئی اور زیادہ سے زیادہ سہ شنبہ (منگل) میں ہوتی، اگر چاند نہیں ہوا تھا، مگر چہارشنبہ کو ہونے کے تو کوئی معنی ہی نہیں۔

اسلم: ارے صاحب! آپ تو شہر میں رہتے ہیں، آپ کو ہر قسمی وسائل حاصل ہیں، آپ کو تو رمضان کے چاند کی تصدیق مل گئی ہوگی کہ یک شنبہ سے روزہ ہوا ہے، شنبہ کو چاند ہو چکا تھا، مگر ہم لوگ تو ایسے علاقے میں رہتے ہیں، جہاں پہاڑ اور جنگلوں کی وجہ سے شاذ ونادر ہی ۲۹ر کا چاند نظر آتا ہے، اس لیے ہمارے یہاں تو رمضان کا چاند بھی تیسا ہی کا ہوا، جس کے حساب سے روزے پیر سے شروع ہوئے اور عید کا چاند بھی تیسا ہوا، پھر رمضان کے پورے عرصے میں رمضان کا ۲۹رواں چاند ہونے کی کوئی اطلاع کسی ذریعہ سے نہیں ملی کہ ہم اتوار سے رمضان مان کر پیر کو تیس تاریخ سمجھتے اور منگل کو عید مناتے، ہمارے حساب سے منگل کو تیسواں روزہ تھا اور بدھ کو عید ہوئی۔

ارشد: بھائی! چاند دکھے یا نہ دکھے آپ کو اس کا انتظام کرنا چاہئے۔ تار، ٹیلی فون کے ذریعہ کسی جگہ سے خبر منگانا چاہئے، کوئی فنڈ جمع کرنا چاہئے، تاکہ اس کے صرفے سے کسی جگہ آدمی بھیج کر تصدیق حاصل کی جائے، یہ کیا کہ آپ چاند کے بھروسے بیٹھے رہتے ہیں، ہمارے یہاں تو چاند اگر نظر نہ آئے تو ہم زمین آسمان ایک کر دیتے ہیں، اور ہندوستان پاکستان کے کونے کونے کو چھان مارتے ہیں، اور کہیں سے بھی چاند کو ڈھونڈ نکالتے ہیں، تاکہ عید منانے میں ہم دوسرے لوگوں سے لیٹ نہ ہو جائیں، وہ عید ہی کیا جو پوری دنیا میں ایک ہی دن نہ منائی گئی ہو۔

اسلم: جناب! یہ آپ کی غلط فہمی ہے اسلام ایسا مذہب نہیں ہے کہ وہ لوگوں کو اس کا مکلف

کرے کہ چاند دنیا کے کسی بھی کونے میں نظر آیا ہو، اس کی کھوج لگانے کو فرض سمجھو، اور اپنے پیروکاروں کو اس پر مجبور کرے کہ چاہے چندہ کرنا پڑے، چاہے پوری دنیا کا سفر کرنا پڑے، ہر قسم کی مصیبت جھیلو اور چاند کا پتہ لگاؤ، اگر کسی جگہ ۲۹ر کا چاند ہو گیا اور تم نے پتہ نہ لگایا اور اپنے ہی مقام کی رویت پر بھروسہ کئے بیٹھے رہے، تو تم مسلمان نہیں ہو، تمہاری عید نہیں ہوگی، اسلام ایک سادہ مذہب ہے، ہر زمانہ اور ہر جگہ کے لیے ہے، اس نے تو ایک سیدھا سادہ اصول ذکر کر دیا کہ: "صُوْمُوْا لِرُؤْيَتِكُمْ وَ افْطَرُوْا لِرُؤْيَتِكُمْ" چاند دیکھ کر روزے شروع کرو اور جب دوسرے مہینے کا چاند دکھ جائے تو روزے ختم کردو، اس نے ان تمام بھاگ دوڑ اور ساری دنیا کا گشت لگانے کا مکلف نہیں بنایا، اور نہ اس کو بنانا چاہئے تھا۔ ہاں! اگر آس پاس کے علاقے کی کوئی تصدیق شرعی اصولوں کے تحت رویت کے بارے میں ملے اور مقامی اہل علم اس کو مان لیں تو اس پر عمل کیا جاسکتا ہے، مگر اس کا مکلف نہیں بنایا کہ دنیا میں جتنے ذریعہ معلومات کے ہیں ان کو فراہم کرو ورنہ گنہگار ہو گے، اگر ایسا ہوتا تو مسلمان مشکلات میں مبتلا ہو جاتے؛ پھر یہ ذرائع تو آج کل نکل آئے ہیں کہ ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا آسان، خبر رسانی کے لیے تار ٹیلیفون پیدا ہو گئے ہیں، پہلے یہ سب سامان کہاں تھے؛ اسلام تو ہر زمانے کے لیے ہے اور ہر جگہ کے لیے ہے چاہے وسائل ہوں یا نہ ہوں۔ اسلام کے اصولوں پر ہر دور میں اور ہر جگہ عمل ہو سکتا ہے، بلکہ اسلام نے تو تار، ٹیلی فون، ریڈیو کی خبر کو شہادت کے درجے میں معتبر بھی نہیں مانا، اور اگر کسی درجے میں اعتبار کرنے کو کہا بھی ہے تو بہت سی شرائط کے ساتھ؛ جن کو علماء ہی سمجھ سکتے ہیں، عوام کو فیصلے کا حق نہیں دیا ہے۔

ارشد: جناب! اس کا مطلب تو یہ ہے کہ اب جب کہ وسائل حاصل ہو گئے ہیں، ان سے فائدہ ہی حاصل نہ کیا جائے اور ایک عید مختلف دنوں میں لوگ منائیں، ریڈیو وغیرہ کی خبریں جو دنیا کے کونے کونے میں پہنچتی ہیں اور حکومتوں کی نگرانی میں نشر ہوتی ہیں وہ سب غلط ہیں، بس مولوی لوگ جو کہیں وہی سچ ہے، آخر یہ لوگ کب تک ہم کو اپنا غلام بنائے رکھیں گے۔

اسلم: نہیں صاحب! غلام بنانے کا مسئلہ نہیں ہے، دینی امور میں بلا علماء کی رہنمائی کے چلنا دشوار ہے، جیسے نماز روزے کے مسائل میں ان کی جانب رجوع کیا جاتا ہے اسی طرح کونسی صورتوں میں چاند کی خبر معتبر ہے، کونسی صورتوں میں نہیں، ریڈیو کی خبر کن

شرائط کے ساتھ معتبر ہے، کن صورتوں میں نہیں، یہ علماء ہی بتلاسکتے ہیں۔
خبر اور شہادت میں فرق ہے، ہم نہیں کہتے کہ ریڈیو خبر غلط نشر کرتا ہے، مگر سوال یہ ہے کہ کیا وہ شہادت کا درجہ رکھتی ہے؟ کیا دنیا میں کوئی عدالت ریڈیو یا تار، ٹیلی فون سے شہادت کو معتبر مانتی ہے؟ ہرگز نہیں! شاہد کا مجسٹریٹ کے سامنے ہونا ضروری ہے، تا کہ اس سے جرح کی جاسکے، سوالات ہوسکیں، اس کی حرکات وسکنات کو بھی بعض مرتبہ بیان کے صحیح وغلط ہونے میں بڑا دخل ہوتا ہے۔
پہلے تو آپ نے یہی غلط سمجھ رکھا ہے کہ عید یا رمضان ساری دنیا میں ایک ہی دن سے شروع ہو یا ختم ہو، اگر ایسا ہوتا تو اللہ اسلامی مہینوں کے شروع وختم کا مدار چاند پر ہرگز نہ رکھتے، بلکہ شمسی حساب کے سپرد کردیتے، جس میں تغیر کا سوال ہی نہیں ہے، تا کہ سب لوگ عید ایک ہی دن منا سکتے، مثلاً اکتوبر کی ۲؍تاریخ تو ظاہر ہے کہ وہ تاریخ سب جگہ ایک ہی دن میں ہوتی۔
ارشد: اچھا! تو میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ قدرت نے ایسا کیوں کیا؟ اس میں کیا مصلحت ہے کہ چاند پر مدار رکھا گیا، جب کہ شمسی حساب پر مدار رکھنے میں اس اختلافی بحران سے نجات مل سکتی تھی۔
اسلم: جناب! اللہ تعالیٰ کے ہر فیصلے میں بہت سی مصلحتیں ہوتی ہیں، بعض دفعہ انسان اس کو سمجھ بھی نہیں سکتا۔ مثلاً اسلام کے جن احکام میں اوقات کی رعایت رکھی گئی ہے، ان میں ایسی چیزوں کو معیار بنایا ہے جو عام اور ظاہر ہے۔ مثلاً چاند کے بڑھنے گھٹنے سے تاریخ کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے، پہلی تاریخ سے ساتویں تاریخ تک چاند کا نصف مغربی حصہ منور ہوجاتا ہے، اور سات سے چودہ تک پورا چاند منور ہوجاتا ہے، پھر ۱۴؍سے ۲۱؍تک نصف مغربی حصہ بے نور ہوجاتا ہے۔ اور ۲۱؍سے ۲۸؍تک پورا چاند تاریک اور بے نور ہوجاتا ہے۔
فرض کرو کسی کو تاریخ معلوم نہ ہو اور جنتری اور کیلنڈر بھی موجود نہ ہو تو ایسی صورت میں جب چاند کو دیکھا جائے تو مغربی آدھا حصہ چاند روشن ہو تو سات تاریخ سمجھی جائے گی، پورا روشن ہو تو ۱۴؍تاریخ اور مغربی حصہ چاند کا آدھا بے نور ہے تو کہہ سکتے ہیں کہ آج ۲۱؍تاریخ ہے۔ پورا بے نور ہو تو ۲۸؍تاریخ ہوگی اور درمیانی تاریخ نور اور تاریکی کی کمی زیادتی سے ختمی نہیں تو تقریبی تو معلوم ہو ہی جاتی ہے۔ مگر سورج کی روشنی میں گھٹاؤ

بڑھاؤ نہیں ہے، اس لیے سورج کی ٹکیہ دیکھ کر تاریخ کی تعین نہیں کی جاسکتی، دوسرا فائدہ یہ ہے کہ چاند سے مہینہ کا ختم وشروع معلوم ہوتا ہے مہینہ کے آخری دن چاند کا نظر آنا پچھلے مہینے کی انتہا اور اگلے مہینے کی ابتدا کا پتہ دیتا ہے، شمسی تاریخ اس وصف سے خالی ہے۔ نیز میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ یہ بات تو طے ہے کہ شریعت کا مقصد مسلمان کو نیک، دیندار اور متشرع بنانا ہے؟
ارشد: یقیناً۔
اسلم: جب یہ بات آپ نے مان لی تو سنئے کہ اسلامی مہینوں کی ابتداء واختتام کو چاند کے حساب پر مبنی کرنے میں یہ فائدہ بحسن وخوبی حاصل کیا جاسکتا ہے، اس لیے کہ چاند کی شہادت دیندار نیک اور متشرع آدمی کی قبول کی جاتی ہے۔ بددین اور بدعمل کی نہیں، تو ایک مسلمان یہ سوچنے پر مجبور ہوگا کہ مجھے متشرع اور دیندار بننا چاہئے، اگر میں ایسا نہیں بنوں گا تو مسلم سماج میں میری حیثیت اتنی گرجائے گی کہ میری شہادت پر نہ تو عید منگی اور نہ رمضان شروع ہوگا، تو گویا دیندار نہ بن کر میری یہ بے عزتی ہوگی کہ اسلامی مہینے کا آغاز تک میری شہادت پر نہ ہوسکے گا، تو مجھے غیرت سے ڈوب مرنا چاہئے۔ یہ احساس ایک غیور مسلمان کو دیندار بنانے کا سب سے بہترین ذریعہ ہے، بشرطیکہ اس میں تھوڑی سی حمیت موجود ہو، اگر شمسی حساب پر مدار ہوتا تو مسلمان کو دیندار بننے پر آمادہ کرنے کے لیے یہ مصلحت مفقود رہتی، بالآخر اس نظام قمری پر مدار سے ایک زبردست تحریص متدین بننے پر ملتی ہے، کیا یہ نفع کم ہے کہ ایک مسلمان اس بہانے نمازی بنے، ڈاڑھی رکھائے اور برائیوں سے بچے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ قمری حساب رکھنے کو سنت کفایہ قرار دیا گیا ہے، اگر کسی آبادی میں کوئی بھی اس حساب کا خیال نہ رکھے تو سب گنہگار رہوں گے، اس کے علاوہ چاند پر مدار رکھنے سے ہر موسم کے روزے رکھنے کا موقع نصیب ہوتا ہے، اس لیے کہ ۳۳؍سال میں قمری تاریخ سالانہ موسم کا ایک دور پورا کرلیتی ہے، جس میں ہر موسم میں رمضان آچکا ہوتا ہے، اور ہر آدمی کو پندرہ سال میں بالغ مانا گیا ہے، اس طرح اس کی عمر ۴۸؍سال کی ہوجائے گی تو روزہ کی عبادت ہر موسم میں پاچکا ہوگا۔ رمضان سردی میں آتے ہیں تا کہ کمزور طبیعت کے لوگ چھوٹے دنوں کی تلاش میں لگے رہتے ہیں، روزے کی نعمت سے محروم نہ ہوں، اور گرمی کے بڑے بڑے دنوں میں روزے کیسے رکھیں کا عذر نہ تلاش کرسکیں۔ رمضان بارش میں آتے ہیں کہ ٹھنڈا موسم اور

فرصت کے ایام چاہنے والے لوگ بھی فائدہ اٹھائیں۔گرمی میں رمضان آئے گا کہ جفاکش اور مجاہدانہ طبائع کو بھی بقدر مشقت ثواب حاصل کرنے کا موقع مل سکے، یہ سب فوائد شمسی حساب پر مدار کی صورت میں حاصل نہیں کئے جاسکتے تھے اس شکل میں ہمیشہ ایک موسم کے رمضان پر اکتفا کرنا پڑتا۔نیز چاند پر مدار کی شکل میں دیکھنے کا اشتیاق اس کی فکری اور کروڑوں نگاہوں کا اللہ کے فریضے کی خاطر چاند پر ٹکٹکی باندھ کر دیکھنا ایسا پیارا منظر ہے کہ شاید خدا کو بندوں کی یہی ادا پسند ہو جو سیکڑوں عبادتوں پر بھاری ہے۔اس کے علاوہ بقرعید کے چاند کا نظر آنا گویا ایک طریق سے اللہ کی دعوت کے لیے بمنزلہٗ دعوت نامہ ہے جس کے ملنے کا ہر شخص متمنی ہے۔اور مغرب کا افق اس کے لیے بمنزلہٗ ڈاکیہ کے ہے، جس کی طرف سب کی نگاہیں لگی رہتی ہیں کہ کس دن دعوت ہے، اس کا پتہ چاند سے چلے گا، پھر یہ فخر کہ ہم دعوت نامہ بھیج کر اس دعوت یا عیدگاہ کے اجلاس میں بلائے جارہے ہیں، نہ کہ خود سے جارہے ہیں۔یہ مصالح ہیں جو قمری نظام میں مضمر تھے۔اللہ کے بندو! اللہ کے احکام پر راضی رہو اسی میں فلاح ہے بالآخر لوگوں کو عید ہی کی چاند کی فکر کیوں ہوتی ہے دوسرے مہینوں کے چاند کی اتنی فکر کیوں نہیں کی جاتی خود رمضان کے چاند کی چنداں فکر نہیں ہوتی مگر جہاں عید آنے کو ہوئی کہ زمین و آسمان ایک کر دیا جاتا ہے کیا اس ہنگامہ آرائی سے ایک طرف یہ اشارہ نہیں ملتا کہ ان لوگوں کو رمضان وبال جان معلوم ہوتا ہے، اس سے چھٹکارے کے لیے یہ سب طوفان برپا کیا جاتا ہے۔

ارشد: آپ تو بڑے سوجھ بوجھ اور معقولیت پسند مولوی نکلے۔مجھے آپ کی بات سن کر بڑا سکون ملا، خدا کرے کہ آپ جیسے سوجھ بوجھ والے انسان ہر جگہ موجود ہوں اور ان کی رہنمائی میں مسلم قوم اپنی دینی زندگی کی اصلاح کرے، اللہ آپ کی زندگی میں برکت دے، آپ کا سایہ تادیر قائم رکھے، آپ نے میرے دل کے درودیوار روشن کردیئے۔

اسلم: میں خود بھی آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے میری ناقص تقریر کو غور و توجہ سے سنا، اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنی مرضیات پر چلنے کی توفیق بخشے۔آمین۔السلام علیکم

ارشد: وعلیکم السلام۔یار زندہ صحبت باقی۔

(۱۰) ڈاڑھی اور اسلام

سلیم: قاسم صاحب! السلام علیکم۔

قاسم: وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔

سلیم: آپ ادھر کہاں جارہے تھے؟

قاسم: میں ذرا نائی تلاش کرنے گیا تھا۔

سلیم: ارے آپ کو نائی کی کیا ضرورت؟ آپ تو ماشاءاللہ مولوی ہیں، مولوی حضرات کا تو کہنا ہے، ڈاڑھی خوب بڑی رکھو، آپ لوگوں کو تو اگر دو مہینے بھی نائی نہ ملے کوئی دشواری نہیں۔یہ ہم جیسے ڈاڑھی منڈانے والوں کی دشواری ہے کہ آٹھ دن بھی گزارنا دشوار ہوتا ہے۔

قاسم: ارے! کیا آپ ڈاڑھی نہیں رکھتے ہیں، میں تو سمجھا تھا کہ ابھی نکلی ہی نہیں ہے۔

سلیم: جی نہیں! نکلی تو ہے مگر رکھتا نہیں ہوں۔

قاسم: ارے بھائی! آپ یہ تو برا کرتے ہیں ڈاڑھی تو مسلمان کا شعار ہے، اسلام میں اس کی بڑی اہمیت ہے اس کے بغیر آج کے دور میں مسلمان کو پہچاننا دشوار ہے، لے دے کے یہی تو ایک علامت رہ گئی ہے، اسے کیوں ضائع کرتے ہو۔

سلیم: مگر میں آپ سے پوچھتا ہوں کیا ڈاڑھی کا ثبوت قرآن سے ملتا ہے؟

قاسم: سلیم صاحب آپ انتہائی ناواقف معلوم ہوتے ہیں، آپ نے یہ کیا سوال کیا کہ کیا ڈاڑھی کا ثبوت قرآن سے ہے، کیا کوئی حکم قرآن میں صراحۃً نہ ہو تو آپ اس کو ماننے سے انکار کردیں گے، آپ کو نفس دلیل کے مطالبہ کا تو حق ہے، مگر دلیل خاص کے مطالبہ کا حق نہیں ہے، اگر قرآن ہی حجت شرعی ہو تو پھر آپ کو یہ ثابت کرنا بھی دشوار ہو جائے کہ ظہر میں چار رکعت ہی فرض ہیں۔میرے بھائی اسلام کے احکامات جن دلائل سے ثابت ہوتے ہیں وہ دلائل اور حجتیں چار ہیں: قرآن، حدیث، اجماع امت اور قیاس۔ان چاروں میں سے کسی سے بھی کوئی حکم ثابت ہوگا وہ اسلامی حکم کہلائے گا۔

سلیم: مگر میں پوچھتا ہوں کیا یہ اتنی ضروری ہے کہ نہ رکھانے والے کو آپ ملامت کریں۔

قاسم: جی ہاں! اس کا ثبوت حدیث پاک اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات سے اس قوت کے ساتھ ہے کہ نہ رکھنے والے کو ملامت کی جائے گی، فاسق کہا جائے گا۔

سلیم: قاسم صاحب ہوسکتا ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو اس وقت کے رواج کے مطابق رکھا ہو اور اس کی ہدایت دی ہو۔

قاسم: نہیں! یہ رواجی چیز نہیں ہے، پہلے تو آپ کو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ انبیاء علیہم السلام رواج کے تابع نہیں ہوتے۔ وہ خود مستقل ایک زندگی لے کر آتے ہیں، وہ کسی کی اتباع نہیں کرتے وہ سب کو اپنی اتباع سکھانے آتے ہیں، بہت ہی کم ایسے حالات اور افعال ہیں جن میں شریعت نے انسان کو عرف اور رواج کا لحاظ رکھنے کی اجازت دی ہے، ورنہ پوری انسانی زندگی کے لیے خود حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے ہدایتیں ارشاد فرمائی ہیں چناں چہ وضع قطع، لباس، رہن سہن کے باب میں بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قانون ارشاد فرمائے اور چوں کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اللہ تعالیٰ کے الہام اور القاء سے ہوتے ہیں، اس لیے ان میں بے پناہ انسانی فوائد ہیں۔

سلیم: مثلاً وہ کیا فوائد ہیں؟ بظاہر تو یہ ایک جنگلی ہونے کی علامت معلوم ہوتی ہے، ڈاڑھی والے پر لوگ ہنستے ہیں، عورتیں مذاق اڑاتی ہیں، دفاتر و کالج اور اسکول میں تو ڈاڑھی رکھنا موت کو دعوت دینا ہے اور اپنی عظمت برباد کرنا ہے، حالاں کہ اپنے آپ کو بے عزتی سے بچانا مسلمانوں کے لیے ضروری ہے۔

قاسم: جنگلی ہونے کی علامت نہیں ہے، سکھ قوم ڈاڑھی رکھاتی ہیں، اس کو کوئی جنگلی نہیں کہتا، نہ ان پر کوئی ہنستا ہے، نہ عورتیں ان کا مذاق اڑاتی ہیں، نہ دفاتر کالج میں حتی کہ ملٹری میں بھی ان کو ڈاڑھی رکھنے سے کوئی روک نہ سکا اور نہ ان کی بے عزتی کی گئی بلکہ لوگ ان کو سردار جی جیسے معزز لقب سے پکارتے ہیں جو بہادری اور بڑائی پر دال ہے۔

سلیم: ڈاڑھی سے آدمی بڑی عمر کا معلوم ہوتا ہے، اس کو دقیانوسی کہا جاتا ہے، ان سب باتوں سے بھی اپنے آپ کو بچانا ضروری ہے، ڈاڑھی والے کو کوئی مار پیٹ کرنا چاہے تو بڑی سہولت رہتی ہے۔

قاسم: نہ سکھ ڈاڑھی سے بڑی عمر کے معلوم ہوتے ہیں، نہ ان کو کوئی دقیانوسی کہتا ہے، نہ سکھوں کو ڈاڑھی پکڑ کر کوئی مار پیٹ کر پاتا ہے بلکہ ڈاڑھی والے کو مارنے سے لوگ شرماتے ہیں ہمت بھی نہیں ہوتی۔

سلیم: بعض دفعہ آگ وغیرہ جلاتے وقت یا سگرٹ پیتے وقت ڈاڑھی میں آگ لگنے کا خطرہ رہتا ہے، حالاں کہ مسلمان کا خطرہ سے بچنا ضروری ہے۔

قاسم: سکھ تو بیڑی سگریٹ کے علاوہ حقہ بھی پیتے ہیں، مگر ان کی ڈاڑھی کبھی نہیں جلتی، بلکہ بہت سے سکھ ریل کے ڈرائیور بھی ہیں، جو کوئلہ والا انجن چلاتے ہیں، مگر کبھی ان کی ڈاڑھی کو آگ نہیں لگتی۔

سلیم: کبھی کبھی تو ڈاڑھی میں جوئیں پڑ جاتی ہیں ڈاڑھی والا نماز میں ڈاڑھی سے کھیلنے لگ جاتا ہے، جس سے نماز کا خشوع فوت ہوجاتا ہے، بعض لوگ ہر وقت ڈاڑھی کھینچتے رہتے ہیں، جو ایک عادت بن کر بری ہیئت اختیار کر لیتی ہے۔

قاسم: ڈاڑھی میں جوؤں کے پڑنے کا خطرہ ہو تو سر کے بالوں میں اور زیادہ رہتا ہے، پھر بھی لوگ سر کے بال منڈانے کو تیار نہیں، تو ڈاڑھی نے کیا قصور کیا؟ نمازی کی اگر ڈاڑھی نہیں ہوگی تو وہ کپڑے اور ہاتھ کی انگلیوں سے کھیلے گا تو کیا انگلیاں بھی کٹا دینی چاہئے۔

سلیم: ڈاڑھی بعض دفعہ جلدی سفید ہوجاتی ہے، جس سے آدمی بوڑھا معلوم ہونے لگتا ہے، اس سے مسلمان کا رعب ختم ہوجاتا ہے، جب کہ رعب داب انتہائی ضروری ہے۔

قاسم: سر کے بال بھی کبھی بہت جلد سفید ہوجاتے ہیں، ان کو کیوں نہیں کٹاتے؟ ڈاڑھی سے رعب داب ختم نہیں ہوتا، بلکہ اور قائم ہوتا ہے۔

سلیم: بعض دفعہ ڈاڑھی کے بال پانی میں گر کر گلے یا پیٹ میں چلے جاتے ہیں جس سے بہت تکلیف ہوتی ہے۔

قاسم: ڈاڑھی کے بال تو منہ سے نیچے لٹکتے ہیں، پانی میں ان کے گرنے کا سوال ہی نہیں۔ ہاں! سر کے بال گرنے کا احتمال رہتا ہے؛ اسی لیے ڈاکٹر وغیرہ آپریشن کے وقت سر ڈھانک لیتے ہیں۔

سلیم: ڈاڑھی والے سے بچے بھی بہت ڈرتے ہیں، حالاں کہ انسان کو بچوں پر شفیق ہونا چاہئے، ڈاڑھی والا ڈراؤنی شکل کا معلوم ہوتا ہے، حالاں کہ انسان کو جمال اختیار کرنا چاہئے۔

قاسم: ڈاڑھی والے سے بچے اس لیے ڈرتے ہیں کہ گھر میں کوئی ڈاڑھی نہیں رکھتا، لہٰذا جب اچانک ڈاڑھی والا سامنے آتا ہے تو اس کو دیکھ کر بچے ڈرتے ہیں، اگر گھر کے سب افراد ڈاڑھی کے عادی ہوں اور بچوں نے شروع سے گھر میں باپ دادا بھائیوں کی ڈاڑھی دیکھی ہو، تو وہ کبھی ڈاڑھی والوں سے نہیں ڈریں گے، بلکہ بے ڈاڑھی والے سے ڈریں گے۔

سلیم: ڈاڑھی رکھنے سے تیل، کنگھی وغیرہ کا خرچ بڑھتا ہے جو اسراف ہے، اور اسراف سے روکا گیا ہے۔

قاسم: ڈاڑھی رکھنے میں تیل کنگی کے صرفے سے زائد صرفہ تو ڈاڑھی روزانہ مونڈانے میں ہے اور زحمت بھی کافی ہے۔

سلیم: ڈاڑھی رکھنے سے سکھوں اور یہود کے ساتھ تشبہ ہے، حالاں کہ اسلام میں تشبہ ممنوع ہے۔

قاسم: تشبہ وہاں ممنوع ہے جب کہ وہ فعل خود اسلام میں مشروع نہ ہو کیا تشبہ کپڑے پہننے میں بتلا کر ننگے رہنے کو کہا جا سکتا ہے۔

سلیم: ہر آدمی کی ڈاڑھی بھری ہوئی گھنی نہیں نکلتی کسی کے بالکل بکرے جیسی نکلتی ہے جو بدنما معلوم ہوتی ہے، خصوصاً بات کرتے وقت، حالاں کہ بدنمائی سے بچنا لازمی ہے، پتلی گردن چھوٹے منہ والے آدمی کو ڈاڑھی بہت بری لگتی ہے۔

قاسم: بہت کم لوگ ہیں جن کے گھنی نہ نکلے، اور جن کے بکھری نکلتی ہے ان کے منہ پر وہ بھی اچھی لگتی ہے، الا ما شاء اللہ۔ اس کی وجہ سے ایک سنت کو ترک نہیں کیا جا سکتا۔ دیکھو! گنجے سر والے سر کے اطراف کے بال نہیں کٹاتے۔

سلیم: دنیا کی اکثریت ڈاڑھی منڈاتی ہے، جو ایک حجت ہے۔

قاسم: اکثریت تو برے کام بھی کرتی ہے، اسلام کو نہیں مانتی، نماز نہیں پڑھتی، تو کیا اس سے سب اچھے کام برے ہو جائیں گے۔

سلیم: مصری علماء، باوجود شریعت پر گہری نظر ہونے کے، ڈاڑھی نہیں رکھاتے، عرب بھی برائے نام ڈاڑھی رکھاتے ہیں، معلوم ہوا ڈاڑھی منڈانا جائز ہے۔

قاسم: کسی طبقہ کا کسی سنت پر عمل نہ کرنا جواز کی دلیل نہیں ہے پھر کسی عرب کے مفتی نے

اس کی سنیت کا انکار نہیں کیا ہے بعض اہل علم کے نزدیک بطور علامت کے کسی بھی مقدار میں ڈاڑھی کو کافی سمجھا گیا ہے مگر منڈانے کے وہ بھی قائل نہیں۔

سلیم: ہندوستانی علماء نے شاید سادھوسنتوں کو دیکھ کر شروع کی ہوگی جو خود ایک تشبہ ہے جو ممنوع ہے۔

قاسم: ڈاڑھی رکھنا مستقل سنت، اور اسلام کا شعار ہے۔ سادھوسنتوں کی اتباع کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، بلکہ سادھوسنتوں کے عمل سے تو یہ پتہ چلتا ہے کہ ڈاڑھی کو ہر مذہبی لوگوں نے ضروری سمجھا ہے۔

سلیم: عوام ڈاڑھی رکھا کر مولوی معلوم ہونے لگتے ہیں، جس سے لوگ دھوکہ کھا جاتے ہیں اور جاہلوں کو پیشوا بنا لیتے ہیں، جو خود ایک برائی ہے، ڈاڑھی کو لوگوں نے دھوکہ دینے کا ذریعہ بنا لیا ہے، تو اس کے رکھانے میں تہمت ہے اور تہمت سے بچنا ضروری ہے۔

قاسم: اب لوگ بہت ہوشیار ہو گئے ہیں، ان کو کوئی زیادہ دن تک دھوکہ نہیں دے سکتا، کچھ دن میں قلعی کھل جاتی ہے اور جو بے عزتی ہوتی ہے، اس کے ڈر سے ڈاڑھی والا کسی کو دھوکہ دینے سے گھبراتا ہے بلکہ جب لوگ ڈاڑھی والے کو مولوی سمجھ کر مولوی جیسا برتاؤ کرتے ہیں، تو وہ بھی اپنے اس بھرم کو باقی رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔

سلیم: جنت میں لوگوں کی ڈاڑھی نہیں ہوگی معلوم ہوا کہ ڈاڑھی جمال نہیں ہے ورنہ وہاں ڈاڑھی ضرور ہوتی۔

قاسم: جنت میں ڈاڑھی پیدا ہی نہیں کی جائے گی، ایسا نہیں ہے کہ جنتی لوگ روزانہ ڈاڑھی منڈائیں گے، ممانعت منڈانے کی ہے زبردستی نکالنے کا حکم نہیں ہے۔

سلیم: بچہ بھی بے ڈاڑھی پیدا ہوتا ہے معلوم ہوا کہ یہ زائد چیز ہے، لہٰذا اس کو کٹا دینا چاہئے۔

قاسم: بچہ بے دانت بھی پیدا ہوتا ہے، لہٰذا دانت نکلتے ہی ان کو توڑ ڈالنا چاہئے۔

سلیم: ہندو مسلم فساد کے موقع پر ڈاڑھی والے چن چن کر قتل کیے جاتے ہیں حالانکہ اسلام میں جان کی حفاظت فرض ہے۔

قاسم: ہندو مسلم فساد میں ڈاڑھی شہادت دلاتی ہے اور ڈاڑھی والے کی میت شرعی تدفین سے سرفراز ہوتی ہے جبکہ بے ڈاڑھی والوں کی میت اکثر جلا دی جاتی ہے، یاد رکھو ہم نے

پورے طور پر اپنے آپ کو نبی کے ہاتھ میں دے دیا ہے ہمارا چلنا ہمارا پھرنا ہمارا اٹھنا ہمارا بیٹھنا ہمارا سونا ہمارا جاگنا ہماری وضع قطع ہماری شکل وشباہت ہماری بود و باش جب تک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تابع نہ ہو تب تک ہم کامل مومن نہیں ہو سکتے، ہم نے کلی طور پر ہر فعل اللہ کے لیے وقف کر دیا ہے۔"اِنَّ صَلَاتِیْ وَ نُسُکِیْ وَ مَحْیَایَ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْن... الخ" یہی معنی ہے مومن ہونے اور مسلمان ہونے کے مسلمان ہونا آسان نہیں ہے۔"چوں گویم مسلمانم بلرزم کہ دانم مشکلات لا الہ را"۔ اگر کوئی معمولی معمولی اعذار کو حیلہ بنا کر اسلامی زندگی کو ترک کرتا ہے، تو اس کا اسلام سے کوئی ناطہ نہیں "یہ شہادت گہہ الفت میں قدم رکھنا ہے" لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلمان ہونا۔ ہم نے اسلامی زندگی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے طریق کو دنیا کی تمام نعمتوں پر ترجیح دی ہے، اس کی خاطر ہر قسمی مکروہات اور مصائب کو انگیز کیا ہے، پھر ہمیں تو یہ بھی تسلیم نہیں کہ ڈاڑھی میں اتباع سنت کے علاوہ کوئی فائدہ نہیں کوئی ایسی سنت نہیں جس میں کوئی فائدہ نہ ہو ڈاڑھی انسان کا وقار اور آبرو ہے، چناں چہ عرش کے پاس ہزاروں فرشتوں کی تو تسبیح ہی یہ ہے کہ:سُبْحَانَ مَنْ زَیَّنَ الرِّجَال بِاللُّحٰی سُبْحَانَ مَنْ زَیَّنَ النِّسَاءَ بِالذَّوَائِبِ ،ڈاڑھی والا آدمی بارعب اور مرد معلوم ہوتا ہے، جب کے بے ڈاڑھی والا عورت کے مشابہ معلوم ہوتا ہے اور تشبہ بالنساء ممنوع ہے، بے ڈاڑھی والے کو لوگ جلد گالی دینے لگتے ہیں، چاہے وہ بوڑھا کیوں نہ ہو اس لیے کہ اس کی عمر کا پتہ نہیں چلتا جب کہ سفید ڈاڑھی والے سے لوگ شرماتے ہیں، ڈاڑھی والے کی مدد کے لیے لوگ ڈورتے ہیں، جبکہ بے ڈاڑھی والے کی کوئی پرواہ نہیں کرتا، ڈاڑھی والا ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء اور لاکھوں اولیاء اللہ سے مشابہت رکھتا ہے ڈاڑھی والے سے جب کہ سفید ڈاڑھی ہو اللہ بھی حیاء کرتے ہیں اور اس کی دعاء رد نہیں کرتے، ڈاڑھی والے مسلمان کی میت ریلوے یا ہوائی حادثات میں پہچان لی جاتی ہے اور شرعی تدفین کی نعمت سے سرفراز ہوتی ہے، ڈاڑھی اگر شرعی انداز پر دراز اور سنواری ہوئی مہذب ہو تو خوبصورتی اور جمال کا ذریعہ ہے دنیا کے بڑے بڑے عقلاء، فلاسفہ، ڈاڑھی والے ہی گزرے ہیں، ڈاڑھی والا روزمرہ کے منڈانے کے خرچ سے بچ جاتا ہے، ڈاڑھی سردی کے موسم میں اونی مفلر کا کام دیتی ہے، گرمی میں وضو اور غسل کے بعد اگر پانی تولیہ سے صاف نہ

کیا ہو تو خس کی ٹٹی کا مزہ دیتی ہے، اسکول میں ڈاڑھی والے کو طلبہ آزماتے ہیں کہ پکا ہے یا کچا، اگر پکا ہو تو پورا اسٹاف عزت کرنے لگتا ہے، اس کی مثالیں موجود ہیں لوگ ڈاڑھی والوں پر ہی اعتماد کرتے ہیں، ڈاڑھی فساد میں قتل نہیں کراتی، شہادت دلاتی ہے، جبکہ بے ڈاڑھی والے اپنے کفر کا اظہار کر کے بھی نہیں بخشے جاتے، ڈاڑھی بہت سے ظاہری گناہوں میں شرکت سے باز رکھنے کا ذریعہ ہے ڈاڑھی کی وجہ سے نماز وغیرہ چھوڑنے میں شرم محسوس ہوتی ہے، داڑھی رکھ کر جھوٹ بولنے پر دل ملامت کرتا ہے، ڈاڑھی والوں کی بیویوں کو بھی بہت سے ظاہری گناہوں سے بچنے کی توفیق ہو جاتی ہے، ڈاڑھی والا اسلامی طور پر امامت اذان اور اسلامی عدالت میں شہادت دینے کا اہل قرار پا کر عزت کا مستحق ہوتا ہے، جب کہ بے ڈاڑھی والا ان ثواب کے کاموں اور اعزازوں سے محروم رہتا ہے۔ ان تمام خوبیوں کے سننے کے بعد اور اس علم کے بعد کہ تمام انبیاء، صحابہ، اتقیاء اور اولیاء اللہ نے ہمیشہ ڈاڑھی رکھائی ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ڈاڑھی رکھانے کا امر فرمایا، فقہاء نے نہ رکھانے والے کو فاسق و مردود الشہادۃ قرار دیا کیا اب بھی آپ ڈاڑھی کٹانے کی بدعملی کا شکار ہوں گے۔ بولو!

سلیم: ہرگز نہیں۔

قاسم: توبہ کرو!

سلیم: اللہ میری توبہ۔

قاسم: اس طرح نہیں لاؤ ہاتھ میرے ہاتھ پر آج بیعت کرو کہو بیعت کی میں نے مولوی قاسم کے ہاتھ پر میں گناہ نہیں کروں گا چھوٹا ہو یا بڑا نماز نہیں چھوڑوں گا ڈاڑھی نہیں منڈاؤں گا کسی مسلمان کو ایذا نہیں دوں گا، جھوٹ نہیں بولوں گا چوری نہیں کروں گا۔ لو تسبیح بارہ، تسبیح روز کا معمول بناؤ اللہ تمہاری اصلاح کرے، اپنے حالات سے مجھے مطلع کرتے رہنا اور اصلاح کرواتے رہنا۔

سلیم: اچھا السلام علیکم۔

قاسم: وعلیکم السلام۔

(۱۱) فلم

اکرم: انور صاحب! السلام علیکم۔

انور: وعلیکم السلام۔

اکرم: انور صاحب! کیا آپ کو معلوم ہے کہ فلمی دنیا نے ترقی کی طرف ایک قدم بڑھایا ہے۔

انور: وہ کیا؟

اکرم: ایک بہترین فلم تیار ہو رہی ہے، جس کی مدد سے ہم پیغمبر کی زندگی کو چلتا پھرتا دیکھ سکیں گے۔

انور: لاحول ولاقوۃ الا باللہ! اکرم صاحب! مسلمان ہو کر آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں، سنیما کا پردہ اور اس پر صحابہ اور پاکباز انسانوں کی تصویریں! اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ مِنْ ذٰلِکَ۔

اکرم: جناب! لاحول نہ پڑھیے، ذرا میری بات سنیے، ساری دنیا اس بات پر متفق ہے کہ سننے کے مقابلہ میں انسان دیکھنے سے زیادہ متاثر ہوتا ہے۔

انور: پھر آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟

اکرم: میں کیا کہنا چاہوں اور کیا کہوں آپ تو "لاحول" اور "استغفر اللہ" میں لگ جاتے ہیں، آدمی کسی بات پر غور وخوض کرنے کا عادی ہو تو اس سے بات کی جائے۔

انور: ارے صاحب! کہیے کس بات پر غور وخوض کرنا ہے، آپ کون سی ایسی بات کر رہے ہیں جس کی خرابی کو سمجھنے کے لیے لقمان کی حکمت کی ضرورت ہے۔ کیا سنیما کوئی ایسی چیز ہے جس کی برائی پر تقریر کرنے کی ضرورت ہے، اس کی خرابی اور نقصان کو ایک بچہ بھی جانتا ہے، اور جب اس کا دائرہ اتنا بڑھا دیا جائے کہ صحابہ اور انبیاء تک کی نقالی اس کے پردے پر ہونے لگے تو پھر اس برائی کا کیا کہنا۔

اکرم: ہاں جناب! میں یہی چاہ رہا تھا کہ آپ کسی راستے پر آ جائیں تو بات کی جا سکے اب آپ نے دو باتیں کہیں، ایک یہ کہ نفس سنیما نقصان اور گناہ کا سبب ہے، دوسرے پاک

انسانوں کی زندگی کو وہاں دکھلانا اور بڑا پاپ ہے۔

انور: تو کیا اس میں دو رائیں ہو سکتی ہیں۔

اکرم: انور صاحب! آپ اگر خفگی کے ماحول میں بات نہ کریں تو میں آپ سے ان دونوں مسئلوں پر گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔ جہاں تک نفس سنیما کی برائی کا تعلق ہے، تو میں آپ سے کہتا ہوں کہ اس میں کیا برائی ہے؟ کیا کھیلنا اور کھیل دیکھنا انسان کی فطرت نہیں ہے؟ کیا ہمارے آباء واجداد نٹ، بھیریوں اور بھانڈوں کا تماشہ نہیں دیکھتے تھے۔

انور: ضرور دیکھتے تھے اور کھیل کود کی بھی اجازت ہے، مگر نہ اس کھیل کود کی جو آج سنیما کے نام سے دیکھا جا رہا ہے، جس میں سماج کی ماں بہنیں وہ شرمناک حرکتیں کر رہی ہیں، جن کو اگر بعض غیر تمند جانوروں کو دکھلایا جائے تو وہ بھی شرم سے پانی پانی ہو جائیں۔

اکرم: ارے صاحب! آپ تو کسی چیز کا صرف ایک ہی پہلو دیکھتے ہیں، اگر اس میں کچھ چیزیں خراب مان لی جائیں، تو کیا اس میں اصلاحی کہانیاں، سبق آموز ڈرامے اور معلوماتی اسٹوریاں نہیں ہوتیں؟

انور: جی ہاں! ہوتی ہوں گی مگر ایمانداری سے کہنا کہ ایسی کتنی فلمیں ہوں گی جن میں خالص یہی رنگ ہو، سچ تو یہ ہے، کہ کیسی ہی تاریخی فلم کیوں نہ ہو بازار میں اس وقت تک اس کی پوچھ نہیں ہے، جب تک اس میں جنس، عریانیت، بوس وکنار، عشق بازی، فحاشی اور شہوت انگیز مناظر موجود نہ ہوں۔

اکرم: میں سمجھتا ہوں اگر تماشے کو تماشہ سمجھ کر اس کو دیکھ لیا جائے اس سے کوئی اثر نہ لیا جائے تو اس میں کیا حرج ہے؟

انور: جی ہاں! تماشے سے ہی بات شروع ہوتی ہے، اور پھر سماج کا ہر فرد سماج کی بہو بیٹیوں کے ساتھ گلی کوچوں میں اس کی عملی مشق شروع کر دیتا ہے، حتی کہ اب تو چوری ڈکیتی کے وہ مناظر سنیما میں دکھلائے جانے لگے ہیں، جن کو دیکھ کر لوگ ڈکیتی شروع کر دیتے ہیں، بلکہ ایسے واقعات ہیں کہ بعض لوگوں نے پولیس کے پوچھنے پر بیان دیا کہ ہم نے یہ حرکت فلاں سنیما دیکھ کر سیکھی تھی۔

اکرم: مگر صاحب بعض احمقوں کی اس غلط اثر پذیری کو حجت بنا کر ایک زبردست فن لطیف کو معطل نہیں کیا جا سکتا، اس کے ذریعے شعر وشاعری، گانا، اداکاری، رقص وسرود

ایکٹنگ اور ہزار ہا قسم کی کہانیاں اور فنون لطیفہ وجود میں آرہے ہیں، جن میں بے پناہ سبق ہیں؛ نیز اس طرح لاکھوں انسانوں کو دھندا ملا ہوا ہے۔

انور : آپ کو مسلمان ہونے کے ناطے یہ بات دل میں بٹھا لینا چاہئے کہ اسلام نے ہر چیز کی ایک حد مقرر کر رکھی ہے، اسلام میں ایسے کسی کھیل تماشے کی ادنیٰ گنجائش نہیں ہے، جو سیکڑوں محرمات کا سرچشمہ ہو، ناچ، گانا، رقص وسرود، یہ وہ حرکات ہیں جو آخرت کی بربادی کے ساتھ دنیوی طور پر بھی سماج میں آوارگی، غنڈا گردی کا بیج بوتی ہیں۔

اکرم: اس کا مطلب تو یہ ہے کہ مسلمان نام ہے، ایسے خشک انسان کا جو کوئی کھیل تماشہ نہیں دیکھ سکتا، چلے تو آہستہ بات کرے تو آہستہ، سہا ہوا ڈرا ہوا، آخرت کے خوف سے ہر وقت چشم پُرنم دنیا کی تمام خوشیوں سے محروم اور کنارہ کش، ظاہر کہ یہ سب بڑھاپے کے حالات ہیں، جوانی میں اس طرح رہنا دشوار ہے۔

انور : اگر منورنجن، خوشی اور کھیل آپ کے یہاں مٹکنے، تھرکنے، گانے، ناچنے، کھلے عام مرد عورت کے اختلاط، بوس و کنار، طبلے، سارنگی کی آواز پر رقص وسرود، بے حیائی، بے حجابی، عریانیت اور فحاشیت کا نام ہے، تو یاد رکھئے اسلام میں اس کی ہرگز گنجائش نہیں۔

اکرم: جناب! یہ کون کہہ رہا ہے کہ سب لوگ ناچنے گانے لگیں بلکہ سماج میں جیسے صفائی کرنے والوں، جھاڑو دینے والوں کی ضرورت ہے، اس طرح اگر کچھ پیشہ ور لوگ کھیل تماشے کا پیشہ کریں اور انسان خوشی ومسرت کے لیے اس کو دیکھ لیا کرے تو کیا حرج ہے، کیا ہر بری چیز میں سے اچھے نتیجے نہیں نکالے جا سکتے۔

انور : جی ہاں! بہت اچھے نتیجے نکل رہے ہیں، جب سے سینما کی ایجاد ہوئی ہے اور جہاں جہاں یہ سینما گھر کھلے ہیں، نوجوان کا ستیاناس ہو گیا ہے، جس کو دیکھو آوارہ، ناکارہ بنا پھرتا ہے، اداکاروں سے ان کو اتنی محبت ہے کہ ان کو چال میں، ڈھال میں، لباس میں، ہر طرح ان نوجوانوں نے اپنا پیشوا بنا رکھا ہے، ان کی اتباع کا بھوت ایسا سوار ہوا ہے کہ نبی کی اتباع کو بھی پیچھے ڈال دیا ہے، اور آپ ہیں کہ اس میں کوئی حرج نہیں سمجھ رہے ہیں۔

اکرم: اچھا جناب! میں آپ سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ اگر کوئی بالکل تہیہ کر لے کہ میں قطعاً اس سے کوئی اثر نہیں لوں گا تو کیا آپ اس کو بھی دیکھنے کی اجازت نہیں دیں گے۔

انور: ارے صاحب! ہم ہوتے کون ہیں اجازت دینے نہ دینے والے؟ یہ حق تو شارع کو ہوتا ہے۔ لہٰذا آپ کو اچھی طرح جان لینا چاہئے کہ باجا، ناچ وغیرہ اور خصوصاً وہ حرکات اور مناظر جو آج کل تھیٹروں میں دکھائے جا رہے ہیں، ان کی ادنیٰ گنجائش بھی نہیں کسی گناہ کی اس لیے اجازت نہیں دی جا سکتی کہ لوگ اس کو پسند کرتے ہیں، اور وہ دل بہلانے کی چیز بن چکی ہے، اگر ایسی چھوٹ دی گئی، تو سکون اور امن خطرے میں پڑ جائے گا، اور وہ صالح معاشرہ دنیا سے ناپید ہو جائے گا جس کو پیدا کرنے کے لیے مذہب آیا ہے۔

اکرم: اچھا! اگر یہی بات ہے کہ گانا، ناچ، رقص وسرور، باجے تاشے، فحاشی عریانیت؛ یہ آج اخلاقی فساد کی جڑ بنے ہوئے ہیں۔ تو مذہبی اشخاص سے متعلقہ فلمیں اور خالص تاریخی فلمیں تو کم از کم ٹھیک ہونا چاہئے۔ مثلاً: رام لیلا ہی کو لے لیجئے، اس کو دیکھ کر ہندوؤں کے قلوب گرم ہو جاتے ہیں اور ان میں مذہبی ولولہ پیدا ہو جاتا ہے۔

انور : افسوس صد افسوس! وہ مذہب جس نے انسان کو صورت اور ظاہر پرستی سے ہٹا کر حقیقت اور معنویت کا سبق دیا تھا، جو اپنے پرستاروں کو اخلاق وعمل کا چلتا پھرتا نمونہ بنانے آیا تھا، جس کے اسلاف نے اپنے اعمال سے ساری دنیا کو اسلام کا گرویدہ بنا رکھا تھا، جن کی ایک نظر کیمیا کا کام کرتی تھی، جن کے تقوے اور تقدس کا جانور بھی احترام کیا کرتے تھے، جن کے جد امجد مسجود ملائکہ تھے، جن کی جنبش ابرو سے عناصر منقاد ہو جایا کرتے تھے، جن کے نکلنے کے لیے دریا راستہ دیتے تھے، جن کی پھونک سے مردے زندہ ہو جایا کرتے تھے، جن کو دیکھ کر کافر کلمہ پڑھنے لگتے تھے، جن کے لئے چاند، سورج ٹھہر جایا کرتے تھے، آج ان کے ماننے والے، ان حقیقی اعمال کو چھوڑ کر صرف ظاہر کی نقالی کی طرف جا رہے ہیں یعنی وہ اعمال سینما کے پردے پر دیکھنے دکھانے کے لیے کئے جائیں اور ان کو اسلام کے فروغ کا ذریعہ سمجھا جائے اور ان کو وہ لوگ دکھلائیں جو عمل سے تھوڑے نہیں میلوں دور ہوں اور وہ افراد یہ نقالی کریں جن کی رات دن کی زندگی زنا، شراب، ناچ، گانے میں گزرتی ہو جو شعائر دین سے قطعاً ناواقف ہوں۔

اگر برتن خراب ہو تو اس میں اچھی چیز کو نہیں رکھا جا سکتا، کیا کوئی جوتے میں دال رکھ کر کھا سکتا ہے! اگر نہیں تو وہ مقامات جن کا موضوع گانے، ناچنے، تھرکنے، مٹکنے کے سین کے

لیے ہو، اس میں مقدس حضرات کی نقالی کیسے کی جاسکتی ہے؟ ارے بھائیو! اس تماشے کو چھوڑو، حقیقت کو اختیار کرو، اسی سے دنیا متاثر ہوتی ہے، اگر تم اسلامی طریقے اختیار کر کے اسلامی زندگی گذاروگے تو دوسرے متاثر ہوں گے، صرف نقل کسی کو متاثر نہیں کرسکتی، افسوس کہ مسلمان کو شرم نہیں آتی کہ وہ ان خطوط پر سوچتا ہے، کیا اس نے قرآن نہیں پڑھا ہے؟ کیا وہ شیطان کے فریب کے سے باخبر نہیں ہے؟ کیا اس کو اللہ کو جواب نہیں دینا ہے؟ کیا اس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات نہیں کرنی ہے؟ کچھ تو شرماؤ، اگر اسی طرح سوچا جاتا رہا تو نہ جانے کس کس راستے سے اسلام کو ختم کرنے کی راہیں کھل جائیں گی۔

اکرم: انور صاحب! آپ کی اس وقت کی گفتگو سے مجھے اسلام کے مزاج کو سمجھنے کے لیے کافی روشنی ملی ہے، میں نہیں سمجھتا تھا کہ آپ ایسی مدلل اور سلجھی ہوئی گفتگو کرتے ہیں، انشاء اللہ میں آئندہ بھی آپ سے ملاقات کرتا رہوں گا اور اپنے شبہات کے ازالے کی کوشش کروں گا۔ السلام علیکم۔

انور: وعلیکم السلام۔

(۱۲) فلم پیغامِ اسلام

ساجد: ماجد صاحب! آداب۔

ماجد: ارے! آداب کیا، السلام علیکم کہئے۔

ساجد: آخر اس میں کیا حرج ہے کیا یہ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ کی قائم مقامی نہیں کرسکتا؟

ماجد: قطعاً نہیں، بہت بڑا حرج ہے، جب اسلام نے خود ایک طریقہ ملنے جلنے کا اور ملاقات کے وقت السلام علیکم کے متعینہ کلمات ادا کرنے کا بتلایا ہے، تو آپ ان کو کیوں ترک کررہے ہیں، میں نہیں سمجھتا کہ مسلمان آخر اسلامی تہذیب اور اس کی تعلیمات سے کیوں فائدہ نہیں اُٹھاتے؟

ساجد: اچھا! اس وقت اس بحث کو رہنے دیجئے، میں آپ کو ایک اہم سوال کی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہوں۔

ماجد: فرمائیے!

ساجد: ماجد صاحب! فلم محمد صلی اللہ علیہ وسلم جس کا نام اب پیغام رکھ دیا گیا ہے، اس کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے، جب کہ اس میں خالص اسلامی تاریخ، اسلام کے ابتدائی حالات، صحابہ کے ظلم تشدد برداشت کرنے اور اسلام کی اشاعت کے لیے جدوجہد اور محنت کے وہ مناظر دکھلائے گئے ہیں، جن کو دیکھ کر اس دور کا نقشہ سامنے آجاتا ہے، بہت سے لوگ جو اس سے ناواقف تھے کہ کفار نے حق پرست جماعت کے ساتھ کیا کیا بدسلوکی کی وہ پردہ پر یہ واقعات دیکھ کر تاریخ کی سچائی کے قائل ہوتے ہیں، بعض اسلام لارہے ہیں، جو پہلے سے مسلمان ہیں، ان میں ایمان ویقین کی پختگی، صحابہ سے محبت اور خود بھی کچھ کرنے کا جذبہ پیدا ہورہا ہے، بلکہ بعض مناظر دیکھ کر تو لوگ آبدیدہ ہوتے ہیں۔

ماجد: جی ہاں! آپ سے ایسے ہی سوال کی توقع تھی، السلام علیکم کی جگہ آداب کا لفظ سن

کر ہی میں سمجھ گیا تھا کہ آپ کا طرزِ فکر کیا ہے؟ اب اس سوال کا جواب میں آپ کو کیا دوں اور جواب کہاں سے اٹھاؤں؟ میں سمجھتا ہوں کہ میں مسئلہ کو بہت نیچے سے اٹھانے کے بجائے ایک معمولی تمہید کے بعد آپ کے سوالات کا جواب دے دوں کیوں کہ اصطلاحی، فقہی اور خالص شرعی زبان آپ کے لیے موزوں نہ ہوگی۔

ساجد: اچھا! آپ مجھے بیوقوف سمجھ رہے ہیں، رہنے دیجیے، میں آپ کی بات سننا نہیں چاہتا۔

ماجد: ارے! آپ تو خفاء ہو گئے ناراض ہونے کی کیا بات۔

ساجد: اچھا! ناراضگی کی بات کیسے نہیں آپ تو ایسی بات کہہ رہے ہیں کہ میں گویا ایک جاہل آدمی ہوں تبھی تو آپ سوچ رہے ہیں کہ کیسے جواب دوں اور کہاں سے جواب اٹھاؤں، کیا جواب قبر میں پڑا ہے کہ آپ کو اٹھانا پڑ رہا ہے، یا میں بدھو بخش ہوں کہ آپ جیسے چار پیسے کی قیمت والے آدمی کی بات نہیں سمجھ سکتا، آپ کو معلوم ہونا چاہیے کے میں ہائی کورٹ کا وکیل ہوں شاید آپ کے تو پورے خاندان میں کسی کو یہ عہدہ نصیب نہ ہوا ہوگا۔

ماجد: اللہ اللہ! آپ تو لڑائی پر اتر آئے واللہ باللہ تاللہ حاشا کلا میرے حاشیۂ خیال میں بھی یہ بات نہیں ہے کہ میں آپ کی توہین کروں، آپ نے مجھے جو صلوٰتیں سنائیں وہ سر آنکھوں پر، میں آپ سے معافی چاہتا ہوں، آپ تو خدا کے فضل سے دانا و عقلمند آدمی ہیں۔

ساجد: رہنے دیجیے! آپ لوگ تو یہ سمجھتے ہیں کہ دنیا میں جتنی عقل بٹی تھی، وہ سب مولویوں ہی کو مل گئی باقی سب گھاس کھودتے ہیں۔

ماجد: نہیں صاحب! جو ایسا سوچتے ہیں وہ غلطی پر ہیں، خدا نہ کرے آپ گھاس کھودیں آپ تو سونا تولتے ہیں، اچھا یہ سب باتیں چھوڑ کے ساجد صاحب بات سنئے۔

ساجد: بات جب سنوں گا جب آپ یہ تسلیم کریں کہ مجھ میں بات سمجھنے کی صلاحیت ہے۔

ماجد: اجی! کہہ تو رہا ہوں، آپ تو اپنے وقت کے ارسطو اور لقمان ہیں۔

ساجد: ہاں! اس طرح بات ہوگی فرمائیں۔

ماجد: مگر پہلے اس بات کی ضمانت دیجیے کہ اگر میں آپ کی موافقت میں نہ بول سکوں تو

میرا منہ تو نہیں نوچو گے۔

ساجد: استغفر اللہ! میں منہ کیوں نوچوں گا جب کہ بات معقول ہو۔

ماجد: جی نہیں! آپ کے اس وقت کے رویہ سے مجھے ڈر لگنے لگا ہے۔

ساجد: ڈریئے نہیں! جو بات اس سلسلہ میں آپ کے نزدیک بہ حیثیت اسلام صحیح ہو وہ کہیئے۔

ماجد: اچھا! تو سنئے، اسلام ایک مہذب اور معقول و مقدس مذہب ہے، اس کی عبادات، اس کا بتلایا ہوا طریقِ زندگی، اس کی وہ شخصیات جن سے چل کر ہم تک اسلام پہونچا، سب مقدس ہے۔ اسلام کو اپنی عبادت، تعلیمات یا اپنی اشاعت کے لیے کسی خارجی مدد کی ضرورت نہیں ہے، اس میں خود وہ جاذبیت ہے کہ قلوب اس کو سن کر اور پڑھ کر اس کی طرف کھینچتے ہیں۔ اسی لیے اسلامی عبادات یا قرآنی تلاوت کے لیے باجے، طبلے، سارنگی، تالی، ہرمونیم کی قطعاً ضرورت نہیں ہے، جیسا کہ دیگر مذہب والے اپنی عبادت یا بھجن کے وقت اختیار کرتے ہیں سادہ آواز میں قاری پڑھتا چلا جاتا ہے اور قرآن سامعین کے دل و دماغ کو متاثر اور حلاوت بخشتا رہتا ہے، یہی حال اس کی تاریخ اور شخصیات کا ہے، اس کو ڈرامے کی طرح نقالی کر کے پردہ پر دکھلانے کی ضرورت نہیں، جیسے کہ بعض قومیں اپنے ریفارمرس کی سوانح کو اس طرح پیش کرتی ہیں، اسلام کو اس کی قطعاً ضرورت نہیں ہے، اس کے صحابہ و انبیاء وہ زندگی رکھتے تھے جس کو سن کر ہی گردنیں جھک جاتی ہیں۔ ان کی پاک سیرت کسی ظاہری نمائش اور وقتی نقالی کی محتاج نہیں ہے نہ وہ اس کو پسند کرتے تھے، ان کا پیغام تو یہ تھا کہ دنیا کے سب انسان ان جیسے اخلاق پیدا کریں اور اسلام کی تعلیم اپنا کر ہر شخص نیکی اور بھلائی کا مجسمہ بنے، نہ کہ وقتی طور پر فرضی اداکاری کر کے چند گھنٹے کے لیے کیمرے کے آگے بہروپیہ کی طرح نیکوں کی شکل بنالی جائے اور اس کے بعد ساری زندگی تاریک ہو۔ اسلام تو اچھے اعمال اور اچھی زندگی کا مطالبہ کرتا ہے نہ کہ مصنوعی زندگی کا، اگر اسی طرح لوگ پردہ پر ان واقعات کی نقالی کر کے دیکھتے دکھلاتے رہے، تو لوگ اسلام کو بھی ایک کھیل کہانی ساز کی ایک فرضی کہانی اور فنکاروں کی ایک نقالی سے زیادہ وقعت نہیں دیں گے، اور جیسے مار دھاڑ، پیار و محبت، عشق مستی کے بہت سے کھیل، وہ پردہ پر دیکھ کر ذہنی تفریح کر کے چلے آتے ہیں، ایسے

ہی وہ اسلام کی تاریخ کو سمجھنے لگیں گے؛ حالاں کہ وہ ایسے مقدس حضرات کی تاریخ ہے، جن کی نسبت اپنی طرف کرنا اور ان کا تماشائی رول ادا کرنا پھر اس کو ایسی جگہ دکھانا جو سیکڑوں فواحش کا مرکز اور اسلامی تعلیمات کے منافی کاموں کا اڈہ ہو قابل افسوس بات ہے، افسوس کیا کوئی مسلمان اتنی بات نہیں سمجھتا، اگر اسی طرح ان چیزوں کی اجازت دی جاتی رہی، تو عجب نہیں، ایک دن ایسا آئے گا کہ لوگ خدا کی فلم بنائیں اور ایک شخص خدا بن کر وہ جملے ادا کرے جو خدا ہی کے ساتھ مخصوص ہیں، ایک زمانہ وہ تھا کہ ایک مسلمان کا ٹھیٹر میں جانا برا سمجھا جاتا تھا، اور آج ''صحابۂ کرام کا رول پردہ پر دکھلانے میں کیا حرج ہے'' کے نعرے لگ رہے ہیں۔ خدارا اسلام کے امتیاز کو باقی رکھو۔ اور دوسری قوموں کی طرح اسلام کی مقدس ہستیوں کو کھیل تماشے اور پیسہ کمانے کا ذریعہ مت بناؤ۔ ہزاروں سال سے عیسائی تاریخ اور رام لیلائیں اسٹیج اور پردہ پر دکھلائی جارہی ہیں کیا کوئی انسان اس کو دیکھ کر عیسائی یا ہندو ہوا؟

یادرکھو! حقیقی اتباع اور سچا بن جانے سے لوگ متاثر ہوتے ہیں نہ کہ نقلی اور فرضی اور وقتی رول ادا کرنے والے کی اداکاری سے رول میں زیادہ سے زیادہ رول ادا کرنے والے کی فن کی تعریف اور توصیف ہوتی ہے اصل حقیقت کا اس میں شائبہ بھی نہیں ہوتا، اسلام کی حقیقی اشاعت ان اعمال کو زندہ کرنے سے ہوگی جو ان حضرات نے کئے تھے نہ کہ کھیل تماشوں کے پروپیگنڈوں سے جن کا مطمح نظر چند پیسے کمانے کے علاوہ کچھ نہیں۔ اگر ان کے دل میں اسلام کی قدر ہے، تو پہلے خود اسلامی زندگی اختیار کریں، ان کو سچا مسلمان دیکھ کر خود راستہ چلتے لوگ اسلام اختیار کریں گے، جیسے معین الدین چشتیؒ کی زندگی اس کا ثبوت دے چکی ہے، آخر ہر مذہب کے کچھ اصول ہوتے ہیں اس کا مزاج ہوتا ہے، اس کی اپنی کچھ حدود ہوتی ہے تب ہی تو مذہب کہلاتا ہے، اور وہی اس کا امتیاز ہوتا ہے، جب اسلام کا مزاج ان چیزوں سے میچ نہیں کھاتا تو اس کو کیوں اس کے حدود سے باہر لانے کی کوشش کی جارہی ہے اور اس کے ماننے والوں سے کیسے اجازت مانگی جارہی ہے۔ شاید آپ میرے جواب سے مطمئن نہ ہوئے ہوں گے، اس لیے کہ آپ کے سوچنے کا انداز ہی الگ ہے مگر ہم اس کے علاوہ کسی بات کے سوچنے سے معذور ہیں اور نہ اسلام ہم کو اس کی اجازت دیتا ہے۔

ساجد: آہ! آپ نے تو میرے دل کو بیدار کردیا مجھے اسلام کی روح سے واقف کردیا، آپ کو ابتدا میں میں ایک متکبر عالم سمجھتا تھا، مگر آپ کے کلام کی حلاوت چاشنی اور پُرمغز گفتگو نے میرے دل و دماغ کو بدل دیا، خدارا آپ میرے مربی بن جایئے، اب میں سمجھا کہ کسی صاحبِ دل عارف و عالم کی بات سنے بغیر آدمی صحیح و غلط میں امتیاز نہیں کرسکتا، سونے کی پرکھ سنار ہی کرسکتا ہے، کاش کہ میں آپ سے بہت پہلے ملا ہوتا تو میری زندگی کے وہ لمحات جو میں نے غفلت اور بے حسی میں ضائع کردیئے، اسی طرح برباد نہ ہوتے، مجھے اب ایک شمع مل گئی ہے، اب میں تازندگی اس کا پروانہ بنا رہوں گا، خدا آپ کا اُجالا تاقیامت باقی رکھے۔

ماجد: میں آپ کی اس ذرہ نوازی کا شکرگزار ہوں قدر بات کی کرنی چاہئے نہ کہ افراد کی میں تو آپ ہی جیسا ایک آدمی ہوں، البتہ یہ بات اسلام کی تعلیم کی روشنی میں کہی گئی تھی، جس سے آپ متاثر ہوئے، خدا مجھے اور آپ کو اسلام کی تعلیم سے روشنی حاصل کرنے کی توفیق بخشے۔ آمین! السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔

ساجد: وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔

(۱۳) قربانی اور اسلام

سعید: السلام علیکم رفیق صاحب۔

رفیق: وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ، کہیے مزاج تو بخیر ہیں سعید صاحب!

سعید: الحمدللہ۔

رفیق: سعید صاحب! کہاں تشریف لے گئے تھے۔

سعید: رفیق صاحب! میں آج بوڑھان گیا تھا۔

رفیق: کیوں؟ وہاں کیسے جانا ہوا۔

سعید: ارے بھائی! بقرعید آرہی ہے نا تو بکرے وغیرہ کی فکر کرنی ہے سنا تھا کہ وہاں ذرا سستے ملتے ہیں اس لیے سوچا کہ وہاں جا کر خرید لوں، آپ بھی تو قربانی کرتے ہوں گے آپ کہاں سے جانور خریدتے ہیں۔

رفیق: سعید صاحب! میرا تو یہ ارادہ ہے کہ بجائے جانور کی قربانی کرنے کے اتنے پیسے غرباء پر خرچ کر دیا کروں۔ گوشت کے بجائے پیسوں سے ان کی ضروریات زیادہ پوری ہوں گی۔ گوشت کو تو وہ ایک دو دن میں کھا پی کر برابر کر دیتے ہیں۔

سعید: نہیں بھائی! آپ کیا فرما رہے ہیں، اس طرح قطعاً آپ کی قربانی ادا نہ ہوگی، قربانی کے ایام میں قربانی ہی واجب ہے، ایک چھوٹا جانور یا بڑے جانور میں ایک حصہ ہی لے کر اس واجب کو ادا کیا جا سکتا ہے۔ آپ کا یہ سمجھنا کہ غرباء کو گوشت سے زیادہ پیسوں سے فائدہ ہوگا، اس خیال کی ترجمانی کرتا ہے کہ آپ قربانی کو صرف غرباء پروری کا ذریعہ سمجھ رہے ہیں حالاں کہ اس عبادت کی روح قطعاً یہ نہیں ہے، یہ تو اس کا ضمنی فائدہ ہے، آپ اچھی طرح سمجھ لیں کہ قربانی کی حقیقت انفاق مال نہیں ہے بلکہ انفاق جان ہے، اسی سے یہ عبادت ادا ہوگی۔ اگر کوئی شخص قربانی کے ایام میں دس لاکھ روپئے بھی غرباء پر خرچ کر دے تب بھی وہ اس عبادت سے سبکدوش نہیں ہوسکتا۔ اور نہ اس کے مخصوص ثواب کو حاصل کر سکتا ہے۔

رفیق: میں جاننا چاہتا ہوں کہ اس میں انفاق جان ہی کیوں ضروری ہے اور اس کا پس منظر کیا ہے۔

سعید: جناب! یہ قربانی درحقیقت ایک عظیم الشان قربانی کی یادگار اور عظیم المرتبت نبی علیہ السلام کی سنت کے طور پر ادا کی جاتی ہے جس کی تفصیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ایک محبوب پیغمبر کے یہاں بڑی تمناؤں کے بعد ایک بچہ پیدا ہوا۔ وہ ان کا اکلوتا بیٹا تھا حق تعالیٰ نے چاہا کہ یہ بندہ ہماری محبت کا بلا شرکت غیرے مدعی ہے لاؤ ہم اس کا امتحان لیں۔ چناں چہ بطور امتحان اس سے اس بیٹے کو راہ خدا میں قربان کرنے کا مطالبہ کیا نبیؑ نے اس مطالبہ پر لبیک کہا اور بیٹے کو قربانی کے لیے لٹا کر چھری پھیرنی شروع کی، وہ چھری بیٹے پر نہیں چل رہی تھی، بلکہ اس محبت پر چل رہی تھی، جس کے خدا کی محبت میں شریک ہوجانے کا شبہ تھا۔

خدا تعالیٰ نے دنیا کو دکھلا دیا کہ اس نے میری محبت میں کسی غیر کو شریک نہیں کیا ہے وہ میرے لیے اپنی محبوب ترین چیز یعنی اولاد کو بھی قربان کر سکتا ہے۔ حق تعالیٰ نے اپنے نبی کی اس عظیم الشان قربانی کو مینڈھے کی قربانی سے بدلوا دیا، اور ایک جانور کو ایک محبوب ترین چیز کے قائم مقام گردانا کتنی عنایت ہے، حق تعالیٰ کی کہ ایک جانور کو قربان کر کے مسلمان اولاد جیسی عزیز چیز کو راہ خدا میں قربان کرنے کا ثواب حاصل کرتا ہے۔

رفیق: مگر یہ واقعہ تو حضرت ابراہیمؑ کے زمانے کا ہے، پھر یہ قربانی ہماری شریعت میں کیسے واجب ہوگئی۔

سعید: جناب! ملت ابراہیمی کے بہت سے اعمال شریعت اسلام میں بھی مسنون قرار دیئے گئے ہیں بلکہ اسلام درحقیقت ملت ابراہیمی ہی کی تکمیل ہے جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو ’’سنۃ ابیکم ابراھیم‘‘ فرمایا، اور خود بھی ہر سال پابندی کے ساتھ ادا کیا، اس لیے یہ قربانی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بھی سنت ہے۔

رفیق: مگر بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ کیسی عبادت ہے کہ ایک جاندار کی جان ضائع کی جاوے جب اللہ تعالیٰ خوش ہو۔ کیا اس میں ہندوؤں کی طرح دیوی، دیوتاؤں کے نام پر جانور کی بلی چڑھانے اور ان کو خوش کرنے کی مشابہت نہیں ہے۔

سعید: رفیق صاحب! اسلام سے پہلے لوگ مختلف طرز پر عبادت کرتے تھے مگر وہ عبادت

غیر اللہ کے لیے کی جاتی تھی، اسلام کی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے ہر قسم کی عبادات کو غیر اللہ کے لیے ناروا قرار دے کر صرف اللہ کے لیے مخصوص کر دیا، چناں چہ جانور کی قربانی بھی جو بتوں کے لیے کی جاتی تھی، اسلام نے عبادت کی اس قسم کو تو باقی رکھا، مگر اس کو صرف خدا کے لیے خاص کر دیا؛ معلوم ہوا کہ اسلام جامع اقسام عبادات ہے مگر اس نے عبادت کی تمام اقسام کو صرف اللہ کے لیے مخصوص کر دیا ہے، چاہے وہ انفاق مال کی عبادت ہو یا انفاق جان کی۔

رفیق: سعید صاحب! بندوں سے اس قسم کی عبادت کا مطالبہ کرنا کیا اللہ تعالیٰ کی صفت رحمت کے خلاف نہیں ہے۔

سعید: جی نہیں! خلاف رحمت نہیں ہے، جانور کی پیدائش کی غرض ہی انسانوں کی خدمت اور ان کے کام آنا ہے، لہٰذا ان کے ساتھ رحمت ہی ہے کہ ان کو انسانوں کی خدمت کا زیادہ سے زیادہ موقع دیا جائے اس کے علاوہ آقا اور مالک کبھی اپنے بندے کی وفاداری دیکھنے کے لیے اپنی قیمتی چیز کو بھی توڑنے کا امر کرتا ہے، وہاں اگر بندہ مالک کے امر کے مقابلہ میں چیز کی قدر میں لگا تو امتحان میں فیل ہو جاوے گا۔

رفیق: مگر بعض لوگ کہتے ہیں کہ مسلمان کو گوشت کھانے کا شوق ہوتا ہے، تو اللہ تعالیٰ کے حکم کا بہانہ کر کے جانوروں کو ذبح کر کے کھا جاتے ہیں ورنہ اللہ تعالیٰ بھلا اپنی مخلوق کے قتل کو پسند کرے گا! وہ تو رحیم ہے۔

سعید: غلط ہے، یہ رحمت کے خلاف ہی نہیں۔ اس لیے کہ اگر یہ رحمت کے خلاف ہے تو پھر خدا تعالیٰ نے جنگل میں بھیڑیے چیتے اور شیر کیوں پیدا کیے! جن کی خوراک ہی جانوروں کو چیر پھاڑ کر کھانا ہے، اگر اس خونخوار مخلوق کو پیدا کرنا رحمت کے خلاف نہیں، تو پھر انسان کو ان کا کھانا جس کے لیے انہیں پیدا کیا گیا ہے کیوں رحمت کے خلاف ہوگا؟ ہم ان لوگوں سے سوال کرتے ہیں جو گوشت کھانے کو رحمت کے خلاف کہتے ہیں کہ جانور کی ہڈی سے کنگھی بنانا، اس کے چمڑے سے جوتے بنانا، اس کے بالوں سے رسی بنانا، اس کے سینگ سے مختلف چیزیں بنانا کیوں ظلم نہیں؟ کیوں رحمت کے خلاف نہیں؟

رفیق: مگر یہ سب کام تو جانور کے مرجانے کے بعد ہوتے ہیں۔

سعید: جناب! تو گوشت بھی تو مرنے کے بعد ہی کھایا جاتا ہے۔

رفیق: مگر اس کے لیے اسے مارا تو زندگی ہی میں جاتا ہے۔

سعید: تو کیا آپ اس کی زندگی میں اس کا دودھ نہیں دوہتے، اس کو نہیں پیتے؟

رفیق: لیکن دودھ دوہنے سے اس کو تکلیف نہیں ہوتی۔

سعید: تو کیا وہ یہ نہیں چاہتا کہ اس کا سارا دودھ اس کا بچہ پیئے، چلو اس کو چھوڑیئے، آپ اس کی کمر پر سواری کرتے ہیں، اس کو گاڑی اور ہل میں جوتتے ہیں، اور مال لادتے ہیں؛ کیا یہ رحمت کے خلاف نہیں؟ کیا یہ ظلم نہیں؟ بلکہ میں کہتا ہوں کہ یہ تدریجی تکلیف جو آپ اسے برسوں تک دیتے ہیں، لاکھ درجہ بڑھی ہوئی ہے، اس تکلیف سے جو اس کو ذبح کے وقت ایک سیکنڈ کی تکلیف کے بعد ہمیشہ کی راحت کا ذریعہ بن جاتی ہے۔

رفیق: مگر جب کھانے کی دوسری اشیاء اللہ کی پیدا کردہ موجود ہیں تو گوشت ہی کو کھانے کی کیا ضرورت ہے۔

سعید: جناب! انسان گوشت خور حیوان ہے۔ جس کی دلیل اس کے منہ میں انیاب کا ہونا ہے، اس لیے جو جانور گوشت خور نہیں ان کے منہ میں کچلیاں نہیں ہیں، بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ انیاب چار ہیں، تو ہفتہ میں چار مرتبہ گوشت ضرور کھانا چاہئے، اگر انسان گوشت خور نہ ہوتا، تو انیاب کی پیدائش منہ میں عبث ہوتی، اور اللہ کا کوئی کام عبث نہیں ہے۔

رفیق: جناب! اس طرح جانور کھائے جاتے رہے تو جانور گھٹ جائیں گے پھر دودھ گھی ملنا بند ہو جائے گا۔

سعید: غلط ہے، گھٹیں گے نہیں، بلکہ بڑھیں گے، سنت اللہ یہ ہی ہے کہ جس کی جتنی ضرورت ہوتی ہے، اس کی پیداوار اتنی ہی بڑھتی ہے، لوگ اس کی پرورش اور افزائش کو پیشہ بنا لیتے ہیں؛ کیا نباتات اور سبزیاں کھانے سے گھٹتی ہیں، ہرگز نہیں، بلکہ قاعدہ یہ ہے کہ جس کو جتنا کاٹو گے اور تراشو گے اتنا ہی وہ بڑھتا ہے، پیڑ پودے جتنے تراشے جاتے ہیں اتنے ہی بڑھتے ہیں؛ تو سال میں ایک مرتبہ جانوروں کو قربانی کے ذریعہ گھٹا کر ان کے بڑھانے کا سامان کر دیا ہے، چناں چہ جن جانوروں کی قربانی نہیں ہوتی، یا جن کا کھانا حلال نہیں ہے، ان کی افزائش میں کمی ہے، اور ان کے پالنے پر بھی اتنی توجہ نہیں دی جاتی۔

رفیق: ایسا کیوں نہیں ہے کہ جو جانور دودھ وغیرہ کے کام کے نہیں ہیں یا حشرات الارض

ہیں ان سب کو حلال کر دیا جاتا۔

سعید: ایسا نہیں ہے بلکہ کچھ جانوروں کا گوشت صحت کے لیے مضر ہے، بعض جانوروں کی عادتیں اور اخلاق خراب ہیں۔ اس لیے اسلام نے وہی جانور حلال کئے ہیں جن کے کھانے سے انسان میں جسمانی مضرت یا سفلی جذبات پیدا نہ ہوں۔

رفیق: سعید بھائی! معاف کرنا میں چوں کہ غیر مسلم بھائیوں کے محلہ میں رہتا ہوں اور آئے دن ان سے اس موضوع پر بحث ہوتی رہتی ہے اس لیے میں نے آپ سے اس قسم کے سوالات کئے ورنہ میں بہ حیثیت مسلمان تمام مسائل سے واقف ہوں۔ میرے عقائد بھی بفضل خداوندی وہی ہیں جو آپ کے ہیں۔

سعید: آپ اپنے غیر مسلم بھائیوں سے کہئے کہ ایک جانور کے ذبح کرنے پر آپ کی دیا اور اَہنسا کی تعلیم کے سارے دفاتر سامنے آجاتے ہیں مگر اپنے ہم وطنوں کے خون سے ہولی کھیلتے وقت ان کے بچوں کو شہید کرتے وقت ان کی عزت آبرو لوٹتے وقت آپ کی دیا کہاں چلی جاتی ہے۔

کیا انسانی خون بکرے کے خون سے زیادہ سستا ہے؟ کیا ایک مسلمان کی جائداد اور مکان کو آگ لگانا ظلم نہیں؟ کیا وہ رحم کے خلاف نہیں؟ کیا ان کا خدا اس سے خوش ہوتا ہے؟ آپ ان سے پوچھئے کیا آپ کے پُورْوَج جنگل میں جانور کا شکار کر کے نہیں کھاتے تھے؟ کیا آج بھی مندروں کے دیوتاؤں پر بلی کے طور پر جانور نہیں کاٹے جاتے؟ اگر یہ سب ہوتا ہے تو اسلامی قربانی پر کیوں اعتراض ہے؟

رفیق: میں آپ سے پوچھنا چاہوں گا کہ قربانی کرنے سے کیا فائدہ؟ اور اس میں کیا حکمت ہے بظاہر تو حج وغیرہ کے موقع پر گوشت کو سب لوگ کام میں نہیں لا پاتے لاکھوں بکروں کا گوشت ضائع ہوتا ہے، اگر ان کی قیمت دینی کام یا غرباء پر تقسیم ہوتی تو اچھا تھا۔

سعید: آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ دنیا میں جنگ بھی ناگزیر ہے، کبھی کبھی اس کی سخت ضرورت پیش آتی ہے، انسانوں کو اس کے لیے تیار رہنا چاہئے، اگر انسان نے کبھی خون نہ بہایا ہوگا تو وقت پڑنے پر نہ کسی کا قتل کر سکے گا، اور نہ خون دیکھنے کی تاب لا سکے گا۔ سال میں ایک مرتبہ قربانی کو اپنے ہاتھ سے ذبح کرا کے اس کا عادی بنایا کہ کبھی جنگ کی

ضرورت سے قتل اور خون ریزی کی ضرورت پڑے تو اس کا دل مضبوط رہے خون دیکھ کر اس کو ڈر نہ لگے، اس کے ہاتھ ملک دشمن کے قتل میں بے دریغ چلتے رہیں۔

رفیق: سنا ہے کہ قربانی کا جانور قیامت میں پل صراط پر سواری کا کام دیگا تو اگر کسی نے اپنی عمر میں ۳۰، ۴۰ جانور ذبح کئے ہوں گے تو وہ سب سواری کس طرح بنیں گے۔

سعید: ہوسکتا ہے، ان سب کے عوض ایک ہی بڑا جانور سواری کے لیے بنا دیا جائے، یا یہ کہ تھوڑی تھوڑی مسافت کے لیے ہر ایک کو استعمال کا موقع دیا جائے، اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ سواری کا عنوان دے کر اس تعبیر سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے موٹے اور عمدہ جانور کی قربانی کرنے کی رغبت دلائی ہو اس لیے کہ انسان کو جب یہ معلوم ہوگا کہ اس کو اس پر سواری کرنی ہوگی تو موٹا اور عمدہ ہی جانور قربانی کرے گا۔

رفیق: چھوٹے جانور میں ایک اور بڑے جانور میں سات حصے کیوں رکھے گئے۔

سعید: چھوٹے جانور میں ایک عمر ہے یعنی ایک سال لہٰذا ایک شخص کی طرف سے کافی ہے، اور بڑے جانوروں میں دو عمریں ہیں دو سال اور پانچ سال لہٰذا ۵؍ اور ۲؍ دونوں عمروں کو جمع کر کے بڑے جانور میں سات حصے جائز رکھے گئے۔

رفیق: آپ کا بہت بہت شکریہ، مجھے آپ سے مل کر بڑی معلومات حاصل ہوئی، اور بہت سی غلط فہمیاں دور ہوئیں۔ السلام علیکم۔

سعید: وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔

(۱۴) پردہ اور اسلام

عابد: ماجد صاحب! السلام وعلیکم۔

ماجد: وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔

عابد: ماجد صاحب! کل آپ ریلوے اسٹیشن سے کس برقعہ پوش عورت کے ساتھ آرہے تھے

ماجد: جی ہاں! میں اپنی اہلیہ کے ساتھ ایک شادی میں شرکت کے لیے میرٹھ گیا تھا کل واپسی ہوئی آپ کے پوچھنے کا مقصد۔

عابد: وجہ یہ ہے کہ کل جب آپ سڑک سے گزر رہے تھے تو کچھ نوجوان کہہ رہے تھے کہ مسلم عورت آج کے دور میں بھی برقعہ میں بند ہے، ہائے کتنا ظلم ہے اس بے چاری پر برقعہ میں چلتا پھرتا تعزیہ معلوم ہوتی ہے گویا ایک ہیولی ہے جانور بھی اس کو دیکھ کر بدکتے ہیں۔

ماجد: عابد صاحب ان لوگوں کو کہنے دیجئے، مگر آپ لوگوں کے خیالات اس سلسلہ میں کیا ہیں؟۔

عابد: ہم بھی عورت کے لیے پردہ کو ایک قیدِ بامشقت سمجھتے ہیں۔

ماجد: اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ ! عابد صاحب آپ مسلمان ہو کر یہ کیا بہکی بہکی بات کر رہے ہو معلوم ہوتا ہے کہ تم کو بھی مغربی تہذیب نے متاثر کر رکھا ہے۔

عابد: مگر صاحب یہ آپ کا رسمی پردہ اور یہ برقعہ اس کا ثبوت اسلام میں کہاں ہے قرآن مجید نے تو الا ما ظهر منها کہہ کر چہرہ کو پردہ سے مستثنیٰ کر دیا ہے، لیکن مولوی لوگ نہ جانے کہاں سے برقعہ لے آئے اگر ایسی ہی سختی ہے تو مرد کو بھی برقعہ پہننا چاہئے تاکہ کوئی عورت اس کو بھی نہ دیکھ سکے۔

ماجد: جناب! آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ ایک ہے ستر اور ایک ہے پردہ تو اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا سے ستر کو بیان کیا گیا ہے کہ عورت کا چہرہ ستر میں داخل نہیں رہ گیا پردہ تو وہ دوسری

آیت: يدنين عليهن من جلابيبهن سے ثابت ہے اور مرد کو برقعہ اوڑھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اس لیے کہ مرد تو عورت کے بدن کا کوئی بھی حصہ نہیں دیکھ سکتا مگر عورت مرد کے ناف سے گھٹنوں تک کے حصے کو چھوڑ کر باقی بدن دیکھ سکتی ہے اس لیے مرد کو چہرہ چھپا کے چلنے کی ضرورت نہیں ہے۔

عابد: میں سمجھتا ہوں کہ پردہ سماج پر بے اعتمادی اور وہمی ہونے کی دلیل ہے۔

ماجد: کیوں؟

عابد: مثلاً آپ اپنے گھر میں بیٹھے ہوں اور آپ کی بیوی بھی آپ کے پاس بیٹھی ہو کہ اچانک آپ کا دوست آپ کے گھر میں آئے اس کو دیکھتے ہی آپ اپنی بیوی کو اندر چھپ جانے کو کہیں تو آپ کے اس فعل سے آپ کے دوست پر کیا اثر پڑے گا یہی نا کہ آپ اس کو اتنا گیا گذرا سمجھنے لگے کہ اس کے آتے ہی بیوی کو چھپ جانے کے لیے کہنے لگے۔ ظاہر ہے کہ یہ کتنی بڑی بے اعتمادی کی بات ہے کیا ہر آدمی بدنگاہ ہوتا ہے۔ نیز آپ کا یہ فعل اس پر بھی دال ہے کہ آپ کو اپنی بیوی پر بھی اعتماد نہیں ہے۔

ماجد: آپ کے سوچنے کا انداز غلط ہے وہ بیوی کو پردہ کرنے اور چھپ جانے کو بے اعتمادی کی وجہ سے نہیں کہتا بلکہ حیاء کا فطری داعیہ اور قانونِ شریعت کا احترام اس کو ایسا کہنے پر مجبور کرتا ہے اور قانون شریعت کا احترام ایک بڑی چیز ہے اور شریعت نے فطرت ہی کا خیال رکھ کر قانون بنائے ہیں میں آپ سے دریافت کرتا ہوں کہ آپ غسل خانے یا بیت الخلاء میں برہنہ بیٹھے ہوں اور اچانک آپ کا کوئی دوست آجائے تو کیا آپ ویسے ہی بیٹھے رہیں گے یا فوراً کپڑا سنبھال کر کھڑے ہو جائیں گے، آخر آپ نے یہ اسی لیے تو کیا کہ جو چیز دکھانے کی نہیں ہے اس کو آپ دکھانا نہیں چاہتے اس لیے آپ کو شرم آتی ہے یہ ہی حال عورت کا ہے کہ وہ دکھانے کی چیز نہیں چھپانے کی ہے اس میں بے اعتمادی یا وہمی ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

عابد: جناب! پردہ جس مقصد کے لیے کرایا جاتا ہے اگر وہ مقصد اس سے حاصل نہ ہو تو پردہ سے کیا فائدہ ہے بہت سی باپردہ عورتیں پردہ میں گل کھلاتی رہتی ہیں اور ان کی وجہ سے سب ہی باپردہ عورتیں بدنام ہوتی ہیں اس لیے بے پردہ رہنا ہی بہتر ہے۔

ماجد: مگر صاحب اس میں یہ نفع ہے کہ لوگ صرف مرد کو قصوروار گردانتے ہیں کہ باپردہ

عورت کے پیچھے پھرتا ہے عورت کو کوئی کچھ نہیں کہے گا، وہ تو بیچاری پردے میں ہے، اگر وہ بے پردہ ہو تو لوگ کہہ سکتے ہیں کہ یہ بھی خراب ہوگی، تبھی ہی بے پردہ رہتی ہے اور لوگ اس کو دیکھتے ہیں، ہمیں تو شرعی حکم کے مطابق پردہ رکھنا چاہئے، جو عصمت اور عفت کا ذریعہ ہے، اگر بعض کو اپنی طبعی فحش کاری کی وجہ سے عفت وعصمت حاصل نہ ہو، تو یہ عام قانون پر زد نہیں ڈالتا، کیا مریضوں کو علاج سے بوجہ بد پرہیزی کے فائدہ نہ ہو تو کیا سب لوگ علاج کرانا یہ کہہ کر چھوڑ دیں گے کہ فلاں کو نفع نہیں ہوا۔

حامد: ارے صاحب! یہ سب جانے دیجئے آپ لوگ تو ہر بات پر ''اناللہ'' اور ''استغفر اللہ'' پڑھنے لگتے ہیں، سچ پوچھو تو ملاؤں نے عورت کو پردہ کرا کر کہیں کا بھی نہیں رہنے دیا، پردہ کے جال میں پھنس کر عورت ورگ اعلیٰ تعلیم سے محروم ہو گیا۔ دنیا کی عورتیں الیکشن لڑ رہی ہیں، ہسپتالوں میں نرس ہیں، ریڈیو پر اناؤنسر ہیں، ہوائی جہاز میں ائیر ہوسٹیز ہیں، دفاتر میں کلرک، اسکولوں میں ٹیچر، حتیٰ کہ ملٹری تک میں داخل ہیں، مگر مسلمانوں نے مذہب کو آڑ بنا کر عورت کو اپنی صلاحیت سے کام لینے اور چار پیسے کمانے تک سے روک دیا اس کو مکمل طور پر مرد کا غلام بنا کر رکھا ہے۔

ماجد: غلط ہے، اسلام نے عورت کو تعلیم سے قطعاً نہیں روکا البتہ مخلوط تعلیم سے ضرور روکا ہے، جس کے مفاسد کسی سے مخفی نہیں، بلکہ معاملہ الٹا ہے، خود عورت مرد کو اعلیٰ تعلیم سے محروم کر رہی ہے، کتنے مرد کالجوں میں لڑکیوں کے چکر میں پڑ کر اعلیٰ تعلیم سے محروم رہ جاتے ہیں۔ اسلام عورت کی تعلیم کا منکر نہیں اگر کسی ملک میں اعلیٰ تعلیم غیر مخلوط اور باپردہ ہونے لگے تو اسلام اس سے منع نہیں کرتا مگر ایسا ہوتا کہاں ہے دوسری جن خدمات کا آپ نے تذکرہ کیا، تو عورت اگر عورت کی خدمت کرے چاہے نرس بن کر، چاہے ٹیچر بن کر، چاہے کلرک بن کر، تو کوئی حرج نہیں ہے؛ ہاں! عورت اگر اجنبی مرد کی خدمت کرنے لگے تو اس سے ضرور روکا گیا ہے پہلے تو یہ خدمت ہی نہیں ہے نوکری ہے اور نوکری کی ذمہ داری اسلام میں مرد پر ہے عورت پر نہیں اس کی فطری ساخت قطعاً ان کاموں کی متحمل نہیں ہے کمانے کی ذمہ داری اس پر ڈالنا ظلم ہے اس کا نان ونفقہ تک تو اس کے شوہر پر لازم ہے وہ تو صرف امور خانہ داری کے لیے ہے اس کو تو وزارت داخلہ کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ کتنا پیارا ہے اسلام۔ کتنے پیارے ہیں اس کے قانون کتنی عزت

کی ہے اس نے طبقۂ نسواں کی آج بہت سی یورپین عورتیں مسلمانوں سے شادی کرنا پسند کرنے لگی ہیں اور وجہ یہ بتلاتی ہیں کہ یہ لوگ کمانے کی ذمہ داری عورت پر نہیں ڈالتے۔ اور مغرب میں تو دو عظیم جنگوں کی وجہ سے مردوں کی تعداد کم ہو گئی تھی اس لیے انہوں عورتوں کو بے پردہ کر کے ملازمتوں میں لینا شروع کیا، ہمارے یہاں مردوں کی قلت نہیں ہے، بلکہ ہمارے ملک میں تو عورتوں نے میدان میں آ کر بہت سے مردوں کو روزگا کے موقع سے محروم کر دیا، ہزاروں ملازمتوں پر عورتیں قابض ہو گئی اور مرد بے روزگار ہو گئے۔ دوسری بات یہ ہے جب عورتیں بے پردہ ہو کر خود کمانے لگے گی تو وہ شوہر سے مستغنی ہو جائے گی، اس کی عطاعت چھوڑ دے گی اس سے عائلی زندگی میں تلخی پیدا ہو گی بخلاف پردہ نشین عورت کے کہ اس کا پورا دارومدار شوہر کی آمدنی پر ہوتا ہے تو وہ شوہر کی خوشنودی کی ہمیشہ جویا رہتی ہے کہ وزیر خارجہ خفا نہ ہو جائیں۔ اس سے دونوں میں ربط رہتا ہے، جو مطلوب ہے۔

حامد: میں کہتا ہوں کہ پردہ نے عورت کے طبقہ کی صحت وتندرستی چوپٹ کر رکھی ہے، تمام شفا خانے پردہ نشین عورتوں سے بھرے پڑے ہیں اور یہ بات نیچرلی ہے جب کسی کو صاف ہوا اور باہر آزادی کے ساتھ ٹہلنے پھرنے کے مواقع نہیں ملیں گے، تو صحت برباد ہی ہو گی۔

ماجد: غلط ہے، پردے نے صحت خراب نہیں کی، بلکہ آرام طلبی تن آسانی سے صحت پر خراب اثر پڑتا ہے، پہلے کی عورت چرخہ کاتتی تھی دھان کوٹتی تھی پانی بھرتی تھی، کپڑے دھوتی تھی، چکی پیستی تھی، جھاڑو دیتی، برتن دھوتی، چارپائی بنتی تھی۔ جانوروں کا دودھ دوھتی تھی۔ بچوں کو دودھ پلاتی تھی۔ اب یہ سارے کام عورتوں نے چھوڑ دیئے، بعض کام مشینوں سے ہونے لگے جس کے نتیجہ میں جو ورزش ان کاموں کے ذریعے ہو جاتی تھی وہ چھوٹ گئی تو قوئ ڈھیلے ہو گئے آج بے پردہ عورتیں بھی کام نہ کرنے کی وجہ سے اتنی ہی کمزور ہیں، جتنی باپردہ عورتیں اب تو عورتوں کی تن آسانی کا یہ عالم ہے کہ اپنا سنگار بھی دوسروں سے کراتی ہیں اور بچوں کو دودھ بھی ڈبہ کا پلاتی ہیں اسی کو اکبر الہ آبادی نے کہا۔

اولاد میں بو آئے کیا ماں باپ کے اطوار کی
دودھ تو ڈبہ کا ہے اور تعلیم ہے سرکار کی

عابد: مولانا صاحب! ایک نظر عورت پر ڈالنا مرد کی فطری کمزری ہے وہ اس سے بچ نہیں سکتا۔

ماجد: معاف کیجئے! نظر ڈالنا نہیں نظر پڑ جانا کہئے، شریعت نے اسی فطرت کا خیال کر کے ایک نظر معاف کو رکھا ہے جو اچانک پڑ گئی ہو اور بالا جمال ہو نہ کہ بالتفصیل۔

عابد: جناب! ''اَلْاِنْسَانُ حَرِیْصٌ فِیْمَا مُنِعَ'' جس چیز کو آپ جتنا چھپائیں گے انسان کی فطرت یہ ہے کہ وہ اس کو اتنا زیادہ دیکھنے کا خواہش مند ہوتا ہے۔ تو کیوں نہ عورتوں کو بے پردہ رکھا جائے کہ دیکھتے دیکھتے سیری کے بعد داعیہ ہی سرد پڑ جائے اور کوئی ہوس نہ رہے۔

ماجد: اگر یہی بات ہے تو آپ اپنی تجوری کے ہیرے موتی، زر و جواہر، روپے و پیسے سڑک پر چوراہے پر ڈال دیجئے تاکہ دیکھتے دیکھتے لوگوں کی حرص ختم ہو جائے اور اس سے آسودہ ہو جائیں اور آپ حفاظت کی ذمہ داری سے سبک دوش ہو جائیں۔ آپ کو کیا پتا سارے فتنے تو نگاہ ہی کے ہیں اور آپ اس کو بے لگام کرنے کی سفارش کر رہے ہیں۔ اور نیز اپنے نفس پر کس کو اطمینان ہے، نفس کا شر تو مشہور ہے، کیا زنا نام اصل فعل ہی کا ہے آنکھ بھی تو زنا کرتی ہے پھر یہ شعلے تو دونوں طرف ہوتے ہیں۔ آپ اگر گوشت لے کر کسی جگہ سے گزر رہے ہوں، اس کو چیل کوے سے بچانے کے لیے ڈھانک لیتے ہیں، حالاں کہ گوشت کی بوٹی خود سے اُڑ کر چیل کے پاس جانے کی صلاحیت اور میلان نہیں رکھتی صرف چیل میلان اور حملہ کی صلاحیت رکھتی ہے۔ اسی طرح روٹی کو جو آپ چوہے سے بچاتے ہیں، حالاں کہ روٹی چوہے کے پاس چل کر جانے کی صلاحیت نہیں رکھتی صرف چوہا روٹی کو لے جانے کی صلاحیت رکھتا ہے، جب ایک سے کسی چیز کے دوسری چیز کی طرف میلان کا داعیہ ہو اور دوسری طرف سے قطعاً داعیہ نہ ہو تب بھی اس چیز کو بچا کر رکھا جاتا ہے، تو عورت میں تو خود مرد کی طرف مائل ہونے کا داعیہ رکھا ہوا ہے تو اس کو بدرجہ اولیٰ بچا کر رکھا جائے گا، نہ معلوم دوسرے کی کونسی ادا قاتلانہ ثابت ہو اور اُدھر میلان کے ساتھ ادھر سے بھی لفٹ مل جائے۔

عابد: مولانا صاحب! پردہ اور برقعہ کا ایک نقصان یہ ہے کہ برقعہ میں جوان اور بوڑھی عورت کا امتیاز تو ہوتا نہیں، لہٰذا جوان عورت کے ساتھ لوگ بوڑھی عورتوں کو بھی گھورتے

ہیں، چنانچہ ایک مرتبہ ایک بڑھیا جلدی جلدی میں اپنی نئی بہو کا برقعہ اوڑھ کر ہسپتال چل دی راستے میں نیا برقعہ دیکھ کر ایک نوجوان سمجھا کہ برقعہ نیا ہے تو اندر عورت بھی نوجوان ہوگی، ساتھ ہولیا، گرمی شدید تھی، لڑکا پسینہ پسینہ ہو رہا تھا، بڑھیا کو ترس آیا اس نے نقاب اٹھا کر کہا کہ بیٹا گھر جاؤ، برقعہ سے دھوکہ لگا ہوگا۔

ماجد: میرے بھائیو! باپردہ عورت سے لوگ خود شرماتے ہیں جبکہ بے پردہ عورت سے لوگوں کو بات کرنے میں کوئی باک نہیں ہوتا۔ پردہ عورت کا زیور ہے، پردہ مرد کی غیرت کا تقاضا ہے، ایک غیور آدمی کبھی اس کو پسند نہیں کرے گا کہ اس کی ماں بہن اور بیوی کو کوئی اجنبی آدمی دیکھے یا بات کرے۔ میرے بھائیو! دنیا میں دو ہی چیزیں ہیں: بھلائی اور برائی۔ اس سے کسی کو انکار کی گنجائش نہیں ہے۔ اب اگر عورت بے پردہ ہو کر اجنبی مردوں سے ملے جلے اس کو برائی نہیں کہیں گے تو کس کو کہیں گے؛ آخر آپ برائی کی تعریف یہ ہی تو کرتے ہیں جس سے معاشرے میں بگاڑ پیدا ہو تو اس سے زیادہ بگاڑ کس چیز سے آئے گا کہ عورت مرد سے بے باکانہ اختلاط رکھے، جب بے پردہ عورت باہر نکلتی ہے تو شیطان اس کے پیچھے پڑ جاتا ہے، بے پردگی اور آزادی ہی نے نسب اور رشتے کو ختم کر دیا ہے، نہ کوئی کسی کا بیٹا رہا، نہ کوئی کسی کا باپ۔ اب جانوروں اور انسانوں میں کیا فرق رہے گا؟ فرق کا ذریعہ تو انساب ہوتے ہیں، جب نسب ختم ہو جائے گا تو انسان حیوان کی صف میں جا کھڑا ہوگا؛ اس لیے پردہ کے نظام کی قدر کرنی چاہئے اور اس پر فخر کرنا چاہئے، اس کو اپنی عزت کا ذریعہ سمجھنا چاہئے، اس کو اپنا امتیاز سمجھنا چاہئے۔

عابد: مولانا صاحب! ہم کو آپ سے تبادلہ خیالات کر کے خوشی ہوئی ہم کو آپ کی باتوں سے نفع ہوا بلاشبہ ہم مسلمان ہو کر اسلامی ہدایات کی خوبیوں سے ناواقف تھے، اللہ ہم کو نیک ہدایت دے۔ آپ کا بہت بہت شکریہ۔

ماجد: شکریہ! تو آپ حضرات کا ہے کہ آپ نے ہماری باتوں کو توجہ سے سنا۔ اللہ ہم سب کو اسلامی قانون کے تسلیم کرنے کا جذبہ عطا کرے اور پردہ جیسے حکم پر اپنی مستورات کو چلانے کی توفیق بخشے۔ السلام علیکم۔

(۱۵) تصویر اور اسلام

وکیل: مولانا صاحب! السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔

مولانا: وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔ آیئے آیئے وکیل صاحب! بہت دن میں ملاقات ہوئی، مزاج تو اچھا ہے۔

وکیل: اللہ کا شکر ہے، مولانا صاحب! میں آج آپ سے ملاقات کے لیے نکلا تھا آپ خود مل گئے، مجھے آپ سے کچھ گفتگو کرنا ہے، ویسے مولانا صاحب میں مولانا لوگوں سے بہت کم ملتا ہوں اس لیے کہ یہ لوگ ہر بات میں روک ٹوک شروع کر دیتے ہیں، حالاں کہ یہ نہیں جانتے کہ دوسرے بھی کچھ نہ کچھ سمجھتے ہیں یا پڑھتے ہیں۔ آپ چوں کہ سنجیدہ ہیں اور بات کو ماڈرن انداز سے سمجھانے اور سمجھنے کے عادی ہیں، اس لیے آپ سے کچھ شبہات کا ازالہ کرنے کو طبیعت چاہتی ہے۔

مولانا: وکیل صاحب! یہ تو آپ کا حسن ظن ہے ورنہ میں تو معمولی ذہن کا آدمی ہوں۔

وکیل: مولانا! بات یہ ہے کہ مجھ کو تصویر کے مسئلہ میں شرح صدر نہیں ہے، آپ جانتے ہیں کہ میں تو ایک وکیل آدمی ہوں، ہر بات کو انتہائی بحث و تحقیق کے بعد قبول کرنے کا عادی ہوں، میں نے تصویر کے مسئلہ پر قرآن و حدیث کی روشنی میں مطالعہ کیا لیکن معاملہ کچھ ایسا نظر آتا ہے کہ قرآن وحدیث جتنی بات کہتے ہیں، اس میں بے حد گنجائش موجود ہے، مگر علماء نے خواہ مخواہ اس میں اتنی تنگی اور شدت پیدا کر دی جس کو نہ قرآن کہتا ہے اور نہ حدیث، نہ تمدن، نہ روزمرہ کی ترقی اُس کو قبول کرتی ہے، بلکہ محض اس بنا پر کہ پچھلے غیر متمدن دور میں کیوں کہ علماء اس کو حرام کہہ چکے ہیں، بس اس کی پچ میں لگے ہوئے ہیں، نہ وہ انسانی ضرورت کا خیال کرتے ہیں اور نہ یہ دیکھتے ہیں کہ اب وہ علت بھی باقی نہیں رہی جس کی وجہ سے اُس دور میں مسلم معاشرے کو اس سے روکا گیا تھا، پھر قرآن میں خود اس معاملہ میں لچک موجود ہے؛ آخر پھر کیوں علماء عوام کو مشکلات میں ڈالنے پر تلے ہوئے ہیں، ان کی زندگی تو محدود ہو چکی ہے، مگر یہ دوسروں کو بھی انسانی

کمالات دیکھنے اور دکھانے اور اس سے فائدہ اٹھانے کو گوارہ نہیں کرتے، میں یہ باتیں ویسے ہی نہیں کہتا، میں آپ کے سامنے وہ شواہد لاتا ہوں جس سے آپ کو ماننا پڑے گا کہ تصویر کشی و تصویر سازی کے معاملہ میں ناجائز کا فتویٰ دینا علماء کی بڑی بھول اور قرآن و حدیث سے عدم واقفیت کی دلیل ہے، دیکھئے: (۱) قرآن مجید ہی میں سلیمانؑ کے لیے جنات کا تصویر بنانے کا ثبوت ہے، چناں چہ قرآن میں ہے: یَعْمَلُوْنَ لَهٗ مَایَشَاءُ مِنْ مَّحَارِيْبَ وَ تَمَاثِيْلَ۔ بعض مفسرین نے یہ بھی لکھا ہے کہ سلیمانؑ نے انبیاء اور ملائکہ کی تصاویر بنوائی تھیں، جب ایک نبی نے یہ کام کیا اور اللہ نے اپنی کتاب میں ان کے اس فعل کو نقل کیا اور اس پر ناپسندیدگی کا اظہار نہیں فرمایا، تو یہ حلال ہونا چاہئے۔ ایک حدیث میں ہے کہ حضرت عائشہؓ نے ایک تکیہ خریدا جس میں تصویریں بنی ہوئی تھیں۔ ایک حدیث میں ہے کہ حضرت عائشہؓ نے اپنے گھر کے دروازے پر ایک پردہ ڈالا تھا، جس میں تصویریں تھیں، ایک اور حدیث میں ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے ایک پردہ لگایا جس پر پَر دار گھوڑوں کی تصاویر تھیں۔ ان باتوں سے پتہ چلتا ہے کہ باتصویر کپڑوں کا استعمال دور صحابہ میں ہوتا تھا۔ اسی طرح حضرت ابوطلحہ انصاریؓ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ جس کپڑے پر تصویر ہو اس کا پردہ کے طور پر استعمال جائز ہے۔ (بخاری)۔۔۔ نیز حضرت عائشہؓ نے ایک مرتبہ تصویر دار کپڑے کو پھاڑ کر گدا بنا لیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو بچھانے سے منع نہیں فرمایا۔ (مسلم)۔۔۔ اسی طرح عبداللہ بن سالم کی یہ روایت کہ ممانعت صرف اس تصویر کی ہے جو نمایاں مقام پر نصب ہو، پھر لڑکیوں کو گڑیا کھیلنے کی (جو درحقیقت تصویریں ہی ہوتی ہیں) علماء اجازت دیتے ہیں، خود حضرت عائشہؓ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم گڑیا کھیلتے دیکھتے اور منع نہیں فرماتے تھے۔ اسی طرح مسلمانوں نے جس کسریٰ کے قصر اَبیض پر قبضہ کیا، تو اس میں جو تصاویر بنی ہوئی تھیں، ان کو نہیں ہٹایا، پھر یہ کہ اسلام نے شرک اور بت پرستی کے خوف سے تصویر کشی سے روکا تھا، لیکن اب اس کا کوئی خطرہ نہیں ہے آج کی دنیا میں کوئی چیز تصویر سے خالی نہیں ہے، ایک تاجر اپنی تجارت کو فروغ نہیں دے سکتا، جب تک کہ وہ اپنی مصنوعات پر تصویر نہ چھاپے، اسی طرح اخباری دنیا کی ساری چہل پہل اسی کی بدولت ہے اور لوگ اپنے ملک کے بڑے بڑے رہنماؤں کی زیارت گھر بیٹھے اخباری تصاویر

سے کر لیتے ہیں، ایک اسٹوڈنٹ کو بڑی بڑی ڈگریوں کے لیے سرٹیفکٹوں میں التباس
سے بچنے کے لیے تصویر لگانا ضروری ہے۔ اسی طرح غیر ملکی اسفار کے لیے پاسپورٹ پر
تصویر ضروری ہے، پھر اس کے ذریعہ اپنے اسلاف کو بچے دیکھ سکتے ہیں، آج کے دور
میں تو ہمارے سکّے بھی اس سے خالی نہیں، پھر یہ کہ جب ہم مجسم آدمی کو دیکھ سکتے ہیں تو
اس کی تصویر کو کیوں نہیں دیکھ سکتے۔ اسی طرح قبر میں سوال کے وقت منکر نکیرؑ کی شبیہ
دکھلا کر آپ صلی علیہ وسلم کے بارے میں سوال کریں گے، یہ ساری چیزیں اس پر دال
ہیں کہ تصویر کشی و تصویر سازی جائز ہو۔

مولانا: وکیل صاحب! میں نے آپ کی گفتگو سنی، مجھ کو خوشی ہے کہ آپ جیسے مصروف
لوگ بھی قرآن و حدیث کا مطالعہ کرتے ہیں، جیسا کہ آپ کی معلومات سے ظاہر ہے۔
میں آپ کی بات کو سمجھ گیا ہوں مجھے امید ہے کہ اگر آپ میرا جواب غور سے سنیں گے تو
آپ کو انشاء اللہ تشفی ہو جائے گی۔

سب سے پہلی بات تو یہ ہے جس کو ساری دنیا تسلیم کرتی ہے کہ جب تک کسی فن میں آدمی
کو پوری مہارت اور عبور نہ ہو اس وقت تک انسان کو اس میں رائے زنی یا دخل اندازی
کرنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا، یہ بعینہ ایسا ہے جیسا کہ ایک آدمی انجنیر نہ ہو، ریل کے
انجن کے پاس کھڑا ہو کر اس کی مشینری میں خامی نکالتے ہوئے کہے اس میں بعض
پرزے ایسے ٹیڑھے کیوں لگے ہیں، اگر یہ نہ ہوتے تو انجن کتنا خوبصورت لگتا،
لیکن ماہر انجنیئر یہ کہے گا کہ جب تم کو یہ واقفیت نہیں کہ کون سا پرزہ کس کام آتا ہے اور
کس پرزے کے نہ ہونے سے مشین کا اصل منشاء فوت ہو جاتا ہے، تم کو رائے دینے کا
کوئی حق نہیں ہے۔ معاف فرمایئے آپ کی پوزیشن تصویر بنانے کے مسئلے میں اسی شخص
کی طرح معلوم ہوتی ہے جو بلا مہارت انجن کی مشین پر اعتراض کر رہا ہو۔

وکیل صاحب! آپ نے ماہرین شریعت کے اتنے بڑے جم غفیر کے خلاف کتنا بڑا دعوی
کر دیا کہ معاذ اللہ انہوں نے باوجود قرآن و حدیث میں نہ ہونے کے محض اپنی طرف
سے ایک چیز کو حرام کر دیا، بھلا اس جماعت کے متعلق جس میں اہل اللہ سے لے کر صحابہؓ
تک داخل ہیں، ان کے متعلق یہ دعوی کیسے کیا جا سکتا ہے، یقیناً اس کی شریعت میں
ممانعت ہوگی، ورنہ اتنی بڑی جماعت ہر دور میں اس کا دعوی نہیں کر سکتی تھی۔ دوسری

بات یہ ہے کہ جب کوئی بات قرآن و حدیث یا شریعت کے دوسرے دلائل سے کامل
طریقہ پر ثابت ہو جائے تو محض اس بنا پر کہ اس میں ہمارا کوئی دنیاوی نقصان نظر آتا
ہے۔ اس کو نہیں چھوڑا جا سکتا، ہاں یہ بات الگ ہے کہ ہم کو شریعت مخصوص حالات میں
کچھ رعایتیں بھی دیتی ہے۔ اس سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے، دنیا کا کوئی قانون ایسا نہیں
ہے جس میں کچھ مستثنیات نہ ہوں۔

درحقیقت شریعت اور تصویر سازی میں جوڑ ہی نہیں ہے، جو شریعت لوگوں کو دنیا میں ان
اجسام کی قید و بند سے ہٹاتی ہو اور معنوی اور باطنی حقائق کا دلدادہ بنانے آئی ہو، وہ بھلا
یہ بات کیسے گوارہ کر سکتی ہے کہ انسان اجسام کی ظاہری صورتوں اور تصویروں میں
پھنسا رہے۔

جہاں تک قرآن کا تعلق ہے، اس میں بیشتر وہ آیات موجود ہیں جن میں بتوں کی مذمت
کی گئی ہے جو درحقیقت شخصیات ہی کی طرف منسوب تصاویر ہوتے تھے۔ سلیمان علیہ
اسلام سے متعلق جو تماثیل کا لفظ آیا ہے، وہاں غیر ذی روح کی تصاویر مراد ہیں؛ جو جائز
ہیں اگرچہ تماثیل کا لفظ دونوں قسم کی تصاویر کو شامل ہے؛ مگر جو معنی مزاج شریعت سے
جوڑ کھاتے ہوں گے وہی معنی مراد لیے جائیں گے، یا یہ ہو سکتا ہے کہ یہ ان کی شریعت
میں جائز ہوگا، رہ گیا نبی کی شبیہ کا مسئلہ تو وہ دوسرے عالم کا معاملہ ہے، ہر حکومت کے
قانون الگ ہوتے ہیں، جہاں تک احادیث کا تعلق ہے، معاف فرمائیں آپ نے ان
کے پورے اجزاء ملاحظہ نہیں فرمائے اپنی پیش کردہ احادیث کو پورا پڑھ جایئے ان میں
نبی کا شدت سے اس پر تنبیہ فرمانا مذکور ہے۔ نیز وعیدیں بھی مذکور ہیں، احادیث میں
تصویر بنانے والوں کو سب سے پہلے دوزخ میں جانے کی وعید سنائی گئی ہیں۔ اسی طرح
آپ کا یہ کہنا ہے کہ شرک اور بت پرستی کو مٹانے کی غرض سے اس سے منع کیا گیا تھا۔ اور
اب وہ علت مفقود ہے، پہلے تو یہ دعوی ہی غلط ہے۔ اب بھی شرک و بت پرستی موجود
ہے، پھر یہ کہ یہ اس کی مختلف سببوں میں سے ایک ہے، دوسری وجہ مثلاً خالق ہونے میں
شرکت لازم آتی ہے اور ملائکہ رحمت کے داخلے سے محرومی ہوتی ہے، یہ بھی تو وجہ ممانعت
ہو سکتی ہے، اب رہ گئی یہ بات کہ تمدنی بعض ضروریات میں اس کی اس دور میں احتیاج تو
بلاشبہ علماء نے اس میں مطلق تنگی نہیں کی، پاسپورٹ اور سرٹیفکٹ کے لیے تصویر کی

اجازت اور دوسری ایسی اہم ضروریات جو بلا اس کے پوری نہ ہوسکتی ہوں ان کی صاف اجازتیں موجود ہیں، لیکن آپ یہ چاہیں کہ محض آنکھوں کی تفریح اور دلچسپی اور شوق کے لیے اسلام آپ کو تصویر اور فوٹو کی اجازت دے تو یہ شریعت کے مزاج کے منافی ہے،
ایک اصولی بات یہ ہے کہ ہم کو ہمیشہ کسی بھی بات کو کرنے سے پہلے سوچ لینا چاہئے کہ ہم مسلمان ہیں، ہم نے کچھ پابندیاں قبول کی ہیں، ہم کلیۃً آزاد نہیں ہیں، ہماری زندگی ایک ضابطے کے تحت ہے، ہم محض دنیا کے نفع کے لیے ان حدود کو نہیں توڑ سکتے۔

اسلام نے جب مسلمانوں کو تصویر سازی سے روک دیا تو انہوں نے نقش ونگار، بیل بوٹے، پچی کاری اور عمارت سازی کی طرف اپنی توجہ منعطف کردی، جس کے نتیجے میں انہوں نے وہ کمالات دکھلائے کہ دنیا ان کے مسجد و مینار کے فن کو دیکھ کر دنگ رہ گئی، پھر یہ کہ اللہ کی بعض مخصوص صفات ایسی ہیں جن میں مشابہت پیدا کرنے پر سخت وعیدیں ہیں جیسا کہ فرمایا گیا "اَلْکِبْرُ رِدَائِیْ ... الخ"۔ کبر میری چادر ہے، جو کبر اختیار کرتا ہے وہ گویا میری چادر کھینچنا چاہتا ہے، تصویر سازی میں صفت خالقیت سے مشابہت پیدا ہوتی ہے، اس لیے اس سے منع کیا گیا، چناں چہ حدیث میں ہے کہ قیامت میں مصورین سے ان تصاویر میں جان ڈالنے کو کہا جائے گا جس سے وہ عاجز رہیں گے اور نادم ہوں گے۔

اس کے علاوہ اچھی اور خوشنما تصویر انسان کو اپنی طرف کھینچتی ہے اور اگر صنف نازک کی تصویر ہے تب تو کہنا ہی کیا ہے، انسان تصویر میں عکسی نقش ونگار کے خیال میں اتنا مست ہوجاتا ہے کہ اس کے نزدیک ساری خوبی خدّ وخال کی خوبی رہ جاتی ہے، حالاں کہ قابل تعریف اور خوبی کی چیز صورت نہیں سیرت ہے۔ اعلیٰ اخلاق کے آدمی کو چاہے دیکھا بھی نہ ہو تب بھی اس کا نام سن کر محبت ہوتی ہے، چناں چہ آج ہمارے پاس انبیاء اور صحابہؓ کی صورتیں نہیں ہیں صرف ان کی سیرت ہے، جس کو سن کر ہر شخص سر دھن رہا ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس گھر میں تصویر اور کتا ہو اس میں رحمت کے فرشتے داخل نہیں ہوتے جن صحابیاتؓ نے باتصویر پردے لٹکائے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے گھر میں اس وقت تک داخل نہیں ہوئے، جب تک ان کو نہ ہٹا دیا گیا، ایک نہیں سیکڑوں احادیث اس سلسلہ میں کتب احادیث میں موجود ہیں، اِلّا یہ کہ کسی مخصوص

صورت میں کسی مخصوص طرز کی تصویر کو قابل اعتنا نہ سمجھا گیا ہو اس سے قاعدۂ کلیہ پر کوئی زد نہیں پڑتی۔

بھلا اتنے قوی دلائل کے ہوتے ہوئے علماء پر یہ الزام لگانا کہ یہ اپنی طرف سے منع کرتے ہیں، صریح ظلم نہیں تو اور کیا ہے۔

وکیل: مولانا صاحب! آج آپ نے میری توجہ ایسی بنیادی باتوں کی طرف موڑ دی کہ اب مجھ کو بہت سے وہ احکام شرعی سمجھنے میں سہولت پیدا ہوگئی جن میں میں اپنے ناقص مطالعہ کی وجہ سے بھٹک سکتا تھا، بلاشبہ ہم کو دین کی باتوں میں ماہرین کی بات پر اعتماد کرنا چاہئے، اور دین کے ثابت شدہ احکام کے مقابلہ میں دنیوی اغراض کو آڑ بنا کر من مانی کرنے سے رُک جانا چاہئے۔ اچھا آپ کا بہت بہت شکریہ۔ السلام علیکم۔

مولانا صاحب: وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

(۱۶) سود اور اسلام

فیروز : مولانا صاحب! السلام علیکم، کہیے مولانا صاحب مزاج تو اچھے ہیں!

مولانا: وعلیکم السلام۔ الحمد للہ بخیر ہوں، کہئے کیسے آنا ہوا خیر تو ہے؟

فیروز : مولانا صاحب میں آج آپ سے سود کے بارے میں کچھ معلوم کرنے حاضر ہوا ہوں۔ آپ جانتے ہیں کہ میں پانچ سال سے بینک میں ملازم ہوں۔ وہاں کے ملازمین مجھ کو مسلمان ہونے کے ناطے بار بار ستاتے ہیں کہ آج کی دنیا میں جب کہ زمانہ کہاں پہنچ گیا، لیکن آپ کا اسلام سود جیسے ترقی پذیر کاروبار سے روکتا ہے۔ ان کے رات دن کے اعتراضات کا جواب دینا بھی مشکل ہے۔ بلکہ مولانا صاحب کبھی کبھی تو ان کی باتیں اتنی عقلی ہوتی ہیں کہ اپنا ایمان بھی ڈانوا ڈول ہونے لگتا ہے، آج کی فرصت میں میں آپ سے اس سلسلہ میں کچھ ایسے سوالات کرنا چاہتا ہوں جن سے مجھ کو رات دن دوچار ہونا پڑتا ہے۔

فیروز : مولانا صاحب! نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جب لوگوں کو سود خوری سے منع فرمایا اس زمانہ میں لوگ کن کن طریقوں سے سود کھاتے تھے، اور ان سے کیا کیا نقصانات تھے، جن کی وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کاروبار سے منع کیا تھا۔

مولانا: فیروز صاحب! زمانۂ جاہلیت میں لوگ کئی طریقوں سے سود کھاتے تھے، جن کو عرب اپنی اصطلاح میں ربوٰ کہتے تھے، مثلاً ایک شخص دوسرے شخص کو کوئی چیز بیچتا، اور ادائے قیمت کے لیے ایک وقت مقرر کر دیتا اگر اس مدت تک وہ قیمت نہ دیتا تو مزید مہلت دے کر قیمت میں اضافہ کر دیا جاتا تھا۔ اسی طرح کبھی کوئی شخص کسی سے قرضہ لیتا اور کہتا کہ اگر تو مجھ کو اتنی مہلت دے تو میں اتنی رقم زیادہ دوں گا۔

کبھی یہ بھی ہوتا تھا کہ قرضہ کے وقت یہ بات طے ہو جاتی تھی کہ اتنی مدت میں اتنی رقم رأس المال پر زیادہ ادا کرنی ہوگی۔

ایک صورت یہ بھی تھی کہ ایک شخص کو رقم قرض پر دی جاتی اور اس سے ماہ بماہ مقررہ رقم

بطور سود کے لی جاتی تھی، جب مدت ختم ہو جاتی تو مدیون سے رأس المال کا مطالبہ کیا جاتا۔

ظاہر ہے کہ ان تمام صورتوں میں ایک غریب کو اس کی ضروریات کے لیے بلا سود کے رقم نہ دینا، مروت اخلاق اور انسانیت سے گری ہوئی بات تھی، جس کو اسلام جیسا مذہب کیسے برداشت کر سکتا تھا

فیروز : مولانا صاحب! اس سے تو پتہ چلا کہ یہ اس زمانے میں ایک سماجک برائی تھی، جس کی وجہ سے ایک مالدار غریب کو اہم ضرورت کے وقت بھی قرض بلا نفع کے نہیں دیتا تھا، لیکن آج تو امیر غریب کا سوال نہیں۔ مالدار، مالدار کو کاروبار کے فروغ کے لیے سود پر رقم دیتا ہے، اس میں کیا حرج ہے؟

مولانا : فیروز صاحب! اسلام نے ہر قسم کی سود کو حرام گردانا ہے، چاہے امیر غریب سے لے چاہے امیر، امیر سے لے، آپ پوچھتے ہیں امیر، امیر کو سود پر قرض دے تو اس میں کیا حرج ہے، میں کہتا ہوں یہ دنیا کی سب سے بڑی وہ لعنت ہے جس کی وجہ سے دولت صرف چند سرمایہ داروں کے ہاتھ میں گھوم رہی ہے، بڑے بڑے سرمایہ دار ہمیشہ زیادہ شرح سود پر امیروں کو قرض دینے کی فکر میں رہتے ہیں، اس طرح سیکڑوں وہ مفید کام جن میں غریب کو ضمانت پر قرضہ دے کر روزگار میں لگایا جا سکتا تھا، معطل رہ جاتے ہیں۔

فیروز: کیا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں تجارتی کاروبار کے لیے سود لینے کا رواج تھا، جس سے حضور صلی اللہ علیہ نے منع فرمایا تھا یا صرف شخصی حاجات میں سود کے لین دین کو ممنوع سمجھا گیا تھا۔

مولانا : آپ کے اس سوال کی بنیاد یہ ہے کہ آپ نے سود کی حرمت کی علت صرف ظلم سمجھ لی ہے، حالاں کہ بات یہ نہیں ہے، اسلام نے سود کو ان تمام برائیوں کی وجہ سے حرام قرار دیا ہے جو اس کے رواج پا جانے کی وجہ سے سوسائٹی میں پیدا ہوتی ہیں، چناں چہ جہاں شخصی حاجات میں سودی قرض دینے سے نقصان ہے وہاں تجارت کے کاروبار کے لیے دینے سے بھی نقصان ہے، چناں چہ اس صورت میں یہ شخص جہاں سے زیادہ سود ملے وہاں روپیہ لگانے کی فکر میں رہے گا چاہے دوسری طرف ملک اور قوم کا کتنا ہی بڑا نقصان

ہو، یا کتنے ہی لوگ بے روزگار پڑے رہیں۔ نیز یہ کہنا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں تجارت کے لیے سودی قرضوں سے نہیں روکا گیا، غلط ہے، بہت سے ایسے واقعات عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اور عہد خلافت راشدہ میں ملتے ہیں جن میں کاروبار اور تجارت کے لیے سودی قرض لینے دینے سے شدت سے روکا گیا۔

فیروز : مولانا صاحب، جب سامان اور مکان وغیرہ کا کرایہ لینا جائز سمجھا گیا ہے تو پھر سود جو در حقیقت روپیے کا مخصوص مدت کا کرایہ ہی ہے اس سے کیوں منع کیا گیا ہے۔

مولانا : کرایہ ان چیزوں کا ہوتا ہے جن کو کرایہ دار کے لیے مہیا کرنے میں کرایہ پر دینے والے کا مال و محنت صرف ہوئی ہو اور استعمال سے وہ چیزیں خراب ہوتی ہوں، ان میں ٹوٹ پھوٹ ہوتی ہو اور سب سے بڑی بات یہ کہ وہ چیز اپنی قیمت کھوتی ہو جیسے سامان اور مکان استعمال سے اپنی قیمت کھوتے یا کم کرتے رہتے ہیں، بخلاف روپیے کے کہ وہ استعمال سے اپنی قیمت نہیں کھوتا، اس کی مالیت ہر حال میں وہی رہتی ہے، رہ گئی یہ بات کہ دائن جب اپنے مال سے فائدہ اٹھانے کا موقع دے رہا ہے تو اس کو فائدہ میں سے کچھ حصہ ملنا چاہئے تو اس سلسلہ میں معقول بات یہ ہے کہ محنت کرنے والے کے ساتھ نفع اور نقصان میں ایک طے شدہ تناسب کے ساتھ بھاگی دار بن جائے نہ یہ کہ تجھ کو چاہے نفع ہو یا نقصان مجھ کو تو ہر ماہ اتنا دیتا رہ۔ آخر سود پر قرض دینے والے کو کیسے یقین ہو گیا کہ مدیون نے جس کاروبار کے لیے سود لیا ہے اس میں نفع ہی ہوگا۔

فیروز : مولانا صاحب! ایک شخص جان توڑ رہا ہے اور اس کو بلا سود کے کاروبار کرنے کو رقم نہ ملتی ہو، تو کیا اسلام یہ کہے گا کہ یہ چاہے مر جائے مگر سود پر قرض نہ لے۔

مولانا : اسلام نے پہلے تو ایسے قوانین بنائے ہیں کہ ایک مسلمان کو اسلامی اسٹیٹ میں یہ حالات ہی پیش نہیں آسکتے اور اگر اسٹیٹ اسلامی نہیں ہے تو مسلم سماج کو ایسی ہدایات دی ہیں کہ وہ اپنی سوسائٹی میں اسلامی احکامات پر عمل کرتے ہوئے اس طرح رہیں کہ اپنا زکوتی اور صدقاتی نظام بھی برقرار رکھیں اور اپنے مسلم بھائی کی ہر قسمی ضروریات کا احساس کریں۔ خواہ یہ نظام انفرادی طور پر ہو یا اجتماعی طور پر لیکن اگر بالفرض کسی غیر اسلامی اسٹیٹ میں مسلمانوں کی بے حسی اور غفلت سے کسی مسلمان کی جان کے لالے پڑے ہوں اور سودی قرض کے علاوہ بچنے کی کوئی شکل نہ ہو تو ایسے حالات میں

ہنگامی طور پر بہت سی ممنوع چیزیں بھی حلال ہو جاتی ہیں۔

فیروز : مولانا صاحب! کیا آج دنیا کے ہزاروں بینک جو پوری دنیا کے قسمتوں کے مالک بنے بیٹھے ہیں، اسلام کی نظر میں بے کار ہیں، اور ان کا پلان جس سے ہزاروں لوگ پل رہے ہیں لا حاصل ہے، جبکہ انسانی معیشت کا دارومدار سرمایہ پر ہے اور وہ جمع کیسے ہو، اس کی صورت یہ ہے کہ لوگ اپنی ضروریات پر پابندی لگا کر کچھ رقم پس انداز کرنے کی عادت ڈالیں، اس کے علاوہ سرمایہ جمع ہونے کی کوئی شکل نہیں، لیکن انسان ضروریات کو کیوں محدود کرے، کفالت شعاری پر کیوں آمادہ ہو، جب اس کو اس قربانی کا کوئی اجر نہ ملے، لہٰذا سود ہی وہ اجر ہے جس کی امید پر وہ روپیہ بچانے پر آمادہ ہوگا، لہٰذا اگر سود حرام ہو گیا تو سرمایہ بینک میں اکٹھا کیسے ہوگا اور جب وہ اکٹھا نہ ہوگا تو کاروبار کے لیے لوگوں کو روپیہ کہاں سے ملے گا، چناں چہ سود ہی کا لالچ ہے جس کی وجہ سے لوگ روپیہ بینک میں جمع کرتے ہیں اور بینک سود ہی کے لالچ میں لوگوں کو کاروبار کے لیے روپیہ دیتا ہے، اگر سود حرام ہو تو اولاً تو یہ سرمایا جمع ہی نہ ہوگا اور اگر ہوا بھی تو وہ بیکار اکٹھا ہوتا رہے گا، لہٰذا سود کا لالچ پیسہ جمع بھی کراتا ہے اور اس کو لوگوں تک پھر کھینچ کر بھی لے جاتا ہے۔ بل کہ ان کو اس کے مفید استعمال پر مجبور کرتا ہے کیوں کہ مع سود ادائیگی کے ڈر سے یہ اس کو صحیح استعمال کرے گا اور نفع کمانے کی پوری کوشش کرے گا۔

بہر حال قرض انسانی زندگی کے لیے ناگزیر ہے، انسان کو ذاتی ضروریات کے لیے، کاروبار کے لیے قرض کی ضرورت ہوتی ہے، بل کہ حکومتوں کا کام بھی اس کے بغیر نہیں چلتا، ظاہر ہے کہ قرض کی اتنے بڑے پیمانہ پر بہم رسانی صرف صدقات، خیرات کے مال سے نہیں ہو سکتی۔

مولانا : سودی بینکوں کا نظام ہی در حقیقت دنیا کو برباد کیے ہوئے ہے، اس لیے لوگ بینک میں اپنا پیسہ ایک مخصوص رقم بطور سود کے ملنے کے لالچ میں رکھتے ہیں اور بینک کے مالک اس روپیہ کو زیادہ وہ شرح سود پر بڑے بڑے بیوپاریوں کو دیتے ہیں، بڑے تاجر اس رقم کو لے کر بازار میں پہنچتے ہیں اور ہزاروں من غلہ اور دوسری اشیاء خوردنی و روزمرہ کے استعمال کی چیزیں خرید کر اسٹاک کر لیتے ہیں تا کہ قیمت بڑھنے کے زمانے میں بیچ کر زیادہ نفع کمائیں اور بینک کا سود ادا کرنے کے قابل ہوں، لیکن مال اسٹاک ہو جانے

کی وجہ سے بازار سے غلہ اور خوردنی اجناس ختم ہو جاتی ہیں اور بھاؤ چڑھ جاتے ہیں جس
کی وجہ سے غریب مرجاتا ہے، اور اس کو مہنگا خریدنا پڑتا ہے، یا اس کو چیز ملتی ہی نہیں ہے،
یہ سب فساد ہے سود کا۔ نہ سود کا لالچ ہو، نہ کوئی روپیہ بینک میں جمع کرے، نہ روپیہ جمع ہو،
نہ بینک تاجر کو روپیہ دے، نہ تاجر مال اسٹاک کرے، نہ بازار سے اشیاء غائب ہوں، نہ
مہنگائی بڑھے، نہ غریب مرے۔

دراصل معاشی ترقی اور خوش حالی کا دارومدار اس پر ہے کہ لوگ بحیثیت مجموعی جتنا سامان
زیست پیدا کریں وہ جلدی جلدی فروخت ہوتا جائے تا کہ پیداوار اور اس کی کھپت کا چکر
تیزی سے چلتا رہے، لوگ کہتے ہیں کہ سرمایہ بینک میں جمع کیا جائے اور صنعت اور
تجارت کے لیے اُدھار دینے کے لیے اکٹھا ہو، حالاں کہ اس کا نقصان یہ ہوگا کہ جو مال
بازار میں موجود ہے اس کا بڑا حصہ یوں ہی پڑا رہے گا اس لیے کہ جن لوگوں میں پہلے
سے قوت خرید نہیں ہے وہ تو خرید ہی نہیں سکتے اور جن میں قوت خرید موجود ہے وہ بینک
میں جمع کرنے کی فکر میں خرید نہیں کریں گے، ظاہر ہے کہ اس سے مال کی کھپت رُکے گی،
جس سے روزگار میں کمی آئے گی۔ اگر لوگ مال بینک میں جمع کر کے اس کو دوسروں کو
پیداوار بڑھانے کے لیے دیں بھی اور پیداوار اور بڑھے بھی، لیکن جب خریداری ختم ہو
چکی تو پھر یہ پیداوار کہاں کھپے گی، اس سے پتہ چلا کہ معاشی ترقی مال کے خرچ کرنے
میں مضمر ہے نہ کہ جمع کرنے میں۔

فروز: مولانا صاحب! کیا بینک سسٹم کے سلسلہ میں اسلام کوئی ایسی رہنمائی کرتا ہے کہ اگر
بینک کے طریقہ کار میں کوئی تبدیلی کر کے اُس کو کارآمد بنا لیا جائے اور لاکھوں کروڑوں
کی وہ آمدنی کی جوان کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے ملک اس سے محروم نہ رہے۔

مولانا: کیوں نہیں! اگر ان بینکوں میں جمع سرمایہ سے تجارت کا ایسا نظام بنا لیا جائے جس
میں مال جمع کرنے والے کو شریک کی حیثیت حاصل ہو اور وہ نفع نقصان دونوں میں
شریک ہو تو یہ شکل جواز کی حد میں آسکتی ہے مگر اس تجارت سے احتکار وغیرہ سے بچا
جائے، تا کہ ملک وقوم کو چیزوں کے بھاؤ کے بڑھنے کا خطرہ لاحق نہ ہو۔

دوسرے یہ کہ اسی کے ساتھ ساتھ اس میں ایک انتظام ایسا بھی ہونا چاہئے کہ چھوٹے
تاجروں کو بھی بطور مضاربت کے مال دیا جائے۔

نیز ایک شکل یہ بھی ہو کہ ایک رقم غیر سودی طور پر بھی غریب کو دی جائے تا کہ وہ اپنے
پیروں پر کھڑا ہو سکے، البتہ اُس سے بطور ضمانت کے کچھ اثاثہ یا زیور لے کر رکھا جاسکتا
ہے، یا کسی ذی حیثیت کی ذمہ داری پر بھی دیا جاسکتا ہے، اس طرح اس بینک سسٹم کو
اسلامی انداز میں ڈھالا جاسکتا ہے، اور آج اس سلسلہ میں مسلم ماہرین اقتصادیات اور
ماہرین اسلامیات نے بڑی اچھی اچھی کتابیں لکھی ہیں جن میں ان بینکوں کو اسلامی
انداز پر مفید بنانے کی صورتیں سمجھائی ہیں، اس کے علاوہ اس سلسلہ میں علماء و ماہرین
سے مزید مشورہ بھی کیا جاسکتا ہے۔

فیروز: مولانا صاحب! آج آپ کی گفتگو سے مجھ کو بہت فائدہ ہوا، میں آپ کا بے حد
ممنون ہوں۔ السلام علیکم۔

مولانا: وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

(۱۷) مسلم پرسنل لاء

مجید: شریف صاحب! کیا حال ہے، آپ کے اخبارات کیا کہہ رہے ہیں۔

شریف: ارے بھائی! آج کل سالانہ امتحان چل رہا تھا ممتحن بھی باہر سے آئے ہوئے تھے، ان دنوں اخبار دیکھنے کی فرصت کس کو تھی، کیا کوئی خاص واقعہ پیش آیا ہے۔

مجید: جی ہاں! آج کل مسلم اخبارات میں پرسنل لاء پر بڑی لے دے ہو رہی ہے۔

شریف: کیوں؟ کیا کوئی بیان حکومت نے دے ڈالا ہے۔

مجید: نہیں بھائی حکومت کیا بیان دیتی، وہ تو ان مولوی ملوں کے کان بجتے ہیں، ذرا کسی نے مسلم پرسنل لاء کا تلفظ کیا کہ یہ لوگ چیخنے لگتے ہیں کہ اسلام ہندوستان سے اب رخصت ہوا۔

شریف: مجید صاحب! ایسا نہیں، ضرور کچھ دال میں کالا ہوگا'' تا نہ باشد چیزکے مردم نہ گویند چیزہا'' بے چارے مولوی ویسے تھوڑے ہی آواز اٹھاتے ہیں، ضرور اندر کوئی کھچڑی پکی ہوگی، تبھی تو بیچاروں نے بروقت آواز اٹھا کر سدِّ باب کی کوشش کی ہوگی۔

مجید: نہیں بھائی نہ کھچڑی نہ پلاؤ، ذرا سی بات تھی کہ اپنے ملک کا جب قانون بنا تھا تو ایک دفعہ اس میں یہ بھی رکھی گئی تھی کہ ہر مذہب والے کو اپنے مذہب کے قانون پر عمل کی اجازت ہوگی اور عدالتیں بھی اسی کے مطابق فیصلہ کریں گی۔

شریف: تو پھر یہ ٹھیک ہے، اسی پر آج تک عمل ہو رہا تھا۔

مجید: مگر صاحب ایک دفعہ یہ بھی اس قانون میں تھی کہ بھارت واسیوں کو اس کی بھی کوشش کرتے رہنا چاہئے کہ ایک زمانہ ایسا آجائے کہ سب کا قانون ایک ہو، یکساں سول کوڈ بنے تاکہ یہ بھانت بھانت کی بولیاں ختم ہو جائیں، عدالت کو ہر مذہب کا پرسنل لاء اپنی میز پر نہ رکھنا پڑے، سارے بھارتیوں کا ایک قانون ہو، اتفاق اور اتحاد کے لیے یہ بہت اچھی بات ہے، ایسا ہو جائے تو کیا حرج ہے۔

شریف: مجید صاحب! اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ ہر مذہب والا اپنے پرسنل لاء سے دست

بردار ہو جائے، حالاں کہ مسلمانوں کا پرسنل لاء تو آسمانی ہے، اس پر عمل تو ان کے ایمان کا ایک جزو ہے۔

مجید: شریف صاحب! یہ ہی تو بحث ان مولویوں نے اٹھا رکھی ہے، لوگ کہتے ہیں ان کو تو ہر چیز آسمانی معلوم ہوتی ہے۔ رہتے زمین پر ہیں اور عمل کرتے ہیں آسمانی قانون پر۔

شریف: جناب! آپ کو ان باتوں کے کرنے کا حق حاصل نہیں، یہاں تو سوال ہے کہ جب قانون کی ایک دفعہ میں سب مسلمانوں کو اپنے پرسنل لاء پر عمل کا تحفظ دیا گیا ہے تو پھر دوسری ایسی دفعہ کیوں بنائی گئی، جس کی وجہ سے پہلی دفعہ پر زد پڑتی ہے۔

مجید: بھائی! وہ دفعہ تو اس لیے رکھی گئی تھی کہ جب قوم کا ایک مزاج ہو جائے اور سارے لوگ ایک قانون چاہنے لگیں تو پھر یکساں سول کوڈ بنا دیا جائے تاکہ ہندوستانی سب کے سب ایک قانون کے تحت آجائیں۔

شریف: تو جناب! ساری قوم کہاں چاہتی ہے، مسلمان تو ہرگز اس تبدیلی کو نہیں چاہتا۔

مجید: ارے بھائی! آپ تو سو رہے ہیں، ملک میں جا کر دیکھو سب پڑھے لکھے مسلمان چیخ رہے ہیں، خصوصاً مسلم عورتوں نے تو حد کر دی ہے وہ زور دے رہی ہیں کہ سول کوڈ بناؤ، اسلامی پرسنل لا تو ہم کو پیس رہا ہے، اس نے ہماری آزادی اور حقوق برسوں سے سلب کر رکھے ہیں۔

شریف: غلط ہے مسلمان، مسلمان ہو کر کبھی قرآنی قانون کے متعلق ایسا اظہار نہیں کر سکتا۔

مجید: آپ کس دنیا میں رہتے ہیں، ناگپور میں دیکھو عورتوں نے کتنا بڑا زوردار اجتماع کر کے پرسنل لاء کے ختم کرنے کا مطالبہ کیا ہے۔

شریف: صاحب! یہ لوگ کرائے سے جمع کئے گئے ہوں گے، یا پھر بیچارے اسلامی قانونِ انصاف سے ناواقف ہوں گے، ان کو اس سلسلہ میں اسلام سے واقف لوگ یعنی علماء سے پوچھنا چاہئے، جن کی رائے دین میں سند کا درجہ رکھتی ہے۔

مجید: علماء سے کون افہام وتفہیم کرے، ان کو سوچنے سمجھنے کی عادت کہاں، وہاں تو ذرا پرسنل لا کا نام آیا کہ فوراً جلسے جلوسوں کی یلغار اور'' اسلام خطرے میں ہے'' کے نعرے، ابھی بمبئی میں ان لوگوں نے اتنا بڑا کنونشن کر ڈالا کہ ایک صد میں بھی مسلمانوں کا مشترکہ کوئی جلسہ ایسا نہ ہوا ہوگا، ان کے سب سے بڑے مدرسے کے مہتمم ہی اس عظیم کنونشن کے

داعی تھے۔

شریف: کرنا ہی چاہیے، دین میں دخل اندازی یہ قوم نہیں دیکھ سکتی، یہ علما کی ذمہ داری ہے اور انہوں نے اس ذمہ داری کو ہر دور میں نبھایا ہے۔

مجید: مگر لوگ سوال کرتے ہیں کہ قرآن میں تو یہ بھی لکھا ہے کہ چور کے ہاتھ کاٹو، شرابی کے کوڑے لگاؤ، زانی کو رجم کرو، پھر مولوی لوگ حکومت سے یہ کیوں نہیں کہتے کہ غیر مسلم چوری کرے تو حکومت کوئی بھی سزا دے مگر مسلمان چوری کرے تو ہاتھ ہی کاٹنا چاہیے، کیوں کہ ہمارے قرآن میں لکھا ہے۔

شریف: آپ کہاں چلے گئے، یہ تعزیرات کا مسئلہ ہے، یہاں عائلی قانون سے بحث ہو رہی ہے جو انسان کا اپنا ذاتی معاملہ ہوتا ہے، قانون میں ضمانت عائلی قانون کی دی گئی ہے، سزاؤں کا جہاں تک مسئلہ ہے وہ اسٹیٹ کا اپنا مسئلہ ہے اس کی وہ خود مختار ہے، جب تک مسلم حکومت نہ ہو کوئی اس کو نافذ نہیں کرسکتا۔

مجید: مگر سوال یہ ہے کہ جب مسلمان خود اپنے قانون سے بیزار ہو تو کیا، کیا جائے۔

شریف: ہر عامی کی بیزاری کا اعتبار نہیں ہوتا، یوں تو بہت سے مسلمان نماز نہیں پڑھتے، تو کیا حکومت ان کے اس عمل کو دلیل بنا کر مساجد بند کرسکتی ہے کہ یہ ہزاروں لوگ کہاں نماز پڑھتے ہیں، دینی معاملات میں اعتبار اہل علم ہی کی بات کا ہوگا، نہ کہ عام لوگوں کا۔

مجید: مگر کیا اہل علم صرف اس ملک ہی میں رہتے ہیں، مصر، پاکستان وغیرہ میں نہیں ہیں، ان ملکوں نے کیوں پرسنل لا میں ترمیم کرلی۔

شریف: ٹھیک ہے، اب آپ نے اتنا تو مانا کہ اہل علم ہی سے معلوم کرنا پڑے گا۔ ہاں! مصر اور پاکستان وغیرہ میں اہل علم رہتے ہیں مگر اس کا کیا ثبوت ہے کہ انہوں نے وہاں مخالفت نہیں کی تھی، بے چاروں نے ایڑی چوٹی کا زور مخالفت میں لگا دیا مگر کون سنتا ہے، پھر مصر اور پاکستان کی مثال دینا غلط ہے۔ کیا اگر پاکستان میں قانون کے خلاف کوئی زیادتی اور ظلم ہونے لگے اور کسی طبقے کو ستایا جانے لگے، تو ہم کو بھی ظلم کا جواز حاصل ہو جائے گا؟ پھر دیکھنا یہ ہے کہ ان ملکوں نے اپنے یہاں کی اقلیت کے پرسنل لاء کو ہاتھ بھی نہیں لگایا ہے، آخر اس حیثیت سے ان ملکوں کو کیوں نہیں دیکھا جاتا۔

مجید: شریف صاحب! لوگ کہتے ہیں کہ مسلم پرسنل لا میں بعض ایسے مسائل ہیں جو عقل

وخرد کے قطعاً خلاف ہیں اور صریح ظلم نظر آتے ہیں کیا ان کو بدلنا بھی مناسب نہیں ہے۔

شریف: جی نہیں! قانونِ خداوندی عقل وخرد کے خلاف ہے ہی نہیں، یہ عقل وخرد کی خامی ہے جو بوجہ مریض ہونے کے شہد کو ایلوا کہہ رہی ہے۔

مجید: اس کا تو یہ مطلب ہے کہ مسلمان کا پرسنل لا ایسا ہے کہ چاہے کوئی ساز مانہ آجائے اور کیسے ہی حالات ہوں اس میں ادنیٰ غور وخوض اور لچک کی گنجائش نہیں ہے۔

شریف: یقیناً سلامی قانون میں لچک ہے اس میں بعض مخصوص حالت میں بعض رعایتیں دی جاسکتی ہے، مگر اس کو شریعت کے رمز شناس ہی سمجھ سکتے ہیں کہ کن امور میں قطعیت ہے کہ وہاں ادنیٰ گنجائش نہیں اور کہاں تھوڑی بہت گنجائش بعض مخصوص حالات میں دی جاسکتی ہے۔

مجید: لوگ کہتے ہیں کہ اسلام میں بعض احکامات ایسے بھی ہیں کہ چاہے وہ کسی کو کیسے ہی ظلم نظر آرہے ہوں، مگر ان میں تبدیلی نہیں ہوسکتی۔

شریف: ظلم کہنا اپنی عقل کی کوتاہی ہے، اللہ کے امر میں کسی انسان کو تبدیلی کا کوئی حق حاصل نہیں ہے، جیسے اس کی خلق میں کوئی تغیر نہیں کرسکتا، جیسے کوئی سورج چاند کی چال کو نہیں بدل سکتا ایسے ہی نصوصِ قطعیہ کو انسان ہاتھ نہیں لگا سکتا، اس کی خاطر مسلمان اپنا سب کچھ قربان کرنے کے لیے تیار رہتا ہے، اور یہ ہی اس کے ایمان کا تقاضا ہے، اچھا کیا آپ بتا سکیں گے کہ وہ کون کون سے اسلامی قانون ہیں جو عقل وخرد کے خلاف ہیں اور کسی ایک طبقہ پر ظلم کے مرادف ہیں۔

مجید: مثلاً لوگ کہتے ہیں کہ تعدد ازواج ہی کو لے لیجیے، یہ قانون عورت ورگ پر صریح ظلم معلوم ہوتا ہے۔

شریف: افسوس کہ لوگ اللہ کے قانون میں رکھے ہوئے مصالح کو نہ جان کر گمراہ ہو رہے ہیں، بھلے آدمی یہ بھی نہیں سمجھتے کہ تعدد ازواج کی اجازت والا قانون پہلے تو جبری یا لازمی نہیں ہے، مخصوص حالات میں مخصوص شرائط میں اس کی اجازت ہے۔

مجید: میں نہیں سمجھ سکتا کہ وہ حالات کیا ہوسکتے ہیں، میں تو سمجھتا ہوں یہ قانون لوگوں کو گناہ کی ترغیب دیتا ہے، مثلاً اگر کسی بستی میں بیس مرد اور بیس عورتیں ہوں اور آپ کے قانون کے مطابق ہر آدمی چار عورتوں سے نکاح کرے تو یہ عورتیں صرف پانچ مردوں کو

کافی ہوں گی، پندرہ آدمی بلا عورت کے رہ جائیں گے، ظاہر ہے کہ وہ برائی میں مبتلا ہوں گے۔

شریف: مگر میں آپ سے کہتا ہوں، آپ کوئی آبادی ایسی نہیں دکھلا سکتے جہاں سب لوگ چار عورتیں رکھتے ہوں، یہ محض فرضی صورت ہے، اور آپ نے جو مثال دی ہے میں اس کے مقابلہ میں کہتا ہوں کہ اگر کسی ملک میں عورت مرد فرض کرو برابر ہوں مثلاً ایک ہزار مرد، ایک ہزار عورتیں اور جنگ پیش آجائے جیسا کہ رات دن جنگیں ہوتی رہتی ہیں اور عموماً جنگ میں مرد ہی زیادہ مرتے ہیں، تو اس آبادی کے اگر آدھے مرد مرجائیں اور تعددِ ازواج کی اجازت نہ ہو تو پانچ سو عورتیں کا کیا ہوگا، کیا وہ برائی میں مبتلا نہیں ہوں گی، آپ کی مثال کے مقابلہ میں زیادہ تر وقوع اسی چیز کا ہوتا ہے جیسا کہ پہلی اور دوسری جنگ عظیم میں ایسا ہی ہوا تھا! اسی طرح دوسرے اعتراضات کی کمزوری آپ سمجھ سکتے ہیں۔

مجید: لوگ کہتے ہیں مسلم پرسنل لا میں نکاح کے لیے زوجین کا مسلمان ہونا ضروری قرار دیا گیا ہے، حالاں کہ مذہب تو انسان کا اپنا عقیدہ ہے پھر اختلاف دین کو نکاح کے باب میں کیوں گوارہ نہیں کیا جاتا، لہٰذا پرسنل لا کا یہ قانون قطعاً عقل کے خلاف ہے۔

شریف: وکیل صاحب! ایسا سوچنے والا نکاح کے مقاصد سے قطعاً ناواقف ہے، عائلی زندگی اور اولاد کی تربیت کے لیے دونوں کے مذہب کا ایک ہونا ضروری ہے، بعض چیزیں ایک مذہب میں آداب میں داخل ہیں جب کہ دوسرے مذہب میں وہ انتہائی ناپسند ہیں، جیسے بوقتِ ملاقات ہاتھ جوڑنا، پیر چھونا، جھکنا، لہٰذا اختلافِ دین اس ہمہ وقتی رفاقت کے رشتے میں کیسے گوارا کیا جاسکتا۔ وکیل صاحب! زبان سے کہنا آسان ہے، مگر زندگی میں کامیاب ہونا دشوار ہے، اسلام نے اس قانون میں انسانی نفسیات کا پورا خیال رکھا ہے، جس کو آپ خلافِ عقل بتلا رہے ہیں۔

مجید: مسلم پرسنل لا نے نابالغ کی شادی کو اس کے اولیاء کے ذریعہ جائز قرار دیا ہے، حالاں کہ یہ ایک ایسا انتخاب ہے جس کو انسان بالغ ہوکر خود ہی صحیح طور پر کرسکتا ہے۔

شریف: اسلام نے بلوغ سے پہلے نکاح کرنے کو ضروری قرار نہیں دیا ہے، لیکن اگر کسی وقت کسی اچھے رشتہ کے سامنے آنے کی صورت میں اولیاء اس کو مناسب سمجھ کر نکاح

کرادیں تو اس کو جائز رکھا گیا ہے، اس میں بھی بعض صورتوں میں ایسی گنجائش رکھی گئی ہے کہ اگر نکاح کے انعقاد میں کوئی دھوکہ کیا گیا ہے تو بلوغ کے بعد اس کو رد کیا جاسکتا ہے، تو ایک ایسا حکم جو واجب اور ضروری نہیں ہے صرف بعض مصالح کے پیش نظر اس کو جائز رکھا گیا ہے، اس کو آپ خلاف عقل قرار دے رہے ہیں۔

مجید: مسلم پرسنل لا اختلافِ دین کی صورت میں وراثت سے مرحوم رکھتا ہے حالاں کہ وراثت کا حق تو رشتہ سے منسلک ہے۔

شریف: لیکن جب اختلافِ دین سے رشتہ ہی ختم ہوگیا تو جو بنیادِ حق وراثت تھی وہ ہی ختم ہوگئی تو پھر وراثت کیسی؟ افسوس آپ اتنی معقول بات بھی نہیں سمجھ سکتے۔

اصولی طور پر یہ سمجھ لیجئے کہ اسلامی قوانین اللہ کے قوانین ہیں اور اللہ بندوں کی مصلحت کو بندوں سے زیادہ جانتا ہے، یہ شیطان کا قرآن سے ہٹانے کا فریب ہے کہ وہ اس کے قوانین کو سخت بتلاتا ہے اگر اس نہج پر آپ سوچیں گے تو انشاء اللہ سارے اشکالات حل ہوجائیں گے۔

مجید: شریف صاحب! آپ کا شکریہ کہ آپ نے مجھے دعوتِ فکر وتدبر دی، انشاء اللہ آئندہ بھی میں آپ سے تبادلۂ خیالات کرتا رہوں گا۔ السلام علیکم

شریف: وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔

(۱۸) ضبط تولید

حنیف: شکیل صاحب! یہ آپ کے ہاتھ میں جو اخبار ہے اس میں یہ بڑی سی تصویر کیسی نظر آ رہی ہے۔

شکیل: جناب! یہ اشتہاری تصویر ہے، آج کل یہ اشتہار گورنمنٹ کی طرف سے تمام ہی کثیر الاشاعت اخبارات کو دیا جا رہا ہے۔

حنیف: اس اشتہار کا مقصد کیا ہے؟

شکیل: آپ کو معلوم نہیں، گورنمنٹ نے بڑھتی ہوئی آبادی پر کنٹرول کرنے کے لیے ایک زبردست مہم چلا رکھی ہے جو پریوار نیوجن، برتھ کنٹرول اور ضبط ولادت کے ناموں سے مشہور ہے، چوراہوں، ہسپتالوں، بس اسٹینڈ و ریلوے اسٹیشن غرض ہر اس مقام پر جہاں پر لوگوں کا گذر ہوتا ہے وہاں اس کی اہمیت اور فوائد پر مشتمل عبارتیں اور تصویریں چسپاں ہیں تاکہ لوگ اس کی اہمیت سمجھیں اور اس مہم کو کامیاب بنانے میں حکومت کے ساتھ تعاون کریں۔

حنیف: شکیل صاحب! میں یہ نہیں سمجھ سکا کہ حکومت اس مسئلے کو کیوں اتنی اہمیت دے رہی ہے، ہر چیز کی پیداوار بڑھاؤ، غلہ زیادہ پیدا کرو، جانور اچھے اور زیادہ پیدا کرو، درخت پھل پھول مصنوعات غرض ہر چیز کو بڑھانے کو کہنا اور انسان جو سب سے اچھا ہے اس کو کم کرنے اور اس کی پیداوار کو روکنے کا مشورہ دینا، اس پر انعام دینا؟ آخر اس میں کیا مصلحت ہے؟ کیا آپ اس سلسلہ میں کچھ بتلا سکیں گے۔

شکیل: جناب! آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ حکومت اپنے ملک کی بڑھتی ہوئی آبادی سے خوف محسوس کرنے لگی ہے اور ماہرین کا خیال ہے کہ اگر انسان کا یہ سیلاب اسی طرح بڑھتا رہا تو زندگی محال ہو جائے گی، اس لیے کہ زمین تو بڑھتی نہیں، جس شخص کے پاس پانچ بیگہ زمین ہے وہ دو بچے ہوں تب بھی اتنی ہی رہتی ہے اور چار ہو جائیں تب بھی اتنی ہی رہتی ہے۔ یہی حال تنخواہوں کا ہے کہ وہ بچوں کی پیداوار کے ساتھ نہیں بڑھتی کہ دو بچے والے ۱۰۰؍روپیہ اور چار بچوں والے کو ۲۰۰؍روپیہ، اور آج کل لوگوں کا حال یہ ہو گیا

ہے کہ سوائے بچے پیدا کرنے کے گویا ان کو دوسرا کام ہی نہیں ہے، سڑے بسے مریل آدمی بھی آج کل ۸۔۹ بچے سے کم پیدا نہیں کر رہے ہیں، پھر بچے پیدا کرنا تو آسان ہے مگر محدود ذرائع میں، محدود تنخواہ میں ان کو کھلانا، پالنا، پڑھانا، علاج کرانا مشکل ہوتا ہے، جب کہ آج تعلیم مہنگی، علاج مہنگا، غلہ مہنگا؛ لہٰذا بچوں کا مستقبل تاریک ہو جاتا ہے، وہ بے یار و مددگار سڑکوں پر پھرتے ہیں، بھیک مانگتے ہیں، جوتوں پر پالش کرتے ہیں، باوجود ہونہار ہونے کے وسائل کی کمی کی وجہ سے وہ ادنیٰ دھندوں پر مجبور ہوتے ہیں۔ اس طرح ملک پس ماندہ اور بھکاری بن جاتا ہے، اگر بچے کم ہوں تو ان کی دیکھ بھال، پرورش تعلیم و علاج اچھی طرح ہو سکتا ہے، اس سے ماں باپ کو بھی خوشی ہوتی ہے اور ملک کی حالت بھی سدھرتی ہے، ہمیں تو ایسا لگتا ہے کہ ماہرین نے ملک کو بہت اچھا مشورہ دیا ہے، اس اسکیم کے علاوہ کوئی حل ہی نہیں تھا، لوگ بھی آہستہ آہستہ اس کی اہمیت کو سمجھتے جا رہے ہیں دوسرے ملکوں نے بھی اپنے یہاں اس اسکیم کو رائج کر کے نفع اٹھایا ہے۔

حنیف: شکیل صاحب! آپ نے جو باتیں بتلائیں اس میں مجھے آپ سے کچھ پوچھنا ہے، پہلی بات تو آپ یہ بتلائیں کہ کیا اس سے پہلے زمانے میں لوگوں کے زیادہ بچے نہیں ہوتے تھے؟ میری جہاں تک معلومات ہیں اس سے تو پتہ چلتا ہے پہلے زمانہ میں آج کل کے مقابلے میں زیادہ بچے پیدا ہوتے تھے اور زمینیں اتنی ہی تھیں جتنی آج ہیں بلکہ آج تو عمدہ اور اعلیٰ کھاد اور مشینوں کے ذریعہ کاشت و کھیتی کے نئے نئے ڈھنگ ایجاد ہوئے جن کی وجہ سے پیداوار پہلے سے بہت بڑھ گئی ہے، پودوں کو نقصان پہونچانے والی جراثیم کش دواؤں سے فصل کو جتنا تحفظ آج ملا ہے پہلے کے لوگ تو سوچ بھی نہیں سکتے تھے، ذرائع آمدنی اور تنخواہوں کا معیار آج بہت بڑھ گیا ہے، سرکار کی طرف سے بہت سی سہولتیں فری ہیں، پھر دوسرے ملکوں سے تجارت در آمد و برآمد میں وہ ترقی ہوئی ہے جو تصور سے باہر ہے، یہاں اگر کوئی چیز نہیں ہوتی تو اس کے عوض کسی چیز کو دوسرے ملک روانہ کر کے غلہ حاصل کر لیا جاتا ہے، پھر ہم نہیں سمجھ سکتے کہ حکومت کا یہ خطرہ کہ آبادی کو روکو، ورنہ ملک پس ماندہ ہو جائے گا، کہاں تک صحیح ہے۔

شکیل: حنیف صاحب! یہ صحیح ہے کہ پہلے بھی بچے بہت پیدا ہوتے تھے، مگر سوال یہ ہے کہ پہلے اتنی کامیاب دوائیں ایجاد نہیں ہوئی تھیں پہلے ایک آدمی کے دس بچے ہوتے تھے، ان میں سے چار پانچ چیچک سے مر جاتے تھے، دو تین ہیضے سے، ایک دو خود بخود

اس طرح بچتے بچاتے خود بخود دو تین رہ جاتے تھے، مگر اب چیچک کے ٹیکہ نے اس بیماری پر قابو پالیا ہے۔ اسی طرح بچوں کی دوسری بیماریوں کا حال ہے، اب بچے بہت کم مرتے ہیں، لہٰذا اکثر بچ جاتے ہیں اور والدین کے لیے بوجھ بنتے ہیں۔ اور باوجود کثرتِ پیداوار کے حکومت اس یاجوج ماجوج کی فوج کا پیٹ نہیں بھر پا رہی ہے۔ اس کے علاوہ پہلے تمدن نے ترقی نہیں کی تھی، لوگ معمولی غذا اور معمولی گھر، مکان ادنیٰ قسم کے کپڑوں میں کام چلا لیتے تھے تعلیم کوئی چیز ہی نہیں تھی، بیماریاں بھی کم تھیں، حمل ونقل اور اسفار کی کمی کی وجہ سے زندگی محدود تھی، جس کی وجہ سے خرچ کم تھا لیکن اب تمدن اس درجہ بڑھ گیا ہے کہ معمولی چیزوں سے کام نہیں چلتا، اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ اس دور کو پہلے زمانے پر قیاس کرنا صحیح نہیں ہے، آج کی جو مشکلات ہیں پہلے کے لوگ اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔

مولانا حامد صاحب کیا میں سچ نہیں کہہ رہا ہوں؟

حامد: شکیل صاحب! آپ نے جو کچھ فرمایا ہم نے سُنا مگر میں سمجھتا ہوں لوگوں کے سوچنے کا انداز بدل گیا ہے اور اس اندازِ فکر میں اس تصور کو بھلا دیا گیا ہے کہ اس عالم کا ایک پیدا کرنے والا ہے، ارے انسان کو اپنی فکر کرنی چاہیے، اس کو پورے عالم کے مسائل سے کیا بحث، عالم کا خالق ان باتوں کو خوب جانتا ہے کہ مخلوق کتنی بڑھ رہی ہے، اس کی کیا ضروریات ہیں، اس نے جب رزق کا معاملہ اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے، تو محض اس خطرے کے پیشِ نظر انسانوں کو خصی بنانا کہ کہاں سے کھائیں گے، خدا کو رزاق نہ ماننے کے مرادف ہے۔

شکیل: حامد صاحب! اس کا تو یہ مطلب نکلا کہ انسان کو زمین پر خلیفہ نہیں بنایا گیا ہے کیوں کہ خلیفہ کو بھی تو کچھ سوچنا پڑتا ہے، آخر کیا! آپ اپنے گھر کی آمدنی اور خرچ کا بجٹ نہیں بناتے اور اسی کے مطابق صرفہ نہیں کرتے اور اس کے خلاف کرنے پر گھر والوں کو تنبیہ نہیں کرتے اور کرتے ہیں تو جن لوگوں پر پورے ملک کی ذمہ داری ہے، ان کے لیے ضروری ہے کہ وہ پورے ملک کا مسئلہ سوچیں، اسی کے مطابق پلان بنائیں اور ہدایات جاری کرائیں۔

حامد: شکیل صاحب! پلان بنائیں مگر اس کی اجازت نہیں دی جائے گی کہ اولاد جو اللہ کی نعمت ہے اس کو روکا جائے اور انسانوں کو خصی بنا دیا جائے۔

شکیل: حامد صاحب! خون بھی تو اللہ کی نعمت ہے مگر جب بدن میں اس کی مقدار بڑھ جاتی ہے تو پھر کیوں اس کو نکلوایا جاتا ہے؟ بیماریاں بھی تو اللہ کی طرف سے آتی ہیں، پھر ان کا علاج کر کے ان کو کیوں دفع کیا جاتا ہے؟ غربت بھی اللہ کی ایک نعمت ہے اس کو کیوں بُرا سمجھ کر دور کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ معلوم ہوا کہ ہم اُتنا ہی برداشت کریں گے جتنی اپنے اندر سکت دیکھیں، اگر کوئی چیز زائد ہوگی تو اس کو ختم کرنے کا ہم کو حق ہے۔

حامد: آپ کچھ بھی کہیں، مگر انسان کُشی کی اجازت خصوصاً رزق کے خطرے کے پیشِ نظر قطعاً نہیں دی جا سکتی۔ رہی بات خون اور بیماریوں کی۔۔۔۔ تو خون اور بیماریوں کے نعمت ہونے کے باوجود اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس کے بڑھ جانے کی صورت میں نکلوانے اور بیماریوں کا علاج کر کے دفع کرنے کی اجازت دی ہے، اس لیے کہ یہ توکل کے خلاف نہیں ہے اور نظام قدرت میں دخل اندازی بھی نہیں۔

شکیل: دشمن سے اپنی عزت وآبرو، ملک ومال کی حفاظت کے لیے جب انسانوں کو جنگ میں کٹوانا جائز ہے، تو اپنی خوشحالی اور ملک کی پس ماندگی کو روکنے کے لیے ان بچوں کی پیداوار کو روکنے میں کیا حرج ہے؟ جن پر ہمارا کچھ بھی نہیں خرچ ہوا، اس طرح ہر تکلیف دہ چیز کو دور کرنا زندگی کے لیے ضروری ہے۔

حامد: شکیل صاحب! میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ ذرا میری چند باتیں توجہ سے سنیں اور اس فتنہ کے اسباب پر غور کریں۔

(۱) اللہ نے پوری کائنات کو ایک بے پناہ اندازے کے مطابق پیدا کیا ہے، اس نے جیسے تمام چیزوں کو وجود بخشا ہے۔ اسی طرح ان کے رہنے سہنے اور بقاء کے اسباب مہیا کر دیئے ہیں، پھر جتنی چیزیں کم کرنی ضروری ہوتی ہیں قدرت کا نظام خود کم کرتا رہتا ہے ذرا آپ غور کریں ایک مچھلی لاکھوں انڈے دیتی ہے، اگر سب بچے بن جائیں تو سمندروں میں پانی کی جگہ مچھلی ہی مچھلی نظر آئیں گی۔ اسی طرح دوسرے کیڑے مکوڑوں کا حال ہے، خود انسان کی منی میں بچے پیدا کرنے کی صلاحیت ہے اگر اس سے سب بچے پیدا ہو جایا کرتے تو دنیا میں تل رکھنے کو جگہ نہ بچتی، مگر اللہ نے ایسا نظام بنایا ہے کہ ایک مخصوص مقدار کا خود بخود ضبط اور خاتمہ ہوتا رہتا ہے، قدرت کی مشینیں خود ضبطِ تولید اور پری وار نیوجن میں لگی ہوئی ہیں، موت وحیات کا فلسفہ اس کا بین ثبوت ہے کہ اگر

نئے لوگ پیدا ہوتے رہتے اور پرانے نہ مرتے تو دنیا انسانوں سے بھر جاتی مگر ایسا نہیں ہے جتنے لوگ پیدا ہوتے ہیں اسی کے مطابق لوگ مرتے رہتے ہیں، مگر چوں کہ نئے بچوں کو فوراً غلہ کی ضرورت نہیں ہوتی اس لیے مرنے والوں کا تناسب پیدا ہونے والوں سے کم رکھا، کتنا پیارا انظام ہے۔

پھر حادثے، سیلاب، وبائی امراض، ملکوں کی جنگیں، دھماکے، زلزلے ان سے قدرت خود آبادی کا نیو جن کرتی رہتی ہے، تو پھر جب قدرت خود ایک کام پر کنٹرول کئے ہوئے ہے، اس پر انسان اپنی طرف سے اور کنٹرول کرنے کی اسکیم بنائے بیکار ہے، اور اس میں اس کے نظم میں دخل اندازی ہے۔ اور اس سے تو پتہ چلتا ہے کہ خود انسان کے ذمہ جو نظم ہے اس میں کوئی خامی ہے، مثلاً حکومت کا بے جا اسراف بے نفع اسکیموں پر خرچ، بنجر پڑی زمین کو قابل کاشت نہ بنانا، نااہل افسروں کو فوڈ کمشنر بنانا، لاکھوں من غلہ جو گوداموں میں چوہے کھا جاتے ہیں اس کی حفاظت نہ کرنا، آب پاشی کو آسان نہ بنانا وغیرہ۔ اسباب درحقیقت معاشی تنگی پیدا کرتے ہیں، ان اسباب کو چھپانے کے لیے وہ یہ چال چلتا ہے کہ آبادی بڑھنے کا خطرہ بتلا کر لوگوں سے اپنی بدانتظامی اور تقسیم دولت کے نقص اور ذخیرہ اندوزی جیسی لعنت پر پردہ ڈال دے، اور سیکڑوں ان بچوں سے ملک کو محروم کردے جو آئندہ چل کر اپنے دل ودماغ کی صلاحیتوں سے ملک وقوم کے سچے خادم بن سکتے تھے؛ اصل چیز دولت کی صحیح تقسیم ہے، وسائل کی آج بھی کمی نہیں ہے، قدرت آبادی کے ساتھ وسائل بھی بڑھاتی ہے، آج جو زمین سے چیزیں برآمد ہو رہی ہیں پہلے وہ کہاں تھیں، جب آبادی بڑھی ہے تو قدرت نے یہ ذخیرے جو زمین میں اسٹاک تھے اس پر انسان کو مطلع کردیا تاکہ وہ اس سے فائدہ اٹھائے، خود ہمارے ملک میں اتنا غلہ اور اتنے وسائل ہیں کہ ہم خود کفیل ہو سکتے ہیں۔

شکیل: حامد صاحب! آپ نے بہت مفید اور کارآمد باتیں کہیں اگرچہ سب سمجھ میں نہیں آئیں مگر پھر بھی دنیا اور کائنات کے نظم کو سمجھنے میں کافی روشنی ملی ہے۔۔۔۔۔۔۔

اچھا! السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔

حامد و حنیف: وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ۔

(۱۹) تسخیر قمر

رشید: میاں سعید! السلام علیکم، خیریت سے تو ہو؟

سعید: وعلیکم السلام، رشید صاحب! آپ کی دعاؤں سے جی رہا ہوں۔

رشید: سعید صاحب! اخبار وغیرہ تو دیکھ ہی رہے ہوں گے، آپ نے انسانی کمالات دیکھے، چاند پر انسان کے پہونچ جانے کی خبریں گرم ہیں؛ آج انسان نے وہ سب کچھ کر دکھایا جس کو ہمارے آباء واجداد سوچ بھی نہیں سکتے تھے اور خدا جانے یہ دو پیر کا جانور کیا کیا کرنے کو ہے، دیکھتے جایئے۔

سعید: ہاں صاحب! اس آدم خاکی کا کیا کہنا، تبھی تو اس کو خلیفہ بنایا گیا، ورنہ دوسری مخلوقات کی تو ہمت ہی نہیں ہوتی اور ان کو "فَاَبَیْنَ اَنْ یَّحْمِلْنَهَا" ہی میں نجات نظر آئی، لیکن اس نے اس عظیم الشان ذمہ داری کو قبول کرلیا جب یہ باوجود ضعیف ہونے کے اتنا کودرہا ہے، اگر قوی ہوتا تو کیا کرتا؟ درحقیقت یہ ضعیف اور عاجز صرف خدائی طاقت کے مقابلے میں ہے، ورنہ دوسری چیزوں کے مقابلے میں یہ سب سے قوی معلوم ہوتا ہے۔

رشید: سعید صاحب! کیا آپ نے یہ بات سنی ہے کہ جب سے چاند پر پہونچنے کی خبریں آنی شروع ہوئی ہیں، بعض لوگ بڑے شش وپنج میں پڑ گئے ہیں۔

کوئی کہتا ہے کہ یہ خدائی قدرت میں تصرفات ہیں، انسانیت سے یہ کیسے ممکن ہے، چناں چہ امریکہ میں ایک شخص نے اس پر خودکشی کرلی کہ میں خدائی قدرت میں انسانی دست درازی کو نہیں دیکھ سکتا۔

سعید: رشید صاحب! یہ لوگوں کے جہالت پر مبنی سوالات ہیں آج ہمارا معاشرہ علم سے بہت دور ہے، جب کہ دنیا سائنٹفک لحاظ سے بہت آگے بڑھ چکی ہے، بھلا انسان جس کو ساری دنیا تصرف کے لیے دی گئی ہے، وہ اگر کسی جگہ پر چلا جائے اس سے خدائی نظم میں کیا دخل اندازی ہے، خدا نے تو اس پوری کائنات اور فضاء کو اپنے خلیفہ کے سپرد کر ہی دیا

ہے کہ تم اس کو استعمال کرو اور خلافت کے کام انجام دیتے رہو۔

رشید: سعید صاحب! بعض لوگ سوال کرتے ہیں کہ کیا قرآن انسان کی اس قسم کی ترقیات کی تصدیق کرتا ہے، یا اس نے سیارات کے بارے میں ان کے واقعی احوال وکیفیات سے بحث کی ہے۔

سعید: رشید بھائی! لوگوں کو پہلے یہ سمجھ لینا چاہیے کہ قرآن یا کسی بھی مذہبی کتاب کا یہ ہرگز موضوع نہیں ہے کہ وہ انسانی تمدنی ترقی یا پھر کائناتی اشیاء کے حقائق اور ان کی جزئیات سے بحث کرے، قرآن کا موضوع اور مقصد اصلی جس کے لیے اس کو اُتارا گیا، وہ صرف لوگوں کی ہدایت، مخلوق کو خالق سے جوڑنا، خلیفۂ ارضی کو اس کے فرائض یاد دلانا اور خالقِ کائنات کا معترف بنانا ہے اور ایک صالح معاشرے کو جنم دینا ہے، اس کا موضوع فلسفیانہ گتھیوں کو سلجھانا نہیں ہے، اور نہ اس کے مخاطبین اول اس مزاج کے لوگ تھے۔

رشید: سعید صاحب! اس کا مطلب تو یہ ہے کہ قرآن چاند، ستارے، آسمان وزمین کی کوئی بات ہی نہیں کرتا، حالاں کہ ایسا نہیں ہے قرآن تو بے شمار جگہ ان کا تذکرہ کرتا ہے۔

سعید: رشید صاحب! اصل بات یہ ہے کہ قرآن ان چیزوں کا تذکرہ ضرور کرتا ہے، مگر اپنے ہی موضوع پر استدلال کے لیے نہ کہ فنی لحاظ سے ان کے حقائق بتلانے کے لیے یقیناً قرآن توحید ورسالت اور آخرت پر یقین کے لیے کائناتی جواہر واعراض فلک سمندر پہاڑ سورج وچاند کی مثالیں ذکر کرتا ہے، لیکن محض اس لیے کہ ان کو ایک مکمل نظم میں جکڑا ہوا دیکھ کر انسان اس خدا کا قائل ہو جائے جس نے ان سب کو اپنی قدرت میں رکھا ہے نہ کہ اس لیے کہ ان کا ذکر کر کے قرآن ان کا فلسفہ اور حقائق سمجھائے، زیادہ سے زیادہ وہ اتنی بات کہتا ہے جتنا ان اجسام کے بارے میں مشاہدہ اور عام سمجھ متحمل ہو، چناں چہ قرآن کے استدلال کا نمونہ دیکھئے اس نے اپنے موضوع توحید پر استدلال کرتے ہوئے کہا: "أَفَلَا يَنظُرُونَ إِلَى الْإِبِلِ كَيْفَ خُلِقَتْ... الخ" کیا پیارا انداز ہے، اپنے مخاطب کی استعداد کو سامنے رکھ کر سمجھانے کا، لہٰذا رشید صاحب میرے نزدیک تو قرآن میں کائناتی اجسام کی واقعی تحقیقات دریافت کرنا ایسا ہے جیسے کہ حلوائی

کی دوکان پر کپڑا خریدنے جانا۔

رشید: اچھا تو سعید صاحب! اس سے تو پتہ چلا کہ قرآن میں ایسے اشارات بھی نہیں ہیں جن سے رہنمائی ان چیزوں کے بارے میں ملتی ہو۔

سعید: رشید صاحب! ایسا نہیں بلکہ بات یہ ہے کہ قرآن نے اپنے موضوع اور مقصود کے اثبات کے لیے جہاں کائنات کی ان چیزوں کا ذکر کیا ہے وہاں ان کے کچھ حالات بھی بطور نمونہ ذکر دیئے ہیں، جن سے مقصد اپنے دعوی کا اثبات اور اپنے پرستار کو اس کے نفع کی طرف متوجہ کرنا ہے۔ اسی لیے جب صحابہؓ نے چاند کے گھٹنے بڑھنے کا سوال کیا تو قرآن نے ان کی توجہ اس فلسفیانہ جواب سے ہٹا کر جس سے اس کی روشنی کے گھٹنے بڑھنے کا تعلق تھا نفع کی طرف موڑ دی کہ اس سے موسم حج اور اوقات کو معلوم کرنے کا فائدہ حاصل کرو، باقی غیر مفید سوالات میں مت پڑو۔ مگر اتنی بات ضرور ہے کہ ان چیزوں کے جو کہیں کہیں ضمنی حالات ذکر کئے ہیں ہم ان سے بعض چیزوں کو اخذ کر سکتے ہیں جو آج کی تحقیقات کے عین مطابق ہیں، مثلاً زمین کو قرآن کا گہوارہ کہنے سے اس کے گھومنے کا پتہ چلنا، اسی طرح چاند وسورج کی گردش کے ذکر اور ان کے تیرنے کے ذکر سے ان کا آسمان کے نیچے ہونا اور آسمان میں جڑا ہوا نہ ہونا یا یہ کہ "سَخَّرَ لَكُمْ مَا فِي السَّمٰوَاتِ وَ الْأَرْضِ" میں انسان کے لیے تسخیر کائنات کا اشارہ جس سے چاند پر جانے کا امکان نکلتا ہے وغیرہ وغیرہ؛ یہ وہ اشارات ہیں جن سے بہت سی باتیں سمجھی جاسکتی ہیں۔

رشید: سعید صاحب! ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نئی نئی کھوج انسان کی فطرت ہے۔

سعید: رشید صاحب! جی ہاں اسی لیے تو اس کو حیوانِ موجد کہا جاتا ہے، جو اسی کا خاصہ ہے دوسرے سب حیوانات اس سے کورے ہیں۔

رشید: سعید صاحب! کیا انسان نے یہ ترقی سابقہ دور میں بھی کی ہے۔

سعید: جی ہاں جناب! ہر دور میں مادی، تمدنی، روحانی اور اخلاقی ترقی انسان کرتا رہا ہے، فرق صرف اتنا ہے کہ سابقہ دور میں روحانی اور اخلاقی ترقیات تمدنی اور مادی ترقیات پر غالب تھیں اور انہیں کا دور دورہ تھا، اور انسان اُن کے ذریعہ وہ سب مقامات طے کر رہا تھا، جو آج مادیات کے بل بوتے پر کرنے جا رہا ہے؛ لیکن ناکامیاب ہے؛ پہلے انسان

روحانیت کے زور سے آسمان پر جا چکا ہے، سورج کو روک چکا ہے، دریا ٹھہرا چکا ہے، ہوا پر سواری کر چکا ہے، سیکڑوں میل آواز پہونچا چکا ہے، اور سیکڑوں میل کی چیز بلکہ مغیبات کو دیکھ چکا ہے، اب مادیات کے ذریعہ ان سب چیزوں کو حاصل کرنے جا رہا ہے، جن میں بہت کچھ کامیاب ہو چکا ہے، مگر اتنا نہیں جتنا پہلے روحانیت میں ہوا تھا، یہ ترقیات اس لحاظ سے زیادہ حیرت ناک ہیں کہ ان کا تعلق کسب سے ہے انسان اپنی زندگی میں ان کا پھر اعادہ کر سکتا ہے، اور ہر شخص کے لیے ان کا کرنا ممکن ہے، بخلاف معجزات وکرامات کے کہ وہ خالص ارادۂ خدا پر ظہور پذیر ہونے والی ہیں اور مخصوص حالت میں مخصوص افراد کے ساتھ خاص ہیں کسب کو اس میں کوئی دخل نہیں، نہ اعادہ ممکن ہے۔

رشید: سعید صاحب! بہر حال انسان کی اس چاند کی مہم کو سر کرنے سے خوشی سب ہی کو ہوئی ہے۔

سعید: صحیح ہے، تاریخ کا حیرت انگیز کارنامہ ہے، مگر اس سے زیادہ خوشی انسان کو جب ہوگی جب وہ سنے گا کہ یہ دنیا جس پر میں رہتا ہوں اس پر انسان امن وچین لے آیا ہے، جو چاند سے بھی زیادہ دور جا چکا ہے۔

رشید: سعید صاحب! آپ تو لاجواب آدمی ہیں، آپ کی باتیں کیا ہیں حکمت ریزے ہیں۔

سعید: رشید بھائی! آپ کی ذرہ نوازی ہے، اچھا میں نے آپ کا بہت وقت لے لیا معاف فرمائیں۔ خدا حافظ! السلام علیکم

رشید: وعلیکم السلام۔

(۲۰) کمیونزم اور اسلام

سہیل: جنید صاحب! کیا کبھی آپ نے اس پر غور کیا کہ ہمارے ملک میں جو افلاس غربت اور پس ماندگی ہے، اس کے حقیقی اسباب کیا ہیں، اور اس کا واحد حل کیا ہو سکتا ہے۔

جنید: سہیل صاحب! میں نے اس مسئلہ پر بہت غور کیا اور کافی مطالعہ بھی کیا میری سمجھ میں ایک ہی بات آتی ہے کہ دنیا میں جو امیر وغریب کا فرق ہے، جو ہمیشہ سے چلا آتا ہے اور باوجود کوششوں کے نہ مٹ سکا اور نہ آج مٹ پا رہا ہے، اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ لوگوں نے شخصی ملکیت والے اصولوں کو اپنا رکھا ہے، جس کے نتیجے میں ایک شخص جتنی چاہتا ہے دولت جمع کر لیتا ہے اور وہ سب دولت اس کی کہلاتی ہے وہ خوب عیش کرتا ہے، بخلاف غریب کے، کہ مالدار اس سے بھر پور کام لیتے ہیں، اور اس کی زبوں حالی سے ناجائز فائدہ اٹھا کر بہت کم ان کو اجرت دیتے ہیں، جب کہ وہ اپنا خون پسینہ بہا کر امیر کے لیے کام کرتا ہے، اس طرح وہ بیچارہ ہمیشہ غریب رہتا ہے اور سرمایہ دار ترقی کرتا رہتا ہے، چوں کہ دنیا میں ہر چیز کی قوت خرید پیسے کو تسلیم کیا گیا ہے، تو امیر ہر ایسے موقع کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتا، جہاں کوئی غریب حالات سے مجبور ہو کر اپنی کسی چیز کو بیچتا ہے تو اس سے کم پیسوں میں خرید لیتا ہے، اگر غریب کو قرض کی ضرورت ہو تو امیر اس کی ضرورت سے بھی ناجائز فائدہ اٹھا کر سود کی شکل میں اس کو کم رقم دے کر زیادہ وصول کرتا ہے، آج ساری دنیا میں امیروں کی ریل پیل ہے، غریب سانس توڑ رہا ہے، حکومتیں دکھانے کے لیے ان کے ساتھ ہمدردی کے جھوٹے نعرے لگاتی اور دکھلاوے کے پلان بناتی ہیں، مگر حقیقی بات یہ ہے کہ حکومت خود امیروں کے ہاتھ میں کھیلتی ہے، جہاں تک مذہب اور دھرم کا تعلق ہے وہ بھی اس سلسلہ میں فیل نظر آتا ہے، مذہب نے ایک اور نیا راستہ نکال کر غریب کو تسلی دی کہ اللہ تعالیٰ نے تمہاری قسمت میں غربت لکھی ہے، تمہیں اللہ تعالیٰ کی تقسیم پر راضی رہنا چاہیے، امیروں کی دولت پر لالچ کی نظر نہ ڈالنی چاہئے، یہ

سن کر مذہب پرست غریب بالکل خاموش ہو جاتا ہے، حالانکہ اس کے پسینے سے امیر اپنا گھر بھر رہا ہے، اور اس پر ظلم ڈھا رہا ہے، مگر اس کو تقدیر اور قسمت کی افیم مذہب کے راستے سے کھلادی گئی ہے، اگر کبھی غریب کہتا بھی ہے کہ ہم ہمیشہ سے تکلیف اٹھا رہے ہیں، ہمارے پاس گھر مکان نہیں ہے اور تم لوگ عیش کر رہے ہو، تو مذہب پرست امیر ان کو یہ دلاسا دیتے ہیں کہ تمہیں جنت میں حوریں ملیں گی، وہاں اچھے اچھے مکان اور دودھ وشہد کی نہریں تم کو ملنے والی ہیں، دنیا کے چند روز دشواریوں میں کاٹ دو، حالانکہ مذہب پرست امیر اپنے لیے کبھی یہ نہیں سوچتا کہ میں دنیا میں کچھ تکلیف اٹھالوں آخرت میں اس کا اجر ملے گا، غرض امراء بہت اچھے اچھے آخرت کے خواب دکھا کر غریب کو اپنی سڑی بسی زندگی پر قناعت کے فضائل سناتے رہتے ہیں، اور ان کو اپنا خادم اور مزدور بنا کر خود عیش کے سامان فراہم کرتے رہتے ہیں، یہی اسباب تھے کہ روس کے چند دانشوروں نے جب اس راز کو سمجھا کہ مذہب گھڑا ہی اس لیے گیا ہے تاکہ اس کے نام پر امیر غریب کی گاڑھی کمائی سے عیش کرے اور اس کو جنت کی باتوں میں بہلا کر رکھے۔ تو انہوں نے غرباء کو اس دھوکے سے آگاہ کیا کہ یہ امراء اور اہل مذہب تمہارے ساتھ چالیں چل رہے ہیں۔ تم اٹھو اور مذہب کے خلاف اور سرمایہ داری کے خلاف آواز اٹھاؤ اور دنیا کا وہ عیش جو سب کے لیے یکساں ہے، اس کو حاصل کرو۔ چناں چہ لوگوں نے پہلے پہلے اس مفید مشورے کو نہ سمجھا، مگر جب لوگ اس کی حقیقت سے واقف ہوئے تو وہ زبردست انقلاب آیا کہ امراء کے تمام ہتھکنڈے بیکار ہو گئے، اور بالآخر غرباء اور لیبر کو اپنا حق ملا، اور آج یہ نظام کمیونزم اور اشتراکیت اتنا مقبول ہو گیا ہے کہ ہر ملک کے سنجیدہ عوام اس کی خوبی کے قائل ہوتے جا رہے ہیں۔ اس کی رو سے تمام زمینیں اور اس کی پیداوار ملک کے بسنے والے انسانوں کی ہے، اس میں غریب امیر کی کوئی تفریق نہیں سب پانی پیتے ہیں، سب یکساں کھانا کھاتے ہیں، سب کپڑے پہنتے ہیں وہ لعنت ختم ہو گئی کہ ایک نان شبینہ کا محتاج اور دوسرا شکم سیر، اب ہر شخص کی ضروریات حکومت پوری کرتی ہے، کوئی اپنی نجی ملکیت نہیں بنا سکتا، سب املاک حکومت کے قبضے میں ہیں اور حکومت سب کی کفیل، کسی کو کسی کا دست نگر بننے کی ضرورت نہیں اس لیے سہیل صاحب میں تو اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ عدم مساوات کی جڑیں، بڑی گہری ہیں اشتراکیت سے

پہلے جتنے بھی نظام آئے، سب نے بجائے کم کرنے کے اس کو اور زیادہ بڑھایا ہی ہے، مذہب جس کا دعوی اس کو ختم کرنے کا تھا، اس نے بھی شخصی املاک کو تسلیم کر کے سرمایہ دارانہ نظام کے ہاتھ مضبوط کئے ہیں۔

سہیل: جنید بھائی! آپ نے جتنی باتیں کہی ہیں اس میں مجھے کلام ہے اس میں شبہ نہیں کہ سرمایہ دارانہ ذہنیت نے ہی لیبر اور غرباء کو نقصان پہونچایا اور عدمِ مساوات کے حالات پیدا کئے، مگر آپ کا یہ سمجھنا کہ دنیا میں کامل مساوات کا ہونا ہی افلاس وغربت کا واحد حل ہے یہ غلط ہے، نیز سرمایہ دارانہ ذہنیت میں مذہب کو برابر کا حصہ دار سمجھ کر اس کے اوپر بھی وہی الزامات عائد کرنا جو ایک جابر اور ظالم طبقے پر ہو سکتے ہیں، نامناسب طریقۂ کار اور مذہب کے نظریہ سے ناواقفیت کی علامت ہے؛ سب سے پہلے تو یہ سمجھ لینا چاہئے کہ مساوات اس کا نام نہیں ہے کہ عورت اور مرد، بد اخلاق اور نیک اطوار، شہری اور دیہاتی، بادشاہ اور رعیت، باپ اور بیٹے، استاد اور شاگردان سب کو ایک درجہ میں رکھا جائے، بلکہ فرق مراتب کرنا لازمی ہے ان میں سے ہر ایک کے حقوق ہیں، ہر ایک کا ایک مزاج ہے، جو غذا گھوڑا کھاتا ہے وہ شیر نہیں کھا سکتا، عورت اگر بچہ جنتی ہے تو مرد تو بچہ نہیں جن سکتا، بیٹے کے لیے باپ کا جو مقام ہے وہ بیٹے کو نہیں دیا جا سکتا، اس لیے مکمل مساوات کے جو مدعی ہیں وہ حقائق سے بے خبر ہیں جن ملکوں میں مساوات کا دعوی کیا جا رہا ہے، وہاں منسٹر اور لیبر ایک درجے کے مکان میں نہیں رہتے، عورت کو مرد کے مقابلہ میں نصف تنخواہ ملتی ہے، اس لیے پہلے تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ انسانوں کی عقلوں میں ان کی استعدادوں میں، ان کے طور طریق میں فرق ضرور ہے، اس کو نہیں ہٹایا جا سکتا، البتہ ایک چیز لازمی اور ضروری ہے کہ سب کو روٹی ملے کوئی بھوکا نہ رہے سب کو کپڑا ملے کوئی ننگا نہ رہے، سب کو مکان ملے کوئی فٹ پاتھ پر نہ سوئے، سب کو عورت ملے کوئی پریشان نہ ہو، سب کو روزگار ملے کوئی بے روزگار نہ رہے، امراء کو اس کا قطعاً حق نہ دیا جائے کہ وہ غرباء کا حق مارتے رہیں اور خود عیش کرتے رہیں، جب دنیا کے تمام نظام اس اصول کو جاری کرنے سے عاجز ہو چکے تھے اس وقت اسلام نے انسانوں کی رہبری کی اور بتلایا کہ دیکھو مال و دولت کو اپنی ضروریات سے زیادہ اس درجے جمع مت کرو کہ دوسرے مرتے رہیں اور تم عیش کرو پہلے تو ایک دوسری دنیا کا حقیقی عقیدہ پیش کر کے اس

دنیا کے مال ومتاع سے بے رغبتی قائم کی، پھر مال کو جائز طریقوں سے حاصل کرنے کی
ہدایت دی، جس کی وجہ سے دولت بے اندازہ اور لامحدود جمع ہو ہی نہیں سکتی، پھر اس میں
سے ایک مخصوص رقم نکالنے کو ضروری قرار دیا، اس کے علاوہ مختلف مواقع پر دولت کو
ضرورت مندوں پر خرچ کرنے کو کہا، مزدوروں کو پسینہ خشک ہونے سے پہلے مزدوری
دینے کو کہا، پڑوسی، غریب اور مفلس، یتیم، بیواؤں اور لاوارثوں سے غفلت پر اتنی
وعیدیں سنائیں کہ لوگ دولت کو انہیں کا حصہ سمجھنے لگے اور انہیں کے لیے کمانے لگے اور
اس میں ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی کوشش کرنے لگے، آپ نے کہا ہے کہ
مذہب گھڑا ہی اپنے تعیش کے لیے گیا ہے حالاں کہ انبیاءِ کرام کے واقعات اگر آپ
سنیں اور ان کی غرباء پروری، ایثار و ہمدردی اور مال سے نفرت کو دیکھیں تو آپ پہلی
فرصت میں اپنے اس خیال سے باز آجائیں، اگر مذہب غریبوں کو دھوکہ دینے اور اپنا
پیٹ پالنے کے لیے گھڑا گیا ہوتا تو بانیانِ مذہب کروڑ پتی نظر آتے ان کے محلات ہوتے
وہ دنیا میں عیش کر کے جاتے مگر دنیا جانتی ہے کہ وہ فاقے کر کے پیٹ پر پتھر باندھ کر دنیا
سے چلے گئے، اگر گھر میں ایک درہم یا دینار پڑا تو عبادت چھوڑ کر اس کو خرچ کرنے میں
لگے، آپ کہتے ہیں کہ عقیدۂ آخرت اور جنت اور دوزخ کے خواب صرف غرباء کو اپنی
حالت پر قانع بنانے کے لیے تھے، حالاں کہ انبیاء خود جتنے تقدیر کے قائل اور دوزخ کے
خوف سے جتنے ڈرنے والے تھے، آخرت کی جتنی ان کو فکر تھی، دوسروں میں اس کا
سوواں حصہ بھی نہیں پایا جاتا، اس لیے یہ کہنا کہ مذہب اس مقصد کے لیے گھڑا گیا مذہب
کو بدنام کرنا اور اس سے عدمِ واقفیت کا ثبوت ہے۔

جنید: میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ آپ مذہب کے جن لوگوں کے ان اصولوں اور خود
ان کی جس مخلصانہ زندگی کا ذکر کر رہے ہیں کیا یہ بعد کے لوگوں نے اور آج کے مسلمان
نے اپنی زندگی میں اپنایا؟ کیا مسلمان بادشاہوں کے دور میں اُمراء نے تن پروری نہیں
کی؟ اور غرباء کے جذبات کو پامال نہیں کیا؟ یقیناً کیا۔ لہٰذا جب عملاً مذہب کسی
معاشرے کو ان اصولوں پر ڈھالنے میں فیل ہوجائے، جو اس نے وضع کیے تھے، پھر
لامحالہ ہم کو کسی دوسرے نظام کا سہارا لینا پڑے گا۔

سہیل: یقیناً پہلے لوگوں نے ایسے معاشرے کو جنم دیا جنہوں نے برسہا برس تک غریب

امیر کی تفریق مٹا کر انسانی حقوق سے سب کو نوازا۔ ہاں! اگر بعد کے لوگوں نے ان
قوانین پر عمل نہیں کیا تو یہ ماننے والوں کی خرابی ہے نہ کہ نفس قانون کی لہٰذا ہونا تو یہ
چاہئے کہ اس قانون کی ترویج کی پوری کوشش کی جائے، جس کی رواداری اور حقوق
شناسی سے برسوں لوگوں نے فائدہ اٹھایا تھا نہ کہ خود اس کو برا کہا جائے۔

جنید: میں آپ سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ مذہب انسان پر طاقت کا استعمال نہیں کرسکتا،
وہ صرف اخلاقی دباؤ ہی ڈالتا، اور آخرت کے بُرے نتائج سے ڈرا سکتا ہے، اور ظاہر ہے
کہ ہر شخص ایسا نہیں جو صرف آخرت کے خوف سے غرباء کشی زراندوزی سے بچ جائے،
اس لیے کیوں نہ تمام املاک اور پیداوار کو مشترک قرار دے کر حکومت کی مِلک قرار دے
دیا جائے، تاکہ کسی شخص کو زراندوزی کا موقع ہی نہ ملے، اس سے ایک بڑا فائدہ یہ بھی
ہوگا کہ کسی کو اپنی روزی کی انفرادی فکر بھی نہیں رہے گی۔

سہیل: ہم آپ سے پوچھتے ہیں کہ اگر آپ کے ذہن میں یہ بات ہے کہ بلا حکومت کی
قوت کے محض مذہبی ترغیبات کے ذریعہ لوگوں کو زراندوزی سے نہیں روکا جاسکتا ہے، تو
پھر حکومت خود ہی اسلامی اصولوں کو حکومت کا قانون کیوں نہیں بنالیتی تاکہ وہ اپنی قوت
کے ذریعہ ان قوانین کو نافذ کرسکے۔

جنید: مگر اس صورت میں ایک دشواری یہ ہے کہ ایک ملک میں مختلف مذاہب کے لوگ
بستے ہیں اور ہر مذہب کے لوگ اپنے مذہب کے قوانین کو اچھا سمجھتے ہیں۔ اگر ایک
مذہب کے اصولوں کو سارے ملک میں رائج کیا گیا تو دوسرے مذہب والوں کے لیے
ناقابل قبول ہوں گے، بلکہ ہمارا دعویٰ تو یہ ہے کہ ایک مذہب کے لوگ بھی اتنے فرقوں
میں منقسم ہیں کہ ان کا خود ایک مسلمہ اصول پر جمع ہونا دشوار ہے، چناں چہ صدر ایوب نے
پاکستان میں اسلامی قانون لانے میں اسی دشواری کا اظہار کیا تھا، بلکہ اگر یہ دعویٰ کردیا
جائے کہ دنیا میں بنائے مخاصمت ہی مذاہب ہیں، دنیا میں جتنی جنگیں مذہب کی بنیاد پر
لڑی گئیں، اتنی کسی اور وجہ سے نہیں لڑی گئیں ہر مذہب والے کو دوسرے مذہب والے
سے دشمنی ہے پھر ہر مذہب میں مختلف فرقے ہیں جو ایک دوسرے کے درپے آزار ہیں
اسی صورت حال کو دیکھ کر کچھ لوگ اس فیصلے پر آمادہ ہوئے کہ جو چیز ذریعۂ فساد ہو اسی کو
ختم کردیا جائے، اور سارے انسان بحیثیت انسان ہونے کے ایک ہوں، لہٰذا دنیا کو

انسان ہونے کے ناطے ایک پلیٹ فارم پر آ جانا چاہیے، ورنہ مذاہب ایک پلیٹ فارم پر
نہیں لا سکتے بلکہ خود قرآن سے پتہ چلتا ہے کہ لوگ مذہب سے پہلے ایک پلیٹ فارم پر
تھے، مذہب نے آکر ان کو بکھیر دیا۔ "کَانَ النَّاسُ اُمَّۃً وَّاحِدَۃً۔۔۔الخ" پتہ چلا کہ
مذہب لوگوں میں خود اختلاف ڈالتا ہے اور منافرت پیدا کرتا ہے، جس کا مشاہدہ ہم
رات دن کرتے ہیں۔ ہندو بھی کہتا ہے کہ ہندو مذہب لڑنے کو نہیں کہتا، مگر پھر بھی وہ
مسلمان سے صرف اس لیے لڑتا ہے کہ اس کا مذہب اسلام ہے۔ اسی طرح مسلمان نعرہ
تو یہ لگاتا ہے کہ مذہب لڑنا نہیں سکھاتا، مگر ہندو کو محض اس لیے حقیر و ذلیل جانتا ہے کہ اس
کا مذہب اسلام نہیں ہے۔ بلکہ قرآن میں ایسی آیتیں موجود ہیں، جن میں یہ مذکور ہے کہ
مشرکین کو جہاں پاؤ، وہ جہاں مل جائیں، ان کو کاٹ کر پھینک دو۔ "وَ اقْتُلُوا
الْمُشْرِکِیْنَ حَیْثُ وَجَدْتُّمُوْھُمْ۔۔۔الخ" بھلا جو مذہب دوسرے مذہب کے
لیے ایسے احکام دیتا ہو، وہ سارے مذاہب کے لوگوں کو جو ایک ہی ملک کی آبادی میں
ہیں کیسے گلے لگا سکتا ہے اور اس کو پورے ملک کا قانون کیسے بنایا جا سکتا ہے، معلوم ہوا
کہ سب سے بہتر شکل یہی ہے کہ مذہب کو درمیان سے ہٹا کر انسانیت ایک "مذہب"
بنا لیا جائے، جس میں سب انسان برابر ہوں اور ان کی ساری پیداوار خواہ اولاد ہو یا
کاشت، حکومت اپنے ہاتھ میں لے، تاکہ نہ کوئی بھیک مانگتا نظر آئے اور نہ کوئی ظلم کرتا
ہوا، نہ کوئی رشوت لے سکتا ہو اور نہ زر اندوزی کر سکتا ہو، میں سمجھتا ہوں اس سے بہتر کوئی
شکل دنیا میں امن لانے کے لیے نہیں ہو سکتی۔

بشیر: جنید بھائی! میں بہت دیر سے آپ دونوں کی گفتگوں سن رہا ہوں، آپ نے جو بات
فرمائی کہ ایک مذہب کے قانون کو رائج کرنے میں دوسرے مذاہب کے لیے دشواری
ہے، میں آپ کو بتلاتا ہوں، شاید آپ کو سن کر حیرت ہوگی کہ دنیا میں اسلام ہی وہ واحد
مذہب ہے جس کے پاس عبادت کے علاوہ دنیا کے تمام شعبہائے زندگی کے لیے مستقل
قانون و دستور موجود ہے، دوسرے مذاہب صرف چند عبادات کے ڈھنگوں اور رسم
و رواج کے بعض قوانین پر ہی مشتمل ہیں۔ یہ ہر مذہب کے ذاتی مسائل ہیں، اس میں
حکومتیں اپنے یہاں کے باشندوں کو اپنے اپنے مذہب کے مطابق عبادات و رسوم کی
اجازت دیتی ہیں، حالاں کہ گورنمنٹ کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔

رہ گئی یہ بات کہ خود مسلمانوں کے اندر مختلف فرقے، تو آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ
مسلمانوں میں کتنے ہی فرقے ہوں مگر قانون میں، تعزیرات میں، اصولوں میں، ان کا
کوئی اختلاف نہیں ہے، اختلاف صرف ان چیزوں میں ہے جن میں ہر ایک کو آزادی
دی جا سکتی ہے کہ جو چاہے کرے، کسی کی مزار پرستی اور کسی کے اس کو برا سمجھنے سے سیاسی
قوانین پر کوئی زد نہیں پڑتی، آپ مذہب کو ختم کر کے ساری انسانیت کو ایک پلیٹ فارم پر
لانے کی بات کر رہے ہیں، میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ کیا وہ ملک جنہوں نے مذہب کو
چھوڑ کر کمیونزم کا راستہ اختیار کیا ہے، وہ خود بھی ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو سکے؟ روس اور
چین مذہب کو ختم کرنے کے بعد بھی لڑ رہے ہیں اگر مذہب لڑائی کرتا تھا تو اب یہ
منافرت کون پیدا کر رہا ہے؟ کون سی چیز مانع ہے؟ کیوں ایک دوسرے کی شکل دیکھنا
نہیں چاہتا ہے؟ بلکہ اسلام سب کو ایک پلیٹ فارم پر لانا چاہتا ہے۔ اس نے جب دیکھا
کہ اب دنیا کے فاصلے کم ہوتے جا رہے ہیں، دنیا ایک ہونے جا رہی ہے تو اس نے
ساری دنیا کو دعوت دی کہ آؤ ایک درمیانی راستے پر جمع ہو جائیں، مگر اس دعوت عام کو سن
کر لوگوں نے اپنی سیادت و قیادت کو برقرار رکھنے کے لیے اسلام ہی کی مخالفت شروع
کر دی۔ اسی کو قرآن نے کہا ہے کہ سب لوگ ایک غلط راستے پر جمع ہو گئے تھے، اللہ نے
انبیاء کو بھیجا یہاں تک کہ سعادت مندوں نے ان کی بات سنی اور بدبختوں نے انکار کیا،
اسی حالت کو آیت: "وَ کَانَ النَّاسُ اُمَّۃً وَّاحِدَۃً۔۔۔الخ" سے تعبیر کیا ہے، جس کو
آپ غلط طور پر اپنے استدلال میں پڑھ رہے ہیں۔ اسی طرح مشرکین کو قتل کرنے کا حکم
جو اسلام نے دیا ہے وہ صرف اسی صورت میں ہے جب یہ جماعت کسی مذہب کے
راستے میں اتنی زبردست رکاوٹ بن رہی ہو کہ نہ خود اس کے ماننے والوں کو کبھی چین
سے بیٹھنے دے اور نہ خود اپنی جماعت کے ان سنجیدہ لوگوں کو اپنے جبر و ظلم سے اسلام کے
لیے قریب آنے دے رہی تھی جن کے دل اسلام کے لیے بے قرار تھے افراد کی آزادی
سلب کرنے والی یہ جماعت جن کا رات دن کا مشغلہ ہی ظلم بن گیا تھا اور صرف محض عناد و
دشمنی میں یہ روش اختیار کر رکھی تھی ان حالات یعنی حالاتِ جنگ میں یہ حکم تھا نہ کہ ان
حالات میں جب کہ ہر مذہب والا کسی دوسرے مذہب کو بلا نقصان پہنچائے رہنا چاہتا
ہو؛ کیا ایسے موقع کے لیے قرآن میں "لَکُمْ دِیْنُکُمْ وَلِیَ دِیْنِ" والی آیات نہیں ہیں

اور غیر قوموں کے ساتھ اسلام اور مسلمانوں کی رواداری سے اسلامی تاریخ پُر نہیں ہے؟
اسلام نے یقیناً شخصی ملکیت کو تسلیم کی ہے، مگر اسلام نے دولت کی تقسیم کا نظام ایسا پیش کیا
ہے کہ اگر دنیا اس پر توجہ دے تو اس سے بہتر کوئی نظام نہیں ہو سکتا اور اس کو ایسا ہونا بھی
چاہیے تھا اس لیے کہ وہ خدا کا بنایا ہوا نظام ہے، جب کہ دنیا کی سارے نظام انسانوں
کے خود ساختہ ہیں، اور ظاہر ہے کہ اللہ اپنے بندوں کی ضرورت کو جتنا سمجھ سکتا ہے، انسان
اس کو نہیں سمجھ سکتا۔ اسلام نے زکوٰۃ کو ضروری قرار دے کر دولت کو غریب تک پہونچایا؛
پھر صدقات، فطرہ، عشر، جانوروں کی زکوٰۃ اور عام تبرعات کی اتنی ترغیب دی کہ لوگ
دولت سے نفرت کرنے لگے، پڑوسیوں کے وہ حقوق ذکر کیے کہ رشتہ داروں کو یہ خطرہ
ہونے لگا کہ کہیں یہ ہمارے ساتھ وراثت میں شریک نہ ہو جائیں پھر زر اندوزی احتکار
وغیرہ کی حرمت بیان کی، تاکہ معاشرے میں اسبابِ حیات مخصوص ہاتھوں میں رُک کر
نہ رہ جائیں، حاکم کو آخرت کا اتنا فکر مند بنایا، اور رعایا کی پریشانی کا اتنا خیال رکھنے کو کہا
کہ حضرت عمرؓ فرماتے تھے کہ فرات کے کنارے ایک کتا بھی اگر بھوکا مر گیا تو عمرؓ سے اس
کا سوال ہوگا، اور یہ سب دِین ہے اسلام کے عقیدۂ آخرت کی کہ مسلمان اس عالم کے
بعد ایک دوسری دنیا سے خائف ہے، اس کو وہاں جا کر حساب دینا ہے؛ اسی عقیدہ کی وجہ
سے وہ ان خرابیوں سے بچنا لازمی سمجھتا ہے۔

جنید: مولانا صاحب! مگر میں آپ سے سوال کرتا ہوں کہ یہ بالکل صحیح ہے کہ اسلام نے
امیر کو مجبور کیا ہے کہ وہ دولت کو جمع نہ کرے بلکہ اس کو غریب تک پہنچائے، لیکن دوسروں
کا دست نگر بن کر، یا دوسروں کے مال سے پلنے کا احساس، نفسیاتی طور پر غریب میں ایسا
احساس کمتری اور کہتری پیدا کرے گا جس کی وجہ سے وہ امیر کے سامنے سر بلند کر کے
بولنے سے شرم محسوس کرے گا، اس کو کیسے روکا جا سکتا ہے، اس لیے کیوں نہ ایسا کیا جائے
کہ مال کو حکومت کے ہاتھ میں جمع کر دیا جائے اور وہاں سے سب کو ملے اور یہ احساس
ہی ختم ہو جائے کہ بعض اپنے آپ کو دینے والا سمجھ کر بڑائی میں پھولے نہ سمائیں اور
دوسرے اپنے آپ کو لینے والا سمجھ کر احساسِ کہتری کا شکار رہیں۔

بشیر: آپ کو سب سے پہلے یہ سوچ لینا چاہیے کہ اسلام نے عقیدۂ آخرت اور خدا کا
خوف طاری کر کے مسلمانوں کو اتنا نیک بنایا تھا کہ جب تک خدا کے خوف کا احساس

مسلمانوں میں باقی رہا اس وقت تک یہ حال تھا کہ دینے والے میں وہ فروتنی اور عاجزی،
غرباء کی طرف سے مال کو قبول کرنے پر امراء میں وہ احسان مندی پیدا ہوتی تھی کہ
دیکھنے والا یہ سمجھے کہ دینے والا دینے والا نہیں بلکہ لینے والا ہے، چناں چہ تاریخ میں وہ
واقعات موجود ہیں کہ غرباء برسرِ مجلس امراء کو اس طرح ڈانٹ دیتے تھے کہ کوئی محسوس
نہیں کر سکتا تھا کہ یہ کسی احساسِ کہتری کا شکار ہیں، پھر کیوں نہ اس عقیدے کو زندہ
کر کے اور اس پر یقین کو پختہ کر کے اس نفع کو حاصل کیا جائے جس کی وجہ سے یہ سوال
ہی نہ پیدا ہو کہ ایک زکوٰۃ اور صدقہ خور ہے اور دوسرا مالدار عزت والا۔

جنید: میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ اگر کمیونیزم کا طریقہ کار اپنا لیا جائے تو کیا نقصان
ہے۔

بشیر: سب سے بڑا نقصان تو یہ ہے کہ کہ لوگ خدا کو بھول جائیں گے اس لیے کہ جب
آدمی خود کے لیے کماتا ہے تو اس کو نفع نقصان کا خطرہ رہتا ہے، تو وہ ہر وقت اللہ کی طرف
لو لگائے رہتا ہے، وہ سوچتا ہے کہ دعائیں مانگو تا کہ بارش ہو، گناہوں سے بچو تا کہ اللہ
برکت دے، مگر جب سمجھ لے گا کہ حکومت خود علاج، غذا، مکان، کپڑے کی ذمہ دار ہے
تو پھر اس کو اللہ سے اپنی ضروریات کے لیے لَو لگانے کی کیا ضرورت، بلکہ خطرہ ہے کہ
کہیں وہ حکومت اور وطن کو خدا نہ بنا لے۔

نیز اس نظام میں خود اقتصادی لحاظ سے بھی بڑا نقصان ہے وہ یہ ہے کہ ملک کی
پیداوار گھٹ جائے گی، اس لیے کہ آدمی جب اپنے لیے کوئی کام کرتا ہے تو انتہائی دلچسپی
سے کرتا ہے، چناں چہ ایک کتے نے ایک ہرنی سے کہا تھا کہ تم مجھ سے زیادہ تیز کیسے
بھاگتی ہو حالاں کہ میں دودھ جلیبی کھاتا ہوں اور تم گھاس پتی؟ ہرنی نے کہا کہ تم مالک
کے لیے دوڑتے ہو اور میں اپنے لیے چناں چہ اس کا بین ثبوت یہ ہے کہ روس میں پیدا
وار اس دور کے مقابلے گھٹ گئی ہے جو شخصی ملکیت کے زمانے میں تھی، خود ہم اپنے ملک
میں دیکھتے ہیں کہ حکومت کے وہ فارم جو ہزاروں ایکڑ پر مشتمل ہیں، ان میں اتنی پیداوار
نہیں ہوتی جتنی کہ لوگ اپنے اس سے بہت کم ایکڑ کے کھیت میں پیدا کر لیتے ہیں۔ وجہ
وہی ہے کہ حکومت کا کام آدمی اتنی دلچسپی سے نہیں کرتا جتنا کہ خود اپنا کام۔ چنانچہ
کمیونسٹ ملک اس غلطی کو سمجھنے لگے ہیں اور روس نے اب اسی نقصان کی وجہ سے لوگوں

کے لیے کچھ شخصی ملکیت کو تسلیم کرلیا ہے۔

اور روس اور چین کا یہی جھگڑا ہے کہ چین کہتا ہے روس کے مقابلے میں ہمارے یہاں کمیونزم اپنی اصل شکل میں ہے، پھر یہ کہ کیمونیزم کے اندر امیر ہمیشہ غریب پر خفا رہتا ہے کہ یہ ہماری دولت کے مالک بن بیٹھے جب کہ اسلامی نظام میں ایسا نہیں ہے، وہاں غریب کے ساتھ جہاں مالدار کی ہمدردی رہتی ہے، وہیں غریب بھی احسان مند رہتا ہے، پھر یہ کہ اگر حکومت مال کو تقسیم کرے تو اس میں وہ ثواب وایثار وہمدردی دوسروں کا احساس جو اعلیٰ اخلاق ہیں ان کا کیا معیار باقی رہے گا یہ اخلاق اسی وقت اچھے سمجھے جاتے ہیں جب کہ آدمی اس کے خلاف کرنے پر قادر ہو پھر بھی خدا کے خوف سے نہ کرے، لیکن حکومت کی طرف سے تمام اسبابِ حیات پر قبضہ ہوجانے کے بعد امیر غریب کو اضطراری طور پر دے گا نہ کہ اختیاری طور پر اور ظاہر ہے کہ ثواب اختیاری اعمال پر ہے نہ کہ اضطراری اعمال پر۔

جنید: بشیر صاحب! آپ کا بہت بہت شکریہ، آج آپ سے اس عنوان پر تبادلۂ خیال کر کے بڑی خوشی ہوئی، میں انشاء اللہ اپنے نظریہ پر نظر ثانی کروں گا۔۔۔۔۔۔۔
السلام علیکم ورحمۃ اللہ

سہیل وبشیر: وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔

(۲۱) بانی جماعت اسلامی اور اکابر

خلیل: حمید بھائی! فرمایئے تمہارا مودودی کیا کہتا ہے؟

حمید: خلیل صاحب! آپ کیا کہہ رہے ہیں، آپ کو شرم نہیں آتی کہ آپ عالم اسلام کے اتنے بڑے آدمی جس کو دنیا مفکر اسلام کے نام سے پکارتی ہے، آپ اس کا نام اس طرح لے رہے ہیں جیسے کسی معمولی اور حقیر آدمی کا لیا جاتا ہے، آخر ادب وتہذیب بھی کوئی چیز ہے یا نہیں۔

خلیل: ارے صاحب! کیا ہوگیا، میں نے کیا کہہ دیا، کونسی ایسی گستاخی کر ڈالی کہ آپ بات کرتے ہی مجھے آڑے ہاتھوں لے رہے ہیں۔

حمید: جی ہاں! آپ نے بہت بڑی گستاخی کی ہے؛ اتنے زبردست اور مقبول ترین آدمی کا نام، نہ شروع میں جناب نہ بعد میں صاحب۔ اس سے بڑی گستاخی کیا ہوگی۔ آپ کے مقابلے میں یقیناً ان کا مرتبہ اتنا بڑا ہے جتنا کہ ایک پتھر کے مقابلہ میں ہمالیہ کا۔ آپ کا یہ رویہ چھوٹا منہ بڑی بات ہے۔

خلیل: حمید بھائی! آپ کی یہ بات درست ہے مگر میں آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا صحابۂ کرام کا مرتبہ خود مودودی کے مقابلہ میں وہ نہیں ہے جو آپ میرے اور ان کے مابین قائم کر رہے ہیں، بلکہ اس سے بھی ہزار گنا فرق ہے، جب یہ بات صحیح ہے تو اس ادب کا مکلّف آپ مودودی کو کیوں نہیں بناتے کیا خلافت وملوکیت میں عثمان غنیؓ کے لیے قصداً خطا کار کہنے والا شخص چھوٹا منہ بڑی بات کا مرتکب نہیں ہے؟ کیا صحابہ کو معیار حق نہ ماننے والا شخص گستاخ نہیں ہے؟ کیا یونس علیہ السلام کو بے صبر کہنے والا شخص بے ادب نہیں ہے؟ اگر نہیں ہے تو آپ مجھ کو ان کے مقابلے میں کیسے گستاخ اور بے ادب کہہ رہے ہیں؟

حمید: خلیل بھائی آپ سے سمجھنے میں غلطی ہورہی ہے، بات تو نام لینے اور پکارنے میں چل رہی ہے آپ تو اُس طرف چلے گئے جو علامہ مودودی صاحب نے اپنی تحقیق کے بعد اور دلائل کی روشنی میں ثابت کئے ہیں، ان سے یہاں کیا بحث ہے، گفتگو تو نام لینے

میں چل رہی ہے، کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ مودودی صاحب نے کسی صحابی یا ذی وقعت انسان کا نام بے ادبی یا گستاخانہ انداز میں لیا ہے۔

خلیل : اجی میاں! آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ کسی کا نام ادب واحترام سے لیتے ہوئے بھی اس کے بارے میں وہ کلمات جو آج تک کسی نے نہ کہے ہوں اور جن کے انداز سے بد گمانی کی بو آتی ہو وہ بھی گستاخی ہے، اس کی مثال ایسی ہے جیسے آپ کسی سے کہیں کہ حضرت مولانا صاحب آپ کی ڈاڑھی میں چوہا گھسا ہے؛ ظاہر ہے کہ نام تو احترام سے لیا مگر آگے بات ایسی کہی جس سے توہین ٹپک رہی ہے۔

حمید : خلیل صاحب! ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ تو مودودی صاحب سے جلے بھنے بیٹھے ہوئے ہیں، نہ معلوم کہاں سے آپ نے ان کے بارے میں یہ گمان قائم کرلیا ہے، اسلام کا بے لوث سچا خادم جس نے اپنی تحریر سے پوری دنیا میں تہلکہ مچادیا، ساری دنیا ان کو داد دے رہی ہے اور اس کا لوہا مان رہی ہے، لیکن آپ ہیں کہ چھوٹی چھوٹی باتوں کو لیے بد گمان ہو رہے ہیں۔

خلیل : جناب! بدگمان ہونے کی بات ہی ہے، جس نے مسلمان کو تمام پاکباز ہستیوں سے بدگمان کردیا ہو، جس نے صحابہ تک کو امت کی نگاہ میں مشکوک کردیا ہو، جس نے صوفیاء اولیاء کو جوگی بیراگی بنادیا ہو، جس نے عبادت گاہوں اور خانقاہوں کو مٹھوں اور راہبوں کی کٹیوں سے تشبیہ دی ہو، جس کو اللہ کا ذکر وتسبیح کرنے والے لوگ نہ بھاتے ہوں جس کو خدا کی یاد اور آخرت کی تیاری سے زیادہ دنیا اور مادی ترقی کی فکر ہو، جس کو حکومت الٰہیہ کے خواب ہی نظر آتے ہوں، جو لوگوں کے چہروں لباس اور بود وباش کے بجائے حکومت الٰہیہ کو ملک کے در ودیوار پر لادنا چاہتا ہو۔ ارے! پہلے الٰہی حکومت اپنی ڈاڑھی اپنی وضع قطع پر تو قائم کرو، جب ملک وحکومت پر اس کے قائم ہونے کے خواب دیکھنا دنیا جانتی ہے کہ پہلے فرد کی اصلاح ہوتی ہے پھر جماعت کی نہ کہ پہلے جماعت کی پھر فرد کی، کیا ان سب باتوں کے باوجود آپ مجھ کو ان سے بدگمان ہونے سے، روک رہے ہیں۔

حمید : خلیل بھائی! ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے مولانا مودودی صاحب کی تحریروں کا مکمل مطالعہ کیا ہے، اچھا میں آپ سے صرف اس بات کی وضاحت چاہتا ہوں کہ انہوں نے بزرگان دین سے لوگوں کو کیسے برگشتہ کردیا ہے۔

خلیل : حمید بھائی! آپ خوب جانتے ہیں کہ آج کے دور میں مسلم قوم کا کیا حال ہے، وہ دین اور اہل دین سے بہت دور ہوتے جارہے ہیں، بڑی مشکل سے ان کو دین اور اہلِ دین سے جوڑنے کی کوشش کی جارہی ہے، لوگ خود دین کا مطالعہ کرتے نہیں اور جو کرتے بھی ہوں گے ان کے لیے کیا گارنٹی ہے کہ وہ صحیح سمجھ بھی لیں گے۔ اس مشکل میں لوگوں کو دین سے لگاؤ رکھنے کے لیے اہل اللہ اور اولیاء اللہ سے جوڑا جاتا ہے تاکہ وہ ان کی صحبت اور ان کے سمجھانے بجھانے سے کچھ دین سے قریب آجائیں، اس کے علاوہ عوام کی اصلاح کی کوئی شکل نہیں تھی، ہم لوگ نبیؐ کے زمانے سے بہت دور ہوچکے ہیں، اب اس جیسی طلب وتڑپ کہاں، اس لیے ضروری تھا کہ اولیاء اللہ نے اصلاح نفس کے لیے یا تزکیۂ باطن کے جو طریقے بتلائے ان کو اختیار کریں۔

مگر آپ کو معلوم ہے کہ آپ کے مودودی صاحب نے کیا غضب کیا، تصوف کے خلاف اور صوفیائے کرام وخانقاہوں کی ایسی بھدی تصویر لوگوں کے سامنے پیش کی کہ لوگ ان سے نفرت کرنے لگے، خانقاہوں کو دوکانیں کہنے لگے، پیری مریدی کو دولت کمانے کا جال اور پھندے کہنے لگے، صوفی ازم کو بدھ دھرم کا چربہ کہا جانے لگا، بلکہ بعض مودودی صاحب کے چیلے چپاٹے تو برملا کسی بھی بڑے سے بڑے بزرگ کے بارے میں کہہ دیتے کہ انہوں نے اسلام کو سمجھا ہی نہیں، بھلا بتاؤ جن کی زندگی اتباع شریعت اور ذکر وفکر میں گذری ان کے بارے میں یہ کہنا کہ اس جماعت نے اسلام کو سمجھا ہی نہیں، کیا عوام یہ سن کر پھر کسی کو اچھا سمجھیں گے، کسی سے فائدہ اٹھائیں گے، کیا ان کا اعتماد تمام سے نہیں اٹھ جائے گا، لوگ تھوڑا ذکر وشغل ان حضرات کی صحبت میں کر لیتے تھے، ان صاحب نے ان سے بھی بدظنی قائم کرادی اور تمام سلاسل تصوف کو مشکوک قرار دے دیا۔

حمید : اچھا تو خلیل بھائی میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ کیا جب کوئی چیز قرآن وحدیث میں نظر نہ آئے اور کسی طبقے کی ذہنی اپج معلوم ہو تو اس کی نشاندہی کرنا بھی غیر اسلامی رویہ ہے؟ جب ایک شخص قرآن وحدیث کے گہرے مطالعہ کے بعد ایک چیز کو نہیں پاتا اور لوگ پکڑے بیٹھے ہوں تو کیا اس شخص کا یہ کہنا غلط ہے کہ یہ چیز اس شکل میں قرآن وحدیث میں نہیں ملی۔ اور نہ قرآن وحدیث کا مقصود ہے بلکہ اس کی شکل وصورت اگر ملتی بھی ہے تو وہ ہندو ازم یا بدھ ازم میں ملتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ لوگوں کا اچھے کام میں لگنا جب کہ قرآن حدیث میں وہ شکل نہ ہو وہ غلط ہی ہے، کیا آپ بدعتی حضرات کی خرافات

کو جنہیں وہ دین ہی سمجھ کر کرتے ہیں اسی بنا پر بُرا بھلا نہیں کہتے۔

خلیل : حمید صاحب! میں آپ سے سوال کرتا ہوں کہ کیا فقہ کے یہ چار طریقے جوان مشہور ائمہ سے چلے ہیں، اپنی پوری جزئیات کے ساتھ کتاب اللہ یا حدیث میں موجود ہیں۔ ظاہر ہے کہ موجود نہیں بلکہ یہ جزئیات ائمہ نے کتاب اللہ و حدیث میں تتبع و تلاش کر کے کسی کو کسی کلیہ سے کسی کو کسی علت کے تحت آنے کی وجہ سے کسی کو قیاس سے کسی کو اجماع کے ذریعہ مستنبط کیا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ فقہ کی تدوین کی غرض مخلوق اور مکلفین کے اعمال کی اصلاح ہی کرنا ہے تا کہ انسان اپنے اعمال کی حلت و حرمت کی حدود کو پہچان کر عمل کرے اور خدا کو راضی رکھے، جب فقہاء کے لیے یہ استنباط اور استخراج جائز ہے تو پھر اولیاء اللہ کو تزکیۂ باطن، ربط مع اللہ اور اللہ کا قرب و خدا کی یاد کے لیے مراقبہ و وظائف اور اس کے لیے لوگوں کی نفسیات کو سامنے رکھ کر اصلاح کی صورت نکالنے کی اجازت کیوں نہیں؟ جب کہ وہ شکلیں قرآن و حدیث کا منشاء تعلق مع اللہ کو ہی مضبوط کرنا ہے چاہے، قادری سلسلہ ہو یا سہروردی یا چشتی یا نقش بندیہ، کیا ان سلسلوں سے فائدہ نہیں ہوا ہے؟ کیا لاکھوں انسانوں نے اپنی باطنی اصلاح ان طریق سے نہیں کی ہے کیا، ان سب حضرات نے اسلام کو نہیں سمجھا تھا؟ کیا صرف مودودی ہی اسلام کو سمجھے ہیں، اگر فقہائے اربعہ کو حلت و حرمت کے مسائل نکالنے کا حق ہے اور ایک دوسرے سے اپنے مسلک میں اختلاف کا حق ہے تو ان بزرگانِ کرام کے چاروں سلسلوں کو بھی حق ہے، تزکیۂ باطن کے لیے وہ جو راہ اختیار فرمائیں گے لوگ اپنی مناسبت کے لحاظ سے جس سے چاہیں فائدہ اٹھائیں۔

حمید: خلیل بھائی! مجھے آپ کی گفتگو سے اتنی بات سمجھ میں آئی کہ اولیاء اللہ اور خصوصاً وہ اولیاء اللہ جو عالم دین بھی ہیں لوگوں کو ان سے استفادہ سے نہ روکنا چاہئے اور نہ ایسی باتیں کہنی یا لکھنی چاہئے جس سے لوگ ان حضرات کو شک کی نگاہ سے دیکھیں، اس روشنی میں علامہ مودودی کو غلطی پر سمجھتا ہوں، مگر کیا آپ ان کی ان تحریروں کی بھی داد دینے اور ان سے فائدہ اٹھانے کے لیے تیار نہیں، جن میں انہوں نے اسلامی اجتماعیات پر سیر حاصل بحث کی ہے، کمیونزم کی مخالفت میں سر دھڑ کی بازی لگا دی ہے، منکرین حدیث اور قادیانیوں کے پرخچے اڑائے ہیں کفر و الحاد کی دھجیاں بکھیری ہیں، مسلم نوجوانوں میں بیداری کی نئی روح پھونک دی ہے۔

خلیل: یقیناً ہم ان کی تحریروں کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، انہوں نے سود، حقوق الزوجین پر بڑی اچھی کتابیں لکھی ہیں، مگر ان کی تحریروں کو اس زاویہ سے ہم دیکھنے کے لیے قطعاً تیار نہیں کہ اپنے اسلاف کے کارنامے اس کے سامنے ہیچ نظر آئیں، اسلاف نے وہ کام انجام دیئے ہیں کہ ہم تاریخ کے سامنے سینہ سپر ہو کر کہہ سکتے ہیں کہ وہ اسلام کے بڑے خیر خواہ تھے اور سچے خادم تھے، مودودی صاحب نے انہیں باتوں کو نیا لباس پہنایا ہے، جن کو اسلاف اپنی بھولی بھالی زبان میں کہہ یا لکھ گئے تھے۔ ہمیں کسی سے مرعوب ہونے کی ضرورت نہیں ہے، ہم جس جماعت یا اسلاف سے وابستہ ہیں ان کی افادیت اتنی عظیم الشان ہے کہ ہم کو کسی شخص کی خدمت یا افادیت مرعوب نہیں کر سکتی، اکیلے اشرف علی تھانویؒ نے ہندوستانی مسلم قوم کو جو فائدہ پہنچایا ہے وہ سیکڑوں اشخاص کی خدمت پر بھاری ہے، ہمارے اسلاف کا ایک ایک شاگرد مستقل ایک ایک مدرسہ لیے بیٹھا ہے۔ کیا ہندوستان کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے یہ مدارس جو اسلامی عقائد و اعمال، حدیث و قرآن کی صحیح ترجمانی کر رہے ہیں، یہ کم خدمتیں ہیں۔ پھر ہمیں کیا ضرورت ہے کسی نو پید ڈگڈگی بجانے والے کی آواز پر اتنے مست ہو جائیں کہ صدیوں کی خدمات پر پانی پھیر دیں، ٹھیک ہے ہر شخص اپنے دائرے میں اسلام کی خدمت کر رہا ہے، اس کو کرنے کا حق ہے، اس کو سراہا ہی جائے گا۔ مگر اس کا حق قطعاً نہیں دیا جائے گا کہ دوسروں کی صدیوں کی خدمات کو اس کے سامنے ہیچ سمجھ لیا جائے یہ انتہائی مرعوب کن بات ہوگی، اللہ نے ہمارے دامن کو بھی، اسلاف اور ان کی خدمات سے پُر کر رکھا ہے۔ ہمیں دوسروں کی طرف دیکھنے کی ضرورت نہیں۔ لوگوں نے ہمارے اسلاف کو پڑھا کہاں ہے، ان کو سمجھا کہاں ہے، ہم نے ان کی حقیقی قدر نہیں کی، اگر وہ یورپ میں پیدا ہوئے ہوتے، وہاں کے لوگ دنیا کو ان کا حقیقی تعارف کراتے۔

حمید : خلیل بھائی آپ نے تو میری آنکھیں کھول دیں۔ میں اپنے خیالات پر نظر ثانی کروں گا اور وقتاً فوقتاً آپ سے ملاقات کر کے اپنے شبہات کو زائل کرتا رہوں گا۔ السلام علیکم۔

خلیل: وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ۔

(۲۲) محرم

خالد: السلام علیکم حامد صاحب کہئے مزاج تو بخیر ہیں۔

حامد: وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ، اللہ کا شکر ہے، آپ کی دعا ہے۔

خالد: ادھر کہاں تشریف لے گئے تھے۔

حامد: گوشت خریدنے گیا تھا، آج بہت اچھا جانور ذبح ہوا تھا یاد نہیں رہا ورنہ آپ کو بھی اطلاع دیتا بالکل افغانی نسل کا دُنبہ تھا انتہائی مجرب گوشت تھا۔

خالد: حامد صاحب! یہ ماہ محرم کے ایام ہیں، ان دس ایام میں کیا کیا قیامت خیز واقعات پیش آئے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پیارے نواسوں پر کیا کیا حالات ان ایام میں گزرے، مگر مسلمان ان دنوں میں گوشت مچھلی مرغی انڈے کھانے میں لگا ہوا ہے میں جس مذہب کی ترجمانی کر رہا ہوں ان کے یہاں تو ان دنوں میں گوشت کھانا حرام ہے، سنگار کرنا حرام، شادی کرنا حرام، نئے کپڑے پہننا حرام، یہ تو ماتم کے ایام ہیں، تعزیہ داری کے ایام ہیں، علَم و دُلدُل نکالنے کے ایام ہیں، مرثیہ پڑھنے، نیاز فاتحہ کے ایام ہیں، بچوں کو فقیر بنانے اور سیلی پہنانے کے ایام ہیں۔

حامد: ارے آپ تو بدعتی یا شیعہ کے ترجمان معلوم ہوتے ہیں، کیا آپ کا مذہب اسلام سے الگ ہے، اسلام میں تو ان ایام میں آپ کے بیان کردہ اعمال میں سے کسی کا ثبوت نہیں ہے، آپ نے ان چیزوں کو دین کیسے بنالیا۔

خالد: دین بنانے کی بات نہیں محبت کا تقاضہ یہ ہے کہ یہ اعمال کئے جائیں، ان اعمال کو اسلام میں تلاش کرنے کی کیا ضرورت ہے، کیا نبی صلی اللہ علیہ وسلم خود فرماتے کہ میرے نواسوں یا اہل بیت کے ساتھ ایسی محبت کرنا، وہ تو امت کو خود سوچنا چاہئے کہ وہ اپنی محبت کا مظاہرہ کس طرح کرے، کیا کوئی مرنے والا یہ کہہ کر مرتا ہے کہ میرے مرنے کے بعد خوب رونا اور ایسے ایسے مجھے یاد کرنا، یہ تو خود اہل محبت اور اہل قرابت کا فریضہ ہے کہ وہ مرنے والے پر اپنے رنج وغم کا اظہار کریں، کسی محبوب کے رنج وغم میں اپنے آپ کو

شریک سمجھنا اور اس کے غم سے متاثر ہونا انسان کا ایک فطری داعیہ ہے، مگر آپ لوگوں کو تو عشق ومحبت کی ہوا بھی نہیں لگی اس لیے آپ ان مقامات محبت کو کیا سمجھیں گے۔

حامد: آپ بھی عجیب آدمی ہیں اگر کوئی مسلمان قرآن مجید اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات پر عمل کرتا ہے اور ان کی حدود کا خیال رکھتا اور غمی خوشی کے وہ طریقے اور وہ حدود اختیار کرتا ہے جن کی ہدایت کی گئی ہے، تو آپ اس کو محبت سے کورا اور اہل بیت کا دشمن سمجھتے ہیں، بلاشبہ اسلاف واکابر، اولیاء اللہ، ائمہ اور امت کے کاملین اہلِ بیت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم سے زیادہ محبت کرنے والے اور ہم سے زیادہ ان کے مداح اور قدرداں تھے، مگر انہوں نے کبھی اظہار محبت کے لیے یہ طریقے اختیار نہیں کئے، بلکہ ان کے فتویٰ اس کے خلاف موجود ہیں؛ یہ سب طریقے غیر قوم کے ہیں جو مسلمانوں نے ان سے سیکھے ہیں، ان کے یہاں دسہرہ تھا مسلمانوں نے محرم کے دس ایام اس کے قائم مقام بنالئے، اچھی طرح سمجھ لو اسلام ایک اصولی مذہب ہے اس میں ہر موقع کے لیے ہدایات موجود ہیں، ان کے خلاف کی قطعاً اجازت نہیں دی گئی ہے بلکہ اس کو بدعت قرار دیا گیا ہے، آپ نے جن اعمال کا تذکرہ کیا ہے اس میں سبھی میں شرک کی بو آتی ہے، جو اسلام کے عقیدہ توحید کے خلاف ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ہم شہداء کی حیات کے قائل ہیں ہمیں ان کا ماتم منانے کی کیا ضرورت، قرآن نے کہا: لَاتَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ۔ ہم زندہ جاوید کا ماتم نہیں کرتے، یہ تو ہمارے لیے فخر کی بات ہے کہ ایک غلط طریقہ کے خلاف اور ملوکیت کی طرف مائل حکومت کے خلاف کاشانۂ نبوت کے پروردہ حضرت حسینؓ نے ایسے سخت حالات میں جب کہ ہر شخص عافیت کا راستہ تلاش کرنے پر مجبور تھا اور عزیمت کے بجائے رخصت پر عمل کو غنیمت سمجھ رہا تھا، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس نواسے نے انتہائی جرأت اور ہمت کا مظاہرہ کرکے اپنی جان کی بازی لگا کر ایک طاقتور حکومت سے ٹکر لی اور اس کے لیے اپنی عزیز جان کو بھی قربان کردیا اس سے تو ہمارا سر فخر سے بلند ہونا چاہئے کہ ہماری تاریخ میں ایسے ارباب ہمت وعزیمت پیدا ہوئے ہیں جنہوں نے اپنے دور کی بڑی سے بڑی قوت سے ٹکر لی ہے۔ ان کے اس مردانہ کام پر یہ غم منانا کہ ایسا کیوں ہوا نہ ہوتا تو اچھا تھا غلط ہے، اگر یہ قربانی ان کی طرف سے نہ دی جاتی تو غم کی بات ہوتی کہ ایک فرد بھی اس وقت ایسا نہیں تھا جو

عزیمت کا مظاہرہ کرتا۔ افسوس! مسلمانوں پر جس پر فخر کرنا چاہیے تھا اس کو صدمہ اور ماتم
کی چیز بنالیا ہم کو حضرت حسینؓ کی زندگی سے یہ سبق لینا چاہیے کہ ہم بھی دین اور اس کی
محافظت اور اس کے نظام کے قیام کے لیے اپنی قربانیوں سے دریغ نہ کریں تا کہ بس ماتم
پر اکتفاء کر کے بیٹھ جائیں اور ان ایام میں کچھ چیزیں اپنے اوپر حرام کر کے حضرت
حسینؓ کی محبت کا حق ادا کر دینے کے مدعی بن جائیں، حضرت حسینؓ کی روح اس سے
قطعاً خوش نہیں ہو سکتی، کسی چیز کے حرام و حلال کرنے کا حق سوائے شارع کے کسی کو
حاصل نہیں اور نہ یہ ہزاروں روپیہ دریا میں ڈالنے اور علم و اکھاڑے اور دُلدُل کے جلوس
پر روپیہ بہانے سے کوئی ثواب جبکہ مسلم قوم کے یتیم ان کی بیوائیں اور مفلس افراد نان
شبینہ کے محتاج ہیں کاش کہ ان پیسوں سے ان غرباء کی مدد کی جاتی ان کے تن ڈھانکنے
پر خرچ کیا جاتا اور اس کا ثواب حضرت حسینؓ کو بخشا جاتا تو حضرت حسینؓ کی روح باغ
باغ ہو جاتی اور ہزاروں دعائیں دیتی؛ افسوس! اتنی معقول بات بھی مسلمانوں کی سمجھ
میں نہیں آتی۔

شاکر: ہم نے آپ دونوں حضرات کی باتیں سنیں مگر میں اب بات کا رخ دوسری طرف
موڑنا چاہوں گا۔ وہ یہ کہ حضرت حسینؓ کے بارے میں جن خیالات کا آپ دونوں
حضرات نے اظہار کیا ہے مگر بعض لوگوں کا یہ کہنا ہے کہ خود امام کا خروج یزید کے خلاف
ایک غلط اقدام اور بغاوت تھا معاذ اللہ وہ اسلام کے قانون سیاست کے خلاف تھا،
اسلام کا قانون یہ ہے کہ جب کوئی حکومت قائم ہو اور اس کی وجہ سے مسلمانوں کا کلمہ متحد
ہو تو پھر شخصی طور پر چاہے خلیفہ کے اپنے ذاتی اعمال کیسے ہی ہوں لیکن وہ نظم و نسق اسلام
کے مطابق کر رہا ہو اور نمازوں کا پابند ہو تو حنفیہ کے یہاں اس کی بیعت سے گریز کرنے
کا کسی کو حق حاصل نہیں اس سے مسلمانوں میں انتشار پیدا ہوتا ہے، غالباً اسی خطرہ کے
پیش نظر حضرت امیر معاویہؓ نے یزید کے لیے بیعت اپنی حیات میں ہی لے لی تھی تا کہ
بعد میں اختلاف کی شکل میں مسلمانوں کا خون خرابہ نہ ہو۔ اس بات کو سامنے رکھتے
ہوئے نہ تو تعزیہ داری کی ضرورت ہے نہ غم منانے کی جیسا کہ خالد صاحب کا خیال ہے
اس لیے کہ وہ خود غلطی پر تھے اور نہ ان کے اس اقدام کو شہادت کا کارنامہ سمجھنے کی
ضرورت ہے جیسا کہ حامد صاحب فرما رہے ہیں۔

حامد: شاکر صاحب! ایسا جن لوگوں نے سمجھا ہے یہ غلط ہے، ان کے سامنے واقعہ کی
نوعیت نہیں ہے امام کا یہ خروج قطعاً بغاوت نہیں تھا بلکہ ان کو پورا جواز تھا، مسلمانوں
کا کلمہ یزید کی حکومت پر قطعاً متفق نہیں تھا جس کی دلیل یہ ہے کہ حجاز کا صوبہ عبداللہ بن
زبیرؓ کے قبضہ میں ہونے کی وجہ سے یزید کی قلم رو سے الگ تھا، ادھر کوفے کے لوگ قطعاً
مطمئن نہیں تھے جیسا کہ ان کے خطوط اور مسلم بن عقیل کی نصرت سے ظاہر ہے۔ نیز
حنفیہ کے اس مسلک کا امام کو مکلّف کرنے ضرورت نہیں ہے، ان کا مسلک وہ تھا جو آج
شوافع کا ہے کہ خلیفہ کے جب ذاتی حالات فسق و فجور کے ہوں تو اس کے خلاف بغاوت
کی جا سکتی ہے، کوفہ والے دل سے امام کے ساتھ تھے مگر یزید کی فوج کے ڈنڈے نے
بجبر ان کو علیٰحدگی پر مجبور کیا اور مسلم بن عقیل کی نصرت سے دست بردار ہوئے اس کے
علاوہ امام نے جب کوفے والوں کے حالات کا اندازہ وہاں پہنچ کر لگایا تو فوراً فرمادیا کہ
میں تو تمہاری نصرت کے لیے بلانے پر آیا تھا، اگر تم نہیں چاہتے اور یزید کے ساتھ ہو تو
مجھے واپس جانے دو، یا یہ یزیدی فوج مجھے خود یزید کے پاس پہنچا دے میں اس سے اپنا
معاملہ خود طے کر لوں گا بیعت کرنا چاہیے یا نہیں، سوچ لوں گا؛ یہ بے لاگ اور صاف
بات تھی مگر اقتدار کے نشے میں چور فوج نے اس کو نہیں مانا اور امام کو مظلوم حالت میں
شہید کر دیا، اس لیے امام کی شہادت، شہادت ہے اور مظلومانہ شہادت ہے۔ یزید کی غلطی
واضح ہے اس لیے یہ اعتراض غلط ہے کہ خود امام غلطی پر تھے اور یہ بھی روش غلط ہے کہ اس
شہادت کو حضرت عثمانؓ، علیؓ، حمزہؓ کی شہادت پر بڑھایا جائے اور تعزیہ ماتم اور مختلف غیر
اسلامی خرافات کا ذریعہ بنالیا جائے بلکہ اعتدالی روش وہی ہے جو ہم نے پیش کی اس میں
سب کا احترام ہے، کسی بھی واقعہ کی ایسی توجیہ جس سے بعض مسلّم اور مقتدر شخصیات کی
پوزیشن مجروح ہو، اس سے وہ طریقہ اور وہ توجیہ بہتر ہے جس سے کسی کی شخصیت مجروح
نہ ہو۔ آج لوگ افراط و تفریط میں مبتلا ہیں، کوئی امام حسینؓ کے اقدام کو غلط کہہ رہا ہے،
کوئی امیر معاویہؓ پر سب و شتم کر رہا ہے، یہ انتہائی غلط روش ہے، ہمارے نزدیک سارے
صحابہؓ قابل احترام ہیں، امت میں ان کا درجہ تمام اولیاء اللہ اور صلحاء سے بڑھ کر ہے۔

شاکر: مگر سوال یہ ہے کہ عبدالرحمٰن بن ابی بکر، عبداللہ بن عمرؓ، حضرت حسینؓ، عبداللہ بن
زبیر وغیرہ حضرات کی موجودگی میں جب کہ یہ حضرات یقیناً یزید سے افضل تھے حضرت

معاویہؓ نے یزید کو کیوں ترجیح دی اور اس کی بیعت کے لیے کیوں اصرار کیا؟

حامد: بلاشبہ یہ حضرات یزید سے بہتر تھے مگر یہ ضروری نہیں کہ افضل کی موجودگی میں مفضول کو خلیفہ نہ بنایا جائے جب کہ وہ یہ سمجھتے تھے کہ حکومت کے ایک خاندان سے منتقل ہونے کے وقت خون خرابے کا بھی خطرہ ہے، ادھر ان کو یزید کی بہت سی ان باتوں کا بھی علم نہیں تھا جو بعد میں ظاہر ہوئیں وہ اپنی دانست میں یزید میں انتظامی صلاحیت اور اپنے زمانہ کے تجربے کار افراد کی معاونت کی امید پر اس کو اس کا اہل سمجھتے تھے، اسی بنیاد پر انہوں نے مشورے کے بعد یہ فیصلہ کیا۔ ورنہ یہ کہنا کہ اس میں بیٹے کی محبت یا خاندان پر وری کا جذبہ کام کر رہا تھا۔ یہ بات قطعاً غلط ہے، جس کی شہادت اس بات سے ملتی ہے کہ حضرت معاویہؓ نے بر سرِ منبر یہ دعا کی تھی، اے اللہ! اگر میرا یزید کو خلیفہ مقرر کرنا پدرا نہ محبت کی وجہ سے ہو اس میں مسلمانوں کا مفاد مقصود نہ ہو، تو تُو اس کو موت دیدے۔ ظاہر ہے کہ ایک باپ یہ بددعا جمعہ کی اہم ساعت میں بر سر منبر اپنے بیٹے کے لیے قطعاً نہیں کر سکتا۔ پھر امیر معاویہ جلیل القدر صحابی کاتب وحی ہیں ان کے بارے میں کوئی غلط بات کیسے کی جا سکتی ہے۔ جو لوگ ایسا سوچتے ہیں وہ غلطی پر ہیں۔ عبداللہ بن مبارک سے کسی نے پوچھا تھا کہ امیر معاویہ اور حضرت عمر بن عبدالعزیز میں کس کا درجہ بڑھا ہوا ہے؟ تو فرمایا معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جن جنگوں میں شریک ہوئے ہیں اور ان کے گھوڑے کی ناک کی ریزش پر جو غبار میدان جنگ میں پڑ ا وہ غبار بھی عمر بن عبدالعزیز اور امت کے بڑے سے بڑے ولی سے بہتر ہے۔

شاکر صاحب: اصل بات یہ کہ دو نظریئے ہیں: بعض لوگ سوچتے ہیں کہ اپنے رشتے داروں کو قطعاً عہدہ نہ دیا جائے چاہے وہ باصلاحیت ہوں اس لیے کہ اس میں لوگوں کو بدنام کرنے کا موقع ملتا ہے؛ دوسرے یہ کہ یہ سلسلہ چل پڑتا ہے تو بعد میں نااہلوں کو بھی عہدہ ملنے کا خطرہ رہتا ہے، حکام کے رشتے دار ہونے کی وجہ سے مظلومین اپنی آواز اپنے خلیفہ تک پہونچانے سے ڈرتے ہیں، جس کی وجہ سے ظلم کے پھیلنے کا خطرہ رہتا ہے۔ نیز بعض دفعہ رشتہ دار، عہدیدار اپنے فریضے کی ادائیگی میں سستی برتتا ہے، اس امید پر کہ وہ تو اپنے ہیں مجھے معاف کر دیں گے، انہیں خطرات کے پیش نظر حضرت عمرؓ نے اپنے بیٹے اور رشتہ داروں کو عہدے نہیں دیئے اور بعد میں بھی ابن عمرؓ کو خلیفہ بنانے سے

ممانعت کر کے انتقال فرمایا۔ دوسرا نظریہ یہ ہے کہ رشتہ دار اگر باصلاحیت ہو تو اس کو عہدہ دینے میں کوئی حرج نہیں، اس میں یہ فائدہ ہے کہ اپنے بڑے کی بدنامی کے ڈر سے مستعدی سے کام کرے گا کہ نظام کی خرابی سے ہمارے ابا یا بڑے بدنام ہوں گے۔ دوسرے یہ کہ اس کو دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ ڈانٹا جا سکتا ہے؛ نیز اس سے کام بھی زیادہ لیا جا سکتا ہے اس لیے کہ وہ اپنا ہے منع نہیں کرے گا۔ دوسرے یہ کہ اپنا ہونے کی وجہ سے اس پر بہت سے رازوں میں اعتماد کیا جا سکتا ہے؛ یہ دو نظریئے ان دو نقطۂ نظر کی وجہ سے ہیں۔ حضرت امیر معاویہؓ اور عثمان غنیؓ نے اس دوسرے نقطۂ نظر کو اختیار فرمایا جب کہ صدیق اکبر اور عمرؓ نے پہلے نقطۂ نظر کو اختیار فرمایا، اگر چہ پہلا والا نقطۂ نظر کامیاب رہا لیکن اس کی وجہ سے دوسرے نقطۂ نظر اختیار کرنے والوں کو غلط کار نہیں کہہ سکتے ہیں، یہ ان کی اجتہادی غلطی تھی، اس صورت میں یہ اصرار کرنا کہ اجتہادی خطا نہیں بل کہ جان بوجھ کر یہ کام کئے گئے، جس میں نفسانیت کو دخل تھا یہ رویہ غلط ہے اور مقام صحابی کو نہ پہچاننے کے مرادف ہے، جنہوں نے ایسا کیا انہوں نے زبردست ٹھوکر کھائی ہے، اہلِ سنت کا قطعا یہ طریقہ کار نہیں، ہم تو ایسی توجیہ کریں گے، جو اس مسلمہ قانون پر اثر نہ ڈالے کہ اَلصَّحَابَۃُ کُلُّھُمْ عُدُوْلٌ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمْ وَ رَضُوْا عَنْہُ۔ ہمارے نزدیک مؤرخ کی عبارتوں اور تحقیقات کو غلط کہنا آسان ہے، اس کے مقابلے میں کہ ہم ان شخصیات کے بارے میں احادیث صحیحہ اور آیات قرآنیہ میں جو عدالت و توصیف بیان کی گئی اس کو غلط کہیں۔

خالد: آپ نے جو محرم کے جلوس، تعزیہ اور اکھاڑے اور علَم دُلدُل کے بارے میں ارشاد فرمایا، اس سلسلہ میں یہ عرض ہے کہ ہمارے ملک کے حالات کے تحت میری نظر میں یہ امور شاید مفید ہی ہوں۔

خالد: وہ کیسے؟

حامد: اس طرح کے ہم اس ملک میں غیر مسلم بھائیوں کے ساتھ رہتے ہیں وہ اکثریت میں ہیں ہم اقلیت میں، رات دن ہندو مسلم فساد بھی ہوتے رہتے ہیں، اپنے تحفظ کے لیے اگر کوئی تنظیم بنا کر حربی مشقیں کریں تو حکومت فوراً اس پر پابندی لگا دے گی، لیکن جب تقریب کے موقع پر محرم وغیرہ کے جلوس میں ہم اکھاڑے اٹھائیں گے اور تلوار لاٹھی

پٹے وغیرہ کا مظاہرہ کریں گے تو کیوں کہ اس کو مذہبی تقریب کے موقع پر کیا جاتا ہے اس لیے حکومت منع نہیں کرسکتی۔ اس طرح مسلمانوں میں ان فنون کی مشق جاری رہے گی اور جب محرم کے موقع پر اس کا عام جگہوں پر مظاہرہ ہوگا تو لوگ سمجھیں گے کہ یہ ان فنون سے واقف ہیں تو ان کے دلوں پر رعب طاری ہوگا۔

خالد: افسوس! آپ اپنی بات کی پیچ میں کہاں تک پہنچ گئے، پہلے تو ان مشقوں سے کون سے فساد آج تک رُکے ہیں؟ کن لوگوں نے ان کا دفاع کیا ہے؟ آج تو دست بدست جنگ کی قومی فساد میں ضرورت ہوتی ہی نہیں، پٹرول ڈال ڈال کر آگ لگائی جاتی ہے، سوڈے کی بوتلیں پھینکی جاتی ہیں، لوٹ مار ہوتی ہے، پولیس گولیاں چلاتی ہے، وہاں آپ کی لاٹھی اور تلوار کیا کرے گی۔ دوسرے یہ کہ اگر کسی درجے میں اس کو مان بھی لیا جائے تو پوری قوم کا عقیدہ بگاڑ کر ایک معمولی نفع حاصل کرنا کونسی عقلمندی ہے، بل کہ یہ غرض آپ نے عقلی طور پر گھڑی ہے، لوگ تو اس کو یزیدی فوج کے مقابلہ کے رنگ میں دین اور ایمان سمجھ کر کرتے ہیں نہ کرنے والوں کو برا سمجھتے ہیں، سینہ کوٹتے ہیں اور یا حسینؓ کے نعرہ لگاتے ہیں، نعرۂ تکبیر کے بجائے نعرۂ حیدری لگاتے ہیں، جس کا اسلام میں کوئی ثبوت نہیں، خدا کے واسطے ایک غلط رسم کو نباہنے کے لیے عقلی فائدے دکھلانے سے باز آؤ، خالص اسلامی اور ایمانی باتوں پر عمل کرو، اللہ تعالیٰ آپ کا رعب خود بخود دشمن کے دل میں ڈال دیں گے، ویسے ہم حربی مشقوں اور اپنے دفاع کے لیے تیاری کی صورتوں کا انکار نہیں کرتے مگر ان کو مذہب کا رنگ دے کر کسی واقعہ کے ساتھ منسوب کر کے مسلم قوم کا عقیدہ بگاڑنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔

شاکر: لیکن حامد صاحب! جب مسلم برسہابرس سے ان کاموں کو کر رہے ہیں، آپ اگر ایک دم ان کو چھوڑ دیں گے اور محرم کے جلوس اور تعزیہ نہیں نکالیں گے تو غیر مسلم یہ سمجھیں گے یہ لوگ ڈر گئے، اب ان کی ہمتیں پست ہوگئی ہیں، اب جرأت نہیں رہی، نیز وہ سمجھیں گے یہ لوگ اب اپنے مذہب سے دور ہوگئے ہیں اس لیے کہ وہ تو یہی سمجھتے ہیں کہ یہ مذہبی چیز ہے جبھی تو برسہابرس سے پابندیٔ اوقات کے ساتھ اس کو کیا جارہا ہے۔

حامد: جب ایک چیز غلط ہے اس سے ایمان کے برباد ہونے اور آخرت کے بگڑنے کا

خطرہ ہے تو دنیا والوں کی ملامت سے ڈر کر اپنی آخرت بگاڑنا کونسی عقلمندی ہے؟ وہ لوگ خود سمجھتے ہیں کہ ہر مذہب میں سیکڑوں غیر مذہبی رسمیں گھس گئی ہیں، اس میں تو اور زیادہ ہمت اور جرأت کا مظاہرہ ہے کہ برسوں کی رسم کو جب اس کا غلط ہونا معلوم ہوا تو بلا تاخیر چھوڑ دیا۔ میں آپ سے سچ کہتا ہوں کہ جب اسلام میں یہ دکھاوے کی رسمیں اور مظاہرے نہیں تھے، اس وقت مسلمان زیادہ قوی تھے، ان کا رعب داب زیادہ تھا ان کے آگے دوسرے جھکتے تھے، ان کی دھاک تھی، مگر جب سے مسلم قوم نے یہ غیر اسلامی رعب داب کا مظاہرہ شروع کیا ہے تب ہی سے ان کی ہیبت قلوب سے نکل گئی ہے۔ آج ان کی کوئی حیثیت نہیں رہی۔ معلوم ہوا خالص اسلامی اعمال کا ایک خاص اثر ہے، ان کی ایک خاص قوت ہے، جس کا ثبوت صحابہؓ اور اسلاف کے دور میں ملتا ہے، خدا کرے کہ مسلم قوم سمجھے اور پورے ملک میں کروڑوں روپیہ جو محرم کے ماہ میں تعزیہ، اکھاڑے، جلوس، علَم وغیرہ کے نام پر حضرت حسینؓ کی محبت کے بہانے برباد کیا جاتا ہے اس کو اس قوم کے صحیح مصرف میں صرف کیا جائے، آج مسلم قوم کتنی غریب ہے، تعلیم کا اس قوم میں کتنا فقدان ہے، دین و دنیا دونوں میدانوں کے علم سے کوری ہے، اس کے لیے اس کے پاس پیسے نہیں ہیں، مگر اس طرف کسی کو توجہ نہیں، جو توجہ دلائے بھی اس کو پاگل کہا جاتا ہے، اس کا مذاق اڑایا جاتا ہے۔

شاکر: حامد صاحب! آپ نے بڑی درد بھری اور کام کی باتیں ارشاد فرمائیں اور ہماری غلط فہمیوں کو دور کیا ہم آپ کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔

خالد: میں خود آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے میری باتوں کو کام کی باتیں سمجھا اچھا اب مجلس طویل ہوگئی ہے رخصت چاہتا ہوں۔ السلام علیکم

شاکر: وعلیکم السلام۔

(۲۳) اسلام کا پانچواں رکن حج

رفیق: شفیق صاحب! السلام علیکم۔

شفیق: وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔

رفیق: شفیق صاحب! سنا ہے کہ اس سال آپ حج بیت اللہ کے لیے تشریف لے گئے تھے۔

شفیق: جی ہاں! آپ سب لوگوں کی دعاؤں کے طفیل، کر تو آیا ہوں، اللہ قبول فرمائے۔

رفیق: شفیق صاحب! کیا آپ حج کے بارے میں میرے کچھ سوالوں کا جواب دیں گے؟

شفیق: ضرور۔

رفیق: جناب! آج کل حج پر بہت بڑا خرچ آتا ہے اور وقت بھی خرچ ہوتا ہے اور اتنے بڑے ہجوم میں دقت بھی بہت ہوتی ہے اور آج کا بدنی اعتبار سے کمزور انسان بہت پریشانی کے ساتھ اس عبادت کو کر پاتا ہے خصوصاً عورتوں کے لیے تو اور زیادہ، جان جوکھم کا مسئلہ ہوتا ہے، تو کیا اس کی اجازت نہیں ہے کہ اتنے پیسے غرباء پر خرچ کر کے حج کا ثواب پا لیا جائے۔

شفیق: رفیق صاحب! آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ حج ایک عبادت ہے اور ایسی عبادت ہے جو مالی بھی ہے اور جانی بھی، اس لیے اس میں مال کا خرچ اور بدن کو زحمت دینا ضروری ہے، اسی پر ثواب ہے۔ حج کو جہاد فرمایا گیا ہے اور ظاہر ہے کہ جہاد مشقتوں سے بھرا ہوتا ہے، حج میں جان و مال دونوں کا خرچ ہوتا ہے، ایک مسلمان جنگ کے نقشہ اور اس کی دوڑ بھاگ کو متحضر کرتا ہے۔ اسی طرح عرفات وغیرہ کی حاضری قیامت میں حشر کے منظر کی عملی مشق اور اس منظر کا استحضار ہے۔ اسی طرح حج کے ارکان میں گونا گوں افعال، عاشقانہ کوچہ گردی اور محبوب کے گھر کے چکر کاٹنا ہے۔ رہ گئی غرباء پروری تو وہ بھی اس سفر کے دوران ہوتی ہے۔ حاجی غرباء پر خرچ کرتا ہے بلکہ اس کی ہر بھول غرباء کو

کچھ نہ کچھ دلوانے کا ذریعہ ہے۔ بہر حال آپ اتنا یاد رکھیں کہ جو عبادت اسلام میں جس طرح ادا کرائی گئی ہے اسی طرح ادا ہوگی ورنہ اس کی روح ختم ہو جائے گی اور اگر اپنی سمجھ کے مطابق ادا کے دوسرے طریقے سوچے گئے تو عبادت کی شکل اور روح دونوں فنا ہو جائے گی پھر تو قربانی میں بھی لوگ جانور کو ذبح کرنے کے بجائے پیسے غرباء کو بانٹ دیا کریں گے، اس لیے اچھی طرح سن لو کہ جو عبادات مقصود ہوتی ہیں جیسے نماز روزہ حج کہ ان کے اصول ارکان آداب سب کو ادا کر کے ہی ان عبادت کی ادائے گی معتبر ہوگی بخلاف غیر مقصودہ عبادت جیسے طہارت وغیرہ، کہ ان میں صرف حقیقت مطلوب ہوتی ہے صورت مطلوب نہیں، صورت بدل بھی جائے تو حقیقت حاصل ہو جاتی ہے، مثلاً ایک آدمی تالاب میں کود پڑے تو وضو ہو گیا حالاں کہ اس نے وضو کو اس کی صورت میں نہیں ادا کیا جو شریعت نے بتلائی ہے؛ اس سے پتہ چلا کہ صرف انفاق مال سے حج کی عبادت ادا نہیں ہو سکتی۔

رفیق: حج تو بڑے بیت اللہ میں حاضری کا نام ہے تو جب مساجد جو چھوٹے بیت اللہ ہیں ان میں زیب وزینت اور اعلیٰ لباس اور خوشبو اور مہذب بن کر جانے کی ہدایت ہے، چناں چہ قرآن میں ہے: ''خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ'' تو حج میں تو بڑے بیت اللہ جانا ہے۔ اس کے لیے تو عطر میں نہا کر، ناخون بال کٹا کر اور اعلیٰ سے اعلیٰ شاہی لباس پہن کر جانے کا حکم ہونا چاہئے تھا نہ کہ بال بڑے، ناخون بلا کٹے، کپڑے بلا سلے، وہ بھی صرف ایک چادر ایک لنگی اور لنگی بھی درمیان سے بلا سلی، ٹوپی غائب، جوتے کی جگہ چپل، وہ ہیئت جس کی کبھی عادت نہیں، ایسی ہیئت میں ایک شریف انسان کبھی باہر نہیں نکلا۔ لوگوں کے سامنے کبھی نہیں آیا ایسی ہیئت میں ۵۲ لاکھ انسانوں کے بیچ میں آنا اور پھر سب کا آنا چاہے بادشاہ ہو، اس کی کیا ضرورت تھی۔ وہاں کی حاضری میں تو زیب وزینت، شان وشوکت، ٹھاٹ باٹ اور پورے حوصلے نکالنے کا موقع ملنا چاہئے تھا۔

شفیق: جناب! بڑے بیت اللہ کی حاضری کو چھوٹے بیت اللہ کی حاضری کی ہیئت سے الگ کر کے ایک مخصوص یونیفارم کے ساتھ بلایا گیا ہے تاکہ معلوم ہو کہ آج کوئی نئی جگہ کی حاضری ہے، جیسے کسی چھوٹے جلسہ کے لیے بلّے وغیرہ نہیں ہوتے مگر بڑے جلسہ میں شرکاء اور رضا کار کے بلّے ہوتے ہیں، اب یونیفارم کس ملک کا رکھیں ہر ایک دوسرے

کے لیے اجنبی ہوتا اس لیے ایک ایسا یونیفارم لیا جو سب کے لیے اجنبی ہے اور انتہائی سستا اور آسان، اور حج کی روح جو عشق ومحبت اور بے خودی چاہتی ہے اس سے ہم آہنگ ہے، ہر قسم کے غرور کو توڑنے والا ہے اور پھر اس میں اعتدال ہے کہ نہ تو کوٹ اور اچکن پہن کر اور نہ بالکل ننگے جیسا کہ کفار مکہ کرتے تھے، پھر اس لباس میں حاجی کو وہ مزا آتا ہے کہ اس ذائقہ کو پہننے والا ہی سمجھ سکتا ہے، کسی فوجی کو اپنی وردی میں، کسی راجہ کو اپنے شاہی لباس میں، کسی دولہا کو عروسی جوڑے میں کسی خوش پوش کو اپنی قیمتی پوشاک میں وہ لطف اور عزت معلوم نہیں ہوتی، جیسا کہ احرام میں حاجی کو۔

رفیق: مگر اس میں ہندو دھرم کے پنڈتوں اور سادھوؤں کے لباس سے مشابہت ہے، وہ بھی سر کھلا رکھتے ہیں اور اسی حالت میں یاترا کو جاتے یا مندر میں رہتے ہیں تو کم از کم تشبہ کی وجہ سے منع ہونا چاہئے۔

شفیق: پہلے تو مکمل طور پر تشبہ نہیں ہے اور اگر ہے بھی تو اس سلسلے میں یہ سمجھ لینا چاہئے کہ اسلام جامع عباداتِ ادیان بھی ہے، مثلاً اگر عیسائی مذہب میں رہبانیت ہے تو اسلام میں بھی اعتکاف کی شکل میں دس دن کے لیے موجود ہے، اگر ہندو مذہب میں مندر کے چکر لگانا ہے اور مقامات مقدسہ کی یاترا ہے تو اسلام میں بھی طواف اور حج کی عبادت ہے۔ اسی طرح اگر پنڈتوں میں احرام کے طرز کا لباس زہد کے اظہار اور مندر کی حاضری کے لیے ہے تو اسلام میں بھی یہ لباس کعبہ کی حاضری کے لیے ضروری قرار دیا گیا ہے، ہر مذہب کی کوئی نہ کوئی چیز اسلام کے گلدستہ میں ایسی خوبصورتی کے ساتھ کاٹ چھانٹ کر سجائی گئی ہے کہ وہ ایک حسین گلدستہ بن گیا ہے اور کسی ایک مذہب کا مکمل خوشہ چیں بھی نہیں رہا تو اسلام کو ماننا گویا سب کو ماننا ہے مُصَدِّقٌ لِمَا بَيْنَ يَدَيَّ۔

رفیق: یہ کعبہ کے طواف اور سعی کی تعداد میں بھی سات کا عدد کیوں ضروری ہے، اور قربانی میں بھی بڑے جانور کی شرکت، سات کا عدد کیوں ہے اور کنکریاں بھی سات کیوں ہے؟

شفیق: سات کے عدد کو بڑی اہمیت حاصل ہے، مؤمن کے مؤمن بہ بھی سات ہیں، جو ایمان مفصل میں ذکر کئے گئے ہیں: اٰمَنْتُ بِاللّٰهِ وَ مَلٰئِكَتِهٖ وَ كُتُبِهٖ وَ رُسُلِهٖ وَ الْيَوْمِ الْآخِرِ وَ الْقَدْرِ خَيْرِهٖ وَ شَرِّهٖ مِنَ اللّٰهِ تَعَالٰى وَ الْبَعْثِ بَعْدَ الْمَوْتِ۔ جن کے بغیر مؤمن نہیں ہوسکتا، زمین بھی سات، آسمان بھی سات، ہفتہ کے ایام بھی

سات، اس لیے جب مؤمن بہ سات، تو ایمان کے تحت ادا ہونے والی اس عبادت کے اعمال میں بھی سات کے عدد کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔

رفیق: اسلام کے مزاج میں مرد وعورت کو اختلاط سے بچانا ہے، اسی لیے نماز اور مسجد کی حاضری میں عورت کو روکا گیا ہے، تو پھر حج کی عبادت میں اس کو کیوں برداشت کرلیا گیا ہے، اور اس عبادت کو مخلوط ادا کرنے کی اجازت دے دی گئی ہے۔

شفیق: حج حشر کے میدان کی عملی منظر کشی ہے اور وہاں اجتماع مخلوط ہوگا، حج عورت کے لیے بمنزلۂ جہاد ہے اور نفیر عام کے وقت اس کی ضرورت بھی پڑسکتی ہے، لہٰذا یہ اس کی عملی ٹریننگ ہے، اختلاط تو گوارہ کیا مگر اس کو اتنا پابند کیا گیا کہ اپنی بیوی بھی حرام تو دوسرے کی بیوی کو تو کیا دیکھے گا اسی لیے لاکھ میں ایک واقعہ بھی الحمدللہ کوئی شرمناک پیش نہیں آتا جب کہ دنیا کے کسی بھی دوسری جگہ مخلوط اجتماع میں پیش نہ آنا محال ہے پھر سزا اتنی سخت کہ بعض صورتوں میں تو حج ہی فاسد ہوجاتا ہے پھر مجازی معشوق کی موجودگی کے باوجود حقیقی معشوق کی یاد میں کھو جانا یہ مظاہرہ بھی کمال کا، اس اختلاط ہی سے ظاہر ہوتا ہے، اس لیے کہ دنیائے نسواں کا میوزیم موجود مگر ہر شخص اپنے معشوق حقیقی کی یاد میں غرق۔

رفیق: صفا مروہ کی سعی تو پانی کی تلاش کے لیے تھی اب وہ علت کہاں۔

شفیق: وہ ایک ماں کی اپنے بچے کے لیے ممتا بھری وہ ادا تھی جو اللہ کو ایسی پسند آئی کہ اس تاریخی مقام پر اللہ تعالیٰ ہر حاجی سے اس ادا کو دیکھنا چاہتا ہے اس ادا کو ہمیشہ حج کے موقع پر دہرائے جانے کو دوام بخش دیا گیا۔

رفیق: یہ کنکریاں تو اس موقع پر شیطان کی وجہ سے ماری گئی تھیں اب وہ شیطان کہاں۔

شفیق: ایک حاجی یہ بتلانا چاہتا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کو اللہ کے حکم سے باز رکھنے کی شیطان نے کوشش کی تو انہوں نے اس کو مارا اسی طرح حاجی کنکر مار کر یہ تأثر دے رہا ہے کہ اگر مجھے بھی حکم الٰہی سے باز رکھنے کے لیے کوئی شیطان رہزن ہوا تو میں اس کو مارنے کے لیے اسی طرح تیار ہوں۔

رفیق: یہ لاکھوں جانوروں کو کاٹ ڈالنے سے کیا فائدہ جب کہ ان کا گوشت ضائع ہوتا ہے اتنا روپیہ غرباء کو دے دیا جائے تو اچھا ہے۔

شفیق: قربانی کی حقیقت انفاق جان ہے نہ کہ انفاق مال، پہلے یہ گوشت ضائع ہو جاتا تھا اب سعودی گورنمنٹ ڈبوں میں بند کر کے ہوائی جہاز کے ذریعہ غریب ملکوں میں پہونچا دیتی ہے اس لیے وہ ضائع نہیں ہوتا۔

رفیق: شفیق صاحب! آپ کے جوابات مجھے انتہائی معقول نظر آئے، دل بہت خوش ہوا، آپ تو حاجی ہی نہیں ہیں بلکہ فلسفۂ اعمالِ حج کے ابن رشد اور رازی وغزالی معلوم ہوتے ہیں، اللہ کرے زور بیان اور زیادہ اور اللہ کرے زور توجیہ اور زیادہ، اللہ کرے زور فکر اور زیادہ۔ آج سے میں آپ کو ''مفکر الاسلام'' کا لقب دیتا ہوں۔

شفیق: شکریہ! آپ کے منہ میں گھی شکر، آپ کا حسنِ ظن، میرے لیے ذخیرۂ آخرت ہوگا انشاء اللہ۔ السلام علیکم۔

رفیق: وعلیکم السلام۔

(۲۴) اسلامی نکاح

لقمان: عثمان صاحب! السلام علیکم۔

عثمان: وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔

لقمان: کہیے کیسے مزاج ہیں؟

عثمان: خدا کا فضل ہے، ابھی ابھی امتحانات سے فرصت ملی ہے۔

لقمان: کس کلاس کا امتحان تھا؟

عثمان: ایم اے کا امتحان تھا۔

لقمان: پرچے کیسے رہے؟

عثمان: الحمد للہ! پرچے کے جوابات بھی اطمینان بخش لکھے ہیں، آگے اللہ مالک ہے؛ لقمان صاحب! ایک سوال اس امتحان میں بڑا عجیب وغریب تھا۔

لقمان: وہ کیا؟

عثمان: وہ یہ تھا کہ کیا یہ سچ ہے کہ اسلامی شادی خرید فروخت کا ایک معاملہ ہے جب کہ ہندو دھرم میں شادی دھارمک بندھن اور مقدس تقریب ہے۔

لقمان: عثمان صاحب! میں سوال سمجھ نہیں سکا آپ ذرا تفصیل فرمائیں۔

عثمان: سائل یہ دریافت کر رہا ہے کہ کیا یہ دعوی سچا ہے کہ اسلامی شادی میں لڑکا لڑکی کو خریدتا ہے اور لڑکی اپنے آپ کو بیچتی ہے گویا نکاح ایک سودا ہے جو لڑکی کے ساتھ کیا جاتا ہے اس طرح وہ اپنی عصمت خوردہ (پھٹکر) بیچنے کے بجائے تھوک بھاؤ پر (اکٹھی بیچ دیتی ہے، اس میں انسان فروشی کے قدیم رواج عرب کی عکاسی معلوم ہوتی ہے، اور پھر خرید وفروخت کا معاملہ جو اتنے عہد وپیمان کے ساتھ ہوتا ہے وہ ایک جملہ طلاق سے کینسل ہو جاتا ہے، چاہے یہ لفظ طلاق مذاق میں بولا ہو یا خفگی میں یا حالت نشے میں، چاہے اس نکاح پر ۷۰ رسال گزر چکے ہوں تب بھی سودا کینسل ہو جاتا ہے جب کہ ہندو دھرم میں لڑکی کے ماں باپ اس کا پتی (شوہر) چنتے ہیں، انتخاب کے بعد ایک تقریب

کے ذریعہ مال دولت دے کر اس کو عزت کے ساتھ شوہر کے سپرد کر دیا جاتا ہے، اس طرح وہ دونوں ہمیشہ کے لیے ایسے جڑ جاتے ہیں کہ مرنے تک جدا نہیں ہو سکتے۔

لقمان: پھر عثمان صاحب آپ نے کیا جواب لکھا؟

عثمان: میں نے ایک تفصیلی جواب لکھا ہے، مگر میں یہ چاہتا ہوں کہ اس موقع پر آپ جیسے عالم فاضل سے اور اچھے جوابات حاصل کروں اس لیے میری یہ درخواست ہے کہ آج کی اس مجلس میں مجیب بن جائیں اور میں اس مسئلہ پر معترض بن کر آپ سے وہ سارے اعتراضات کر ڈالوں جو آج کل کے ان ذہنوں میں پیدا ہو رہے ہیں جن کی ترجمانی امتحان کے اس سوال میں کی گئی ہے۔

لقمان: ضرور سوال کیجئے۔

عثمان: میں بحث کا آغاز اس بات سے کرنا چاہتا ہوں کہ اسلامی نکاح کی عبارتوں سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ دعویٰ صحیح ہے کہ اسلامی قانون میں لڑکی کو بیچا جاتا ہے جس کے واضح اشارات یہ ہیں، مثلاً مہر کا ضروری ہونا، مہر کو ملک بضعہ کا عوض گردانا، چناں چہ نکاح کے وقت بولا بھی یہ ہی جاتا ہے کہ تلوار خاں کی لڑکی بندوق خاں کے لڑکے کے نکاح میں بعوض ایک ہزار روپیہ نقد سکہ رائج الوقت دی، آپ نے قبول کی۔ ظاہر ہے کہ عوض مال ہی ہوتا ہے خریدنے کے وقت دیا جاتا ہے، لہٰذا اس کو بدلہ میں جو چیز دی گئی وہ بھی مال ہی کے قبیل سے ہوگی، اس لیے کہ بیع کی تعریف ہی مبادلہ مال بالمال ہے، پھر نکاح لفظ بیع سے بھی منعقد ہو جاتا ہے یہ بھی علامت بیع ہے۔ بعض ائمہ نے تو نکاح کو خالص خرید وفروخت کا معاملہ قرار دیا ہے اس لیے مہر کی تعین کا معاملہ عاقدین کی مرضی پر چھوڑ دیا ہے، پھر ملک رقبہ کے ساتھ ملک بضعہ کا حاصل ہو جانا بھی بیع وشراء کی علامت ہے کہ کل کے ساتھ جز حاصل ہو جاتا ہے؛ اسی طرح مہر معاف کرا کے طلاق دینا یا خلع وغیرہ یہ سب چیزیں بیع ہی پر دال ہیں، بلکہ ملکِ بضعہ وغیرہ۔ کی تعبیرات شرمناک بھی ہیں، بخلاف ہندو دھرم کے، کہ اس میں نہ مہر ہے، نہ ملک رقبہ، نہ بضعہ کا عوض، بلکہ لڑکی کو بہت سا مال دے کر عزت کے ساتھ شوہر کے سپرد کر دیا جاتا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک مذہبی بندش ہے جو مرنے تک قائم رہتی ہے۔

لقمان: پہلے تو جناب آپ کو یہ سمجھ لینا چاہئے کہ لڑکی ایک ایسا فرد ہے کہ اس کو ماں باپ

ہمیشہ تو گھر میں رکھ نہیں سکتے، قدرت نے اس کو اس لیے پیدا کیا کہ وہ ایک دوسرے گھر کی زینت بنے اور وہاں اس سے ایک دوسرا خاندان وجود میں آئے، اب دوسرے شخص کے پاس عام حالات میں اس کو اس طرح رہنا ہے کہ وہ شخص اس کی مکمل کفالت کرے، اس کی جملہ ضروریات اس سے پوری ہوں اور عورت اس کے گھر کی پوری نگرانی کرے اس طرز زندگی کے لیے شوہر کو عورت کی مالی کفالت کرنا لازمی ہے۔ دوسرے یہ بھی مسلّم ہے کہ عورت مرد میں بعض مرتبہ ایسی وجوہ پیش آجاتی ہیں کہ دونوں کی زندگی کو اگر جلن، کڑھن اور ضیق سے بچانا ہے تو علیٰحدگی ہی میں نجات نظر آتی ہے اور علیٰحدگی کی صورت میں عورت کو اپنی زندگی گذارنے یا جب تک دوسرا شوہر ملے مال کی ضرورت ہوگی، بہر حال ہر شکل میں باپ سے الگ ہوتے ہی عورت کے ہاتھ خالی ہیں، ماں باپ کی وراثت تو ان کے مرنے کے بعد ملے گی اور جو چیزیں انہوں نے دی ہیں وہ عموماً نقدی نہیں ہوتی۔ سامان یا کپڑوں کی شکل میں ہوتی ہیں جن کا بیچنا بھی معیوب سمجھا جاتا ہے بلکہ وہ سامان تو ماں باپ کی یادگار سمجھ کر محفوظ رکھا جاتا ہے اس لیے لڑکی کا ہاتھ خالی ہے، اس لیے اسلام نے عورت کو حاصل کرتے وقت مرد سے یہ کہا کہ نان ونفقہ کی ذمہ داری بھی آج سے تم پر ہے، گھر کی ہر ضرورت تم کو پوری کرنی ہے اور اس وقت بطور مہر معجّل بھی اول ملاقات میں اس کو کچھ دے دو تا کہ وہ سمجھ لے کہ یہ دینے کا ذہن رکھتا ہے۔ مجھ کو خرچ دینے کی نیت سے لایا ہے، اس لیے ایک عہد نکاح کے وقت مہر کا ہوتا ہے جس میں سے عرفاً جو معجّل کا رواج ہے اس کو معجّل اور مؤجل کو بعد میں جب چاہے ادا کر دے تا کہ عورت کے پاس وہ رقم رہے، چاہے وہ اس سے تجارت کرے یا کسی کام میں لے اور اگر علیٰحدگی کے بعد یہ رقم دی گئی ہے تو اس کو نکاح ثانی تک کام میں لا سکے، یہ ہے مقصد اس مہر کا جس کو آپ عورت کی توہین کا سبب بتا رہے ہیں اور خرید وفروخت کا نام دے رہے ہیں جبکہ ہندوازم میں عورت کو مرد کا پوری طرح بیگاری بنا دیا ہے بغیر کسی مالی عہد ومیثاق کے لڑکی کو ایک اجنبی مرد کے سپرد کر دیا جاتا ہے، چوں کہ عورت کے باپ کی وراثت میں کوئی حق نہیں سمجھا جاتا تو شادی کے وقت اس کو کچھ سامان دے کر مرد کے سپرد کر دیا جاتا ہے بلکہ آج کل تو مرد عورت کو بلا مال کے جس کو جہیز کہتے ہیں قبول ہی نہیں کرتا، اس لیے کچھ مال اس کے اوپر لاد کر بشکل تارکین وطن اور رفیوجی اس کو ماں باپ اپنے گھر سے

شوہر کے گھر ڈھکیل دیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ خانہ بدوش عورت اپنی چار پائی برتن اور ہنڈے کنڈے لیے ہوئے مرد کے گھر میں آگھسی۔ اب اس کے گھر میں خود آئے ہوئے اس رفیوجی کا کیا حال ہوگا، ایک داسی بن کر، خادمہ بن کر اور بیگاری بن کر ہمیشہ رہے گی، اب نہ ماں باپ سے جوڑ رہا اور نہ دوسری شادی کا حق، لاکھ شوہر بے اعتنائی برتے، حقوق کی ادائے گی سے پہلو تہی کرے، عورت کی کوئی آواز نہیں۔ ظاہر ہے ایسے خود سے آئے ہوئے شخص کی کیا عزت، شوہر کے انتقال پر مال سے نہتی بلکہ معاشرے میں منحوس سمجھی جاتی ہے، جب تک شوہر زندہ تھا شوہر میں اتنی ضم کردی گئی تھی کہ نام بھی علیٰحدہ نہیں لیا جاتا تھا، مسز فلاں کہا جاتا تھا، ہر اعتبار سے بے اختیار نہ دوسری شادی کا اختیار، بلکہ شوہر کی وفاداری اس میں سمجھی جاتی کہ وہ اس کے ساتھ چتا میں جل جائے بخلاف اسلام کے کہ اس نے رفیوجی اور بیگارن بنا کر شوہر کے حوالہ نہیں کیا، شوہر کو طالب بنایا تم خود پیغام لاؤ اور یہ ثابت کرو کہ تم میں نان ونفقہ اور گھر کی ضرورت پورا کرنے کی صلاحیت ہے اور عورت کے ہاتھ خرچ کے لیے مہر معجّل دینے کی صلاحیت ہے، بعد میں دینے کے لیے مہر موٴجل کا وعدہ کرو، پھر اس کے سیکڑوں حقوق، اس کو ایک تنہا کمرہ دینا، سِلا کپڑا، پکا کھانا دینا اور اگر امیر گھرانے کی بیٹی ہے تو اس کو ایک یا دو خادم گھر کے اندر اور باہر کے کاموں کے لیے فراہم کرنا ضروری، بولئے اس میں عورت کی عزت ہے یا پہلی شکل میں، پھر آپ کیسے اس کو خرید وفروخت کا معاملہ قرار دے رہے ہیں اس کو یوں کیوں نہیں کہتے کہ عورت جیسی مقدس جنس کو گھر میں لانے کی صلاحیت کا ثبوت اس کی پیشگی ضمانت اور عہد کا نام مہر ہے، وہ بیگارن نہیں ہے کہ گئے ہاتھ پکڑ لائے، بلکہ وہ ملکۂ خانہ ہے، اس کو لانے کے لیے قوت اور صلاحیت کا ثبوت دینا ہوگا تب اس کو لاسکو گے، اسی کی تعبیر مہر ہے، اس کی عصمت کا حرم کوئی دھرم شالہ نہیں ہے کہ جو آئے فری میں گھس جائے، بلکہ وہ ایک پرائیویٹ بنگلہ ہے، اس میں وہی آسکے گا جو اس کی ایک ایسی فیس کا ضامن بنے جو عورت کی شان کے مناسب ہو، وہ گری پڑی چیز نہیں، شوہر کو اس سے بولنے میں بھی سلیقہ چاہیے، یہ نہیں کہ جو چاہا کہہ دیا ورنہ طلاق کا اندیشہ ہے، اس ڈر سے شوہر اس کی عزت نفس کا خیال رکھ کر بات کرے گا، شوہر کو ڈرایا گیا ہے کہ عورت کی عزت کرو، اس سے تمیز سے بات کرو، ورنہ کہیں آڑھے ٹیڑھے

بولے تو عورت الگ ہو جائیں گی، غیر معمولی مذاق نہ کرنا، غصے نہ ہونا، شراب نہ پینا، ورنہ ان حالات میں بھی اس لفظ کے منہ سے نکلنے پر طلاق پڑ جائے گی، بلکہ تین طلاق دینے پر تو حلالے جیسی سخت ترین غیرت کے خلاف سزا دی ہے کہ کوئی شخص ہمت ہی نہیں کرے گا، طلاق کو عورت کے لیے رسوائی سمجھا جا رہا ہے، حالاں کہ اس میں شوہر کو حدود میں رکھنے اور عورت کا احترام کرنے کی ضمانت ہے جو اسلام کے علاوہ کہیں نہیں ملتی۔ بہر حال وہ بیوی ہو کر با اختیار، با عزت انسان ہے، وہ ڈھکیلی ہوئی شئ نہیں ہے۔ یہ طریقہ تو جانوروں میں رائج ہے کہ مادہ نر کے پاس لائی جاتی ہے تا کہ گابھن کرائیں، اسلام نے مرد کو طالب بنایا عورت کو مطلوب اور با قیمت کہ اس کے بغیر اس کا حصول دشوار ہے، چناں چہ ”اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِکُمْ“ فرمایا گیا۔

عثمان: لقمان صاحب! اگر عورت کو معاوضہ دے کر ہی مرد اس سے انتفاع کا حق دار بن سکتا ہے ورنہ نہیں، تو پھر عورت کو بھی مرد سے انتفاع ہی کرنا مقصود ہے تو عورت کو بھی مرد کو مہر دینا چاہئے؟

لقمان: مگر اس شکل میں عورت طالب قرار پاتی ہے جس میں اس کی بے عزتی ہے، اسلام مرد ہی کو طالب اور عاشق بنانا چاہتا ہے عورت تو مطلوب ومعشوق ہے، اس کو طالب کی فہرست میں لانا اس کی توہین ہے، اور ظاہر ہے کہ مال طالب خرچ کرتا ہے نہ کہ مطلوب ومحبوب؛ نیز مرد چوں کہ عورت کو اپنے لیے رِزَرْو کر لیتا ہے، اس لیے بھی اس کو ہی مہر دینا پڑتا ہے جب کہ عورت مرد کو رِزَرْو نہیں کر پاتی، مرد دوسری شادی کا حق رکھتا ہے، عورت نہیں۔

عثمان: ایک مرد جب چند عورتوں سے نکاح کر سکتا ہے تو ایک عورت چند مردوں سے بیک وقت کیوں نکاح نہیں کر سکتی، کیا یہ مساوات کے خلاف نہیں ہے؟

لقمان: عورت کے حائضہ یا نفساء ہو جانے کے بعد مرد کس سے جماع کرے، اس لیے اس کو متعدد عورتوں کی ضرورت ہوتی ہے، لیکن ایک عورت جب بھی جماع کرانا چاہے اس کے شوہر کو کوئی حیض ونفاس نہیں آتا کہ وہ یہ مانعِ جماع عذر کر سکے۔

عثمان: جب تعدد ازواج کی ضرورت مرد کو ہو سکتی ہے تو پھر چار ہی میں حصر کی وجہ کیا ہے؟

لقمان: اس کو یوں سمجھ لیجئے کہ اگر کوئی صحت مند شخص روزانہ بلا ناغہ جماع کرنا چاہے تو وہ یہ

ترتیب قائم کرسکتا ہے کہ پہلی بیوی سے تین ماہ تک مسلسل جماع کرے اور فرض کرو کہ وہ اول ایام میں حاملہ ہوگئی تو تین ماہ کے حمل کے بعد اصول صحت کے لحاظ سے جماع اس سے بند کردے تاکہ حمل کو نقصان نہ ہو اور دوسری عورت سے شروع کرے، تین ماہ تک یہ سلسلہ رکھے اور فرض کرو کہ اس دوسری عورت کو بھی پہلے جماع سے حمل ہوگیا تو تین ماہ کے بعد اس سے جماع بند کردے، پھر تیسری سے شروع کرے اور تین ماہ تک سلسلہ جاری رکھے اور تیسری کو بھی فرض کرو کہ اول جماع سے حمل ہوگیا، اب تک پہلی بیوی کے حمل کے نو ماہ ہوچکے، اس کے ولادت ہوگئی ہوگی، مگر نفساء سے تین ماہ تک طِبأ جماع نہ کرنا بہتر ہے، لہٰذا تین ماہ تک چوتھی سے جماع کرے، اس کو بھی اول یوم کے جماع سے حمل ہوگیا تو تین ماہ کے بعد اس سے جماع بند کردے، جب تک پہلی بیوی نفاس کے بعد تین ماہ میں بالکل فارغ ہوچکی، اس سے پھر جماع شروع کرے، اس وقت تک دوسری بچہ دے چکی ہوگی اور جب یہ تین ۳/ ماہ پہلی بیوی کے یہاں دوسرے دور کے پورا کرے گا جب تک دوسری نفاس وغیرہ سے اچھی طرح فارغ ہوچکی ہوگی، اور جب دوسری کے یہاں دوسرے دور کے تین ماہ پورے ہوں گے تب تک تیسری بچہ دینے اور نفاس سے فارغ ہوچکی ہوگی، اور جب تیسری کا دوسرا دور پورا ہوگا تو چوتھی بچہ دینے اور نفاس سے فارغ ہوچکی ہوگی، اس طرح نہ چار سے زائد کی ضرورت ہے اور نہ چار سے کم سے کام چل سکتا ہے، اسی وجہ سے غالبًا چار کے عدد کو ہی تحدید کے لیے مقرر کیا ہے۔

عثمان: لقمان صاحب! آپ تو حکیم الاسلام معلوم ہوتے ہیں خدا کرے کہ آپ سے مذاکرات اور اسلامی قانون پر بات کرنے کا زیادہ سے زیادہ موقع نصیب ہو۔

لقمان: یہ آپ کی ذرہ نوازی ہے کہ آپ نے میری گذارشات کی قدر کی، میں اس کے لیے شکرگذار ہوں۔ السلام علیکم۔

عثمان: وعلیکم السلام۔

(۲۵) کرکٹ

سلیم: السلام علیکم، حفیظ بھائی!

حفیظ: وعلیکم السلام۔

سلیم حفیظ بھائی! آپ تین چار دن سے غائب تھے نظر نہیں آئے۔

حفیظ: جی ہاں! میں کانپور کرکٹ کا میچ دیکھنے کے لیے گیا ہوا تھا۔

سلیم: ہاں صاحب! آپ تو میچ گے عاشق ہوگئے ہیں، کل آپ سے میں نے صرف تین دن جماعت میں چلنے کے لیے کتنی خوشامد کی، مگر آپ کہتے رہے کہ موقع بالکل نہیں ہے، پھر خرچ کا بھی سوال ہے، مگر میچ دیکھنے کے لیے آپ نے کانپور تک کا اتنا طویل سفر کر ڈالا، پھر ٹکٹ بھی ۱۰۰/ روپیہ سے کیا کم میں ملا ہوگا، صحیح ہے انسان جس چیز کو پسند کرتا ہے، جس چیز کا شوق رکھتا ہے، جس بات کو اس کا نفس چاہتا ہے، اس پر بہت وقت، بہت پیسہ خرچ کرسکتا ہے۔

حفیظ: نہیں صاحب! میں کرکٹ کا عاشق تو نہیں ہوں مگر ایک انٹرنیشنل کھیل ہے، ساری دنیا میں اس کی شہرت ہے، پھر دنیا کی بڑی ٹیمیں کھیلنے آتی ہیں، گورنمنٹ کی نگرانی میں یہ کھیل کھیلے جاتے ہیں، اس لیے اس کو نہ دیکھنا ایک فن سے محرومی ہے، آج ایک ملک کے کھلاڑی جب کسی ملک میں کھیل کھیلتے ہیں تو ساری دنیا کے لوگ ریڈیو پر ان کے کھیل کی کومینٹری سنتے اور ٹی وی پر اس کو دیکھتے ہیں اور اس سے محظوظ ہوتے ہیں۔

جہاں کھیل ہو رہا ہو وہاں ہزاروں لوگ ٹکٹ لے کر کھیل دیکھتے اور اس سے لطف اندوز ہوتے ہیں، لاکھوں روپیہ کی حکومت کو آمدنی ہوتی ہے، کھیلنے والوں کو لاکھوں روپیہ کی آمدنی ہوتی ہے۔ دو ملکوں کے درمیان اس سے ثقافتی و تعلیمی تعلقات قائم ہوتے ہیں، پھر جوانوں اور بچوں میں اس کھیل سے لگاؤ پیدا ہوتا ہے اور کھلاڑیوں کی عزت دیکھ کر خود کھیلنے اور اچھے کھلاڑی بننے کے جذبات پیدا ہوتے ہیں جس سے ایک فن فروغ پاتا ہے، ویسے بھی کھیل کا داعیہ انسان میں فطری ہے، اس کے ذریعہ ورزش ہوجاتی ہے،

تندرستی بنتی ہے جو انسان کے لیے ہزار نعمتوں سے بڑھ کر ہے۔

سلیم: حفیظ بھائی! میں اس کا انکار نہیں کرتا کہ کھیل انسان کا فطری جذبہ ہے، نیز میں یہ بھی نہیں کہتا کہ کھیلنا شرعاً ممنوع ہے، نہ میں یہ کہتا ہوں کہ صحت کے لیے ورزش کی ضرورت نہیں ہے لیکن میرا سوال یہ ہے کہ کھیلوں میں کرکٹ ہی کیوں ضروری ہے؟

حفیظ: مگر یہ سوال تو آپ ہر کھیل کے بارے میں کریں گے جو بھی کھیل کھیلا جائے گا، آپ کا یہ سوال کہ یہ ہی کھیل کیوں ضرورری ہے۔

سلیم: نہیں! ہمارا یہ سوال کرکٹ کے بارے میں اس لیے ہے کہ بالآخر لوگوں میں یہ مرعوبیت کیوں آگئی ہے کہ جو کھیل بھی سمندر پار یورپ سے آجائے بس ہم اسی کے دلدادہ بن جاتے ہیں، آخر ہم مشرقی لوگ اپنے کھیلوں کو ان کھیلوں کے مقابلہ میں کیوں ہیچ سمجھنے لگتے ہیں، آخر ہم میں وہ قوت کیوں نہیں ہے کہ ہم اپنے کھیلوں کو بین الاقوامی بنائیں، لوگ اس کو پسند کریں ہم دوسروں کے کھیلوں کو آتے دیکھتے ہی اپنے ملکوں کے کھیلوں سے فوراً دست بردار ہوجاتے ہیں، اور دوسروں کے کھیلوں پر ایسے لٹو ہوجاتے ہیں کہ گویا دنیا میں ان کے علاوہ کوئی کھیل ہی نہیں ہے۔ یہ روش کھیل تک ہی محدود نہیں بلکہ ہر تہذیب لباس، بود و باش، میل جول، تمام ہی چیزوں میں ہماری یہ ہی روش ہے، پھر کسی چیز کو قبول کرتے ہوئے ہم یہ دیکھنے کی بھی زحمت گوارہ نہیں کرتے کہ یہ کھیل جس مقصد کے لیے کھیلے جاتے ہیں، آیا اس مقصد کے لیے بھی یہ مفید ہے یا نہیں۔

حفیظ: جہاں تک مغربی یا یورپی تہذیب سے مرعوب ہونے کی بات ہے واقعتہً یہ جذبہ غلط ہے اور بزدلی کی علامت، مگر مشرقی کھیل آپ کے نزدیک کون کون سے ہیں اور ان میں اور کرکٹ میں برتری کس کو حاصل ہے۔

سلیم: ہمارے مشرقی کھیلوں میں کبڈی، کھوکھو، لاٹھی چلانا، کشتی، تیراندازی، تلوار چلانا یہ مشہور کھیل ہیں۔ ان میں سے بعض اب بھی رائج ہیں بعض ختم ہوتے جارہے ہیں۔ کھیلوں میں دو چیزیں سامنے رکھنی چاہئے: ایک تو اس کا ورزشی پہلو ہے کہ کھیل ایسا ہو جس میں جسمانی ورزش کا پہلو ہو جو صحت کے لیے مفید ہو، دوسرے یہ کہ ورزش کے ساتھ ساتھ اگر اس میں دفاعی پہلو بھی ہو تو بہت اچھا ہے کہ اس کی ضرورت اپنی جان و

مال کے تحفظ کے ساتھ کسی مظلوم کی فریادرسی کے موقع پر بھی رہتی ہے، نیز جہاد وغیرہ میں بھی ضرورت پڑتی ہے، ان باتوں کے علاوہ یہ بھی ضروری ہے کہ اس میں کوئی ایسی شرط یا شکل نہ ہو جو شرعاً ممنوع اور ناجائز ہو، ان اصولوں کو سامنے رکھ کر جب ہم اپنے مشرقی کھیلوں کا جائزہ لیتے ہیں تو ان سب میں یہ باتیں نظر آتی ہیں یعنی ورزشی پہلو بھی ہے اور دفاعی بھی کہ آدمی جب اس کی مشق کرتا رہتا ہے تو جسمانی صحت بھی بہتر ہوتی ہے، قوت بڑھتی ہے، جسم قوی اور فربہ ہوتا ہے، وہیں دفاعی پہلو بھی اس میں ہے کہ اس کے داؤ پیچ کے ذریعہ آدمی اپنے سے دُگنے وزن اور طاقت کے آدمی کو شکست دے سکتا ہے اور اپنی جان و مال کا تحفظ کرسکتا ہے۔ اسی طرح تیراندازی، تلوار بازی، لاٹھی، ان سب میں ورزش بھی ہے اور دفاعی پہلو بھی ہے کہ تیرانداز، تلوار باز اور بہترین لاٹھی چلانے والا جسمانی ورزش کے ساتھ ساتھ اس فن سے موقع پڑنے پر اپنی جان و مال عزت و آبرو کا تحفظ کرسکتا ہے، بلکہ بعض دفعہ اچھا لاٹھی چلانے والا اکیلا ہزاروں کے مجمعوں کو دفع کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے، اور یہ کھوکھو اور کبڈی قدیم اور لوکل کھیل ہیں، جو ہر جگہ کھیلے اور منعقد کیے جاتے ہیں، ورزشی لحاظ سے بھی ان کی بڑی افادیت تھی، اور دفاعی لحاظ سے بھی ان کی افادیت اچھی خاصی تھی، ایک دوسرے کو پکڑنا، قبضہ میں کرنا، اس کو چھونے کی کوشش کرنا، لیکن یہ سارے مشرقی کھیل جن میں ورزش اور دفاع دونوں پہلو تھے، ہماری مرعوبیت اور احساسِ کمتری کا شکار ہوگئے اور ہم لوگ پوری طرح مغرب سے آنے والے وولی بول، فٹ بول، کرکٹ، باکسنگ، ٹینس، ہاکی، شطرنج، کیرم، بیڈمنٹن پر لٹو ہوگئے، ایسے فریفتہ ہوئے کہ سوائے ان کھیلوں کے گویا کوئی دوسرا کھیل، کھیل ہی نہیں ہے۔ اور آج سب سے زیادہ ہم کرکٹ کے دیوانے ہیں جب کہ ان کھیلوں کا حال یہ ہے کہ کھیل کے دونوں مقصد (یعنی ورزش اور دفاعی مشق) ان میں بہت ہی کم پائی جاتی ہے، بلکہ بعض میں ایک پہلو ہے تو دوسرے پہلو سے بالکل خالی ہے، مثلاً کیرم اور شطرنج میں نہ ورزش ہے نہ دفاع، زیادہ سے زیادہ دماغی چالیں ہیں، مگر اسی دماغی کھیل سے جسمانی ورزش یا دفاع کا کوئی تعلق نہیں زیادہ سے زیادہ دماغی ورزش ہے، ٹینس، بیڈمنٹن، کرکٹ، فٹ بال، وولی بول میں ورزش ہے تو دفاعی پوزیشن انتہائی کمزور ہے، اگر کسی شخص پر کوئی حملہ کردے یا ایک گروہ دوسرے گروہ پر حملہ آور ہو تو

ان کھیلوں کا ماہر کوئی دفاع نہیں کرسکتا، خصوصاً وہ دفاع تو قطعاً نہیں کرسکتا جو لاٹھی یا تلوار
کا ماہر کرسکتا ہے یہی حال آج کے ایک بہت مشہور فن باکسنگ کا ہے کہ اس میں ورزش اور
دفاع جو لاٹھی یا تلوار میں ہے، نہیں ہے، بلکہ شخصی دفاع بھی کشتی سے کم ہے کشتی کا ماہر
باکسنگ والے کو اپنے داؤ سے زیر کرسکتا ہے، باکسنگ والا کشتی والے پہلوان کے ہاتھ
چاہے توڑ دے مگر پٹک نہیں سکتا وہ پیر کے ایک داؤ میں اس کو چت کرسکتا ہے اور لاٹھی
والے کا تو کوئی مقابلہ ہی نہیں، وہ تو ہزاروں کی صفیں الٹ سکتا ہے۔ بہر حال ان سب
باتوں کے باوجود مشرقی کھیلوں میں ورزش اور دفاع دونوں نفع ہیں؛ مشرق والوں کا
حال یہ ہے کہ اپنے اتنے مفید کھیلوں کو چھوڑ کر بس کرکٹ پر لٹو ہوگئے ہیں؛ یہ صرف
مرعوبیت، احساس کمتری اور مغرب کی تقلید کے جنون کے علاوہ کچھ نہیں۔ مغرب نے
ہمت اور کوشش کرکے اپنے اتنے غیر مفید کھیلوں کو ساری دنیا میں مقبول بنالیا مگر ہمارا
حال یہ ہے کہ ہم ساری دنیا میں مقبول کیا بناتے خود ہم نے ہی اپنے وطن سے اپنے
کھیلوں کو دیش نکالا دیدیا، اور ہمیں اپنے ہی کھیل اپنی نظر میں حقیر معلوم ہونے لگے،
اب رات دن ہماری نظر کرکٹ کے کھیل پر ہے، جو اتنا خطرناک ہے کہ گیند اگر کسی کے
لگے تو اس کی زندگی ہی ختم ہوجائے، گیند کیا ہے؟ پتھر ہے، اس سے حفاظت کے لیے
موٹے موزے جسم کے کئی حصوں پر پہننے پڑتے ہیں، تب بھی جس عضو پر لگی اس کو بیکار
کردیتی ہے، جب کہ کبڈی یا کھوکھو میں اتنے زیادہ زخمی ہونے کا کوئی امکان نہ تھا۔ اسی
طرح کرکٹ کا کھیل خرچیلا بھی بہت ہے، ایک بیٹ نیٹ اور دوسرا اس کا سامان بے حد
مہنگا ہے، غریب آدمی نہ تو یہ سامان خرید سکتا ہے نہ اس کے لیے اتنا لمبا فیلڈ بنا سکتا ہے،
جبکہ کھوکھو، کبڈی، کشتی اور لاٹھی کے کھیل میں کوئی خرچ ہی نہیں ہے۔ ہر شخص اس کو کھیل
سکتا ہے، پھر کرکٹ میں وقت بھی بہت لگتا ہے، پانچ دن کھیلا جاتا ہے، جب نتیجے برآمد
ہوتے ہیں؛ جب کہ مشرقی کھیل بہت کم وقت میں جلد ہار جیت بتلادیتے ہیں، کرکٹ
کے کھیل میں ہار جیت بتانے کے لیے الگ آدمی کی ضرورت رہتی ہے، خود کھیلنے والے
کے نہ تو کوئی بات اختیار میں نہ اس کو یہ معلوم کہ میں آؤٹ ہوا یا نہیں، جب کہ مشرقی
کھیل میں خود کھلاڑی ہر منٹ میں اپنے ہارنے جیتنے کا فیصلہ خود کرلیتا ہے جس سے
لڑنے بھڑنے کا کوئی سوال ہی نہیں رہتا، پھر کرکٹ ایسا کھیل ہے جو بارش میں نہیں

کھیلا جاسکتا، تھوڑی جگہ میں نہیں کھیلا جاسکتا، کم ساتھیوں کی موجودگی میں نہیں
کھیلا جاسکتا، بلا سامان کے نہیں کھیلا جاسکتا، جب کہ مشرقی کھیل ہر موسم میں اور بہت کم
ساتھیوں کے ساتھ ہر وقت کھیلے جاسکتے ہیں۔

سلیم: حفیظ بھائی! آپ نے مشرقی کھیلوں میں جو دفاعی پہلو کی بات کی اور یوروپی
کھیلوں کو اس سے خالی بتلایا مگر سوال یہ ہے کہ اب دفاع کے لیے یورپ میں ایسے ایسے
آلات بندوق، توپ، ایٹم بم کی شکل میں ایجاد کردیئے کہ جسمانی دفاع کی ضرورت ہی
کہاں ہے؟ اس لیے اگر صرف ورزشی پہلو کھیل میں ہو تو کافی ہے۔

حفیظ: مگر کیا بندوق، توپ ہر شخص کو ہر وقت فراہم ہے، آپ بلا لائسنس تو بندوق نہیں
رکھ سکتے، اگر کسی نے آپ کے گھر یا خود آپ پر حملہ کردیا تو آپ لاٹھی چلانا نہیں جانتے،
کسی کو پکڑنا اور پٹکنا بھی آپ نے کشتی اور کبڈی کے ذریعہ نہیں سیکھا، تو آپ ابتدائی
دفاع بھی نہیں کرسکتے۔

سلیم: تو کیا آپ کی نظر میں کرکٹ کھیلنا ممنوع ہے؟

حفیظ: فی نفسہٖ ممنوع نہیں، اگر تمام ناجائز چیزوں سے بچتے ہوئے کھیلا جائے۔ لیکن سوال
جواز یا عدم جواز کا نہیں، سوال اس پاگل پن اور جنون کا ہے، جو اس کے دیکھنے اور کھیلنے
والوں اور کھلانے والوں پر سوار ہے، ریڈیو، ٹیلی ویژن، اخبارات، رسائل اس کی خبروں
سے بھرے پڑے ہیں، اگر کسی ملک میں کھیلا جارہا ہو تو کوئی ہوٹل کوئی دوکان، کوئی گلی،
کوئی محلہ، کوئی مجلس اس کے ذکر سے خالی نہیں؛ گویا پوری قوم اس کے ذکر میں مست
ہے۔ دفاتر، اسکول میں کام بند ہیں اور شرطیں باندھی جارہی ہیں کہ کون جیتے گا؟ بچے،
بوڑھے، جوان مرد، عورت سب دیوانے بنے ہوئے ہیں، کوئی بیٹ مین پر فدا ہے، تو
کوئی بلّے باز پر، کوئی بولر پر، لاکھوں کی دولت کھلاڑی اور کھیل پر لٹ رہی ہے، لاکھوں
کے ٹکٹ بک رہے ہیں، اگر ہار جائیں تو فساد ہو رہے ہیں، جیت جائیں تو پٹاخے
جلائے جارہے ہیں؛ گورنر، منسٹر، صدرِ مملکت اجلاس روک کر جیتنے والوں کو مبارکباد دے
رہے ہیں، ریڈیو خبروں کے پروگرام روک کر کھیل کی خبریں نشر کررہے ہیں، اخبار اور
رسالے اسپیشل نمبر نکال رہے ہیں، کھلاڑیوں کے فوٹو اور دستخط بک رہے ہیں، ان کو
راستہ سے نکلنا مشکل لوگ ان پر ٹوٹے پڑ رہے ہیں، ان کو پورے ملک کی سیر کرائی

جارہی ہے، ہر جگہ ان کے چرچے ہیں، حتیٰ کہ ہار کی خبر پر بعض کے ہارڈ فیل ہو گئے، بعض جیت کی خوشخبری کی تاب نہ لاکر چل بسے، بعض لڑکیوں کی کھلاڑیوں کے پھرتیلے بدن کے تصور سے نیند حرام ہے، کوئی ان کے نام کا وظیفہ جپ رہی ہے، کوئی اس کا نام محرم کے نیچے رکھے پھرتی ہے، کوئی ان کو بوسہ دینے یا لینے کی فکر میں مبتلا ہے؛ بعض خبریں تو یہاں تک ملی کہ کومنٹری سننے والوں کا شوق اتنا بڑھ گیا ہے کہ ہاسپٹل کے آپریشن روم میں بوقت آپریشن بھی ڈاکٹروں کے کان ریڈیو سیٹ کی کومنٹری پر لگے رہتے ہیں، الامان والحفیظ۔ اسٹیڈیم میں دیکھو تو لاکھوں کا مجمع اور دیکھنے والے کھیلنے والوں سے زیادہ پُر جوش بلکہ زائرین ایسا اچھل کود کرتے ہیں کہ گویا وہ خود کھیل رہے ہیں، بعضے تو رات خواب میں بھی چارپائی سے اُچھل کر کود پڑے، ہڈی ٹوٹ گئی۔ معلوم کیا تو پتہ چلا کہ خواب میں کرکٹ دیکھ کر اچھلے تو یہ حال ہوا، خدا رحم کرے کامیاب ہونے والوں پر حکومت زائرین اور کمپنیاں روپیہ کی تھیلیوں کے منہ کھول دیتے ہیں، جب کہ یہی لوگ ریلیف کمیٹی کے سامنے کنگال ہو جاتے ہیں، پھر اگر کھلاڑی مسلم ہے تو نہ نماز کے اوقات کی پرواہ، نہ کشفِ ستر کی پرواہ، نہ لڑکیوں سے ہاتھ ملاتے ہوئے کوئی شرم، یہ ہے کرکٹ کا میچ، جس کی کل کائنات یہ ہے کہ ایک شخص نے باؤلوں کی طرح ترچھا بدن کرکے، ہاتھ الٹا کرکے، ایک گیند پھینکی، دوسرے صاحب نے ایک بیٹ کے ذریعہ اس کو اسٹمپ سے لگنے سے روکتے ہوئے بلّہ مار کر واپس کر دیا، اگر اچھل گئی تو کسی نے چیل کی طرح جھپٹ کر پکڑ لیا اگر جلد پکڑ نہ پائے تو اس کے درمیان بیٹ مین نے اس فاصلے کے درمیان کچھ حرکتِ مستقیمہ والے چکر لگا لئے ایک گننے والے نے ان پھیروں کو گن لیا، اور اس کا اعلان کر دیا، جس کی گیند پکڑ لی گئی تو اس کا وکٹ پڑ گیا، پیر میں گیند جھیل گئی تو ایل بی ڈبلیو (L.B.W) ہو گیا اور جھیل لی گئی تو کیچ ہو گیا۔

بہر حال یہ ہے اس اوٹ پٹانگ کھیل کی ترکیب جس پر دنیا باؤلی بنی ہوئی ہے، آپ کو میری باتوں سے اتفاق نہیں، کیا سب غلط کہہ رہا ہوں۔

حفیظ: بھائی! آپ نے بالکل بجا فرمایا، مگر اب پانی سر سے اوپر چڑھ چکا ہے، اس لیے اس سیلاب کو روکنا مشکل ہے، اس کھیل کے سیلاب میں سارے مشرقی کھیل بہہ چکے ہیں، اب تو دنیا اس کا انتظار کر رہی ہے کہ دیکھو کرکٹ کا سیلاب کب اترتا ہے اور اس کی

جگہ یورپ اور کونسا ایسا پیش کرتا ہے جو عالمگیری میں اس سے بڑھ جائے، آپ جیسے سوچنے والے اور غیرت رکھنے والے لوگ خال خال ہی رہ گئے ہیں اور جو ہیں بھی ان کو دنیا دقیانوس قرار دے رہی ہے۔

حفیظ: جی ہاں! دنیا دقیانوس کہتی ہے مگر ہم تو جو بات سچ ہے اس کو ڈنکے کی چوٹ پر کہتے رہیں گے۔

سلیم: آج آپ سے اس موضوع پر گفتگو سن کر بڑی خوشی ہوئی، میں اپنے سنجیدہ ساتھیوں تک انشاء اللہ آپ کی بات پہونچاؤں گا، شاید اس سے ان کے جنون میں کچھ کمی آئے۔

حفیظ: آپ ضرور ان سے کہئے، کمی آئے یا نہ آئے، ہمارا کام کہنا ہے، تم تو ان کو سمجھا کر یہ کہتے رہو، مانیں یا نہ مانیں یہ انہیں اختیار ہے، ہم تو نیک و بد تمہیں سمجھائے جائیں گے۔

سلیم: اچھا! السلام علیکم۔

حفیظ: وعلیکم السلام۔

(۲۶) سورج گہن

جاوید: اقبال صاحب! السلام علیکم۔

اقبال: وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ۔

جاوید: اقبال صاحب! کیا آج آپ سورج گہن کی نماز میں شریک تھے۔

اقبال: جی نہیں! میں شرکت نہ کرسکا بڑا صدمہ رہا، میں چند دن سے اخبارات میں پڑھ رہا تھا کہ یہ گہن بہت برسوں کے بعد اس نوعیت کا ہونے والا ہے اور اپنے ملک میں بعض جگہ تو مکمل گہن کی خبریں تھیں۔

جاوید: اس کے باوجود کہ آپ کو پہلے سے علم تھا، تب بھی نماز میں شریک نہ ہوسکے۔

اقبال: تو آپ اتنے خفا کیوں ہورہے ہیں یہ نماز کوئی فرض تو تھی نہیں۔

جاوید: جی ہاں! فرض تو نہیں تھی آپ نے جو یہ صدری پہن رکھی ہے کیا یہ پہننا بھی فرض ہے۔

اقبال: فرض تو نہیں شوق میں پہن رکھی ہے۔

جاوید: جی ہاں! پہننے اوڑھنے، کھانے پینے اور بنیاوی اسباب وآرائش میں تو ضروری چیزوں کے علاوہ سیکڑوں شوق کی چیزیں اور آرائش کا اتنا اہتمام مگر دین کے معاملہ میں اتنی بے پرواہی کہ جب تک فرض واجب نہ ہو تب تک کریں گے ہی نہیں، ارے میاں! یہ ہی سنن ومستحبات قیامت میں وہ درجے دلوائیں گے کہ انسان حیرت کرے گا کہ نفلی عبادت پر اتنا ثواب، انہیں نوافل اور مستحبات نے لوگوں کو جنید وشبلی بنادیا، اور آپ فرمارہے ہیں کہ یہ فرض کہاں ہیں، دنیاوی چیزوں میں معمولی معمولی چیز کے بغیر آپ رہ نہیں سکتے اور دین کے معاملہ میں اتنا استغناء کہ سوائے فرض کے کسی چیز کے کرنے کو آپ کا دل ہی نہیں چاہتا، اللہ رحم فرمائے۔

اقبال: اچھا جاوید صاحب! یہ باتیں چھوڑیئے مجھے اپنی غلطی تسلیم ہے، آپ تو اب یہ بتلایئے کہ یہ گہن کیا ہے، کیوں ہوتا ہے؟

جاوید: اقبال صاحب! گہن چوں کہ ایک قدیم چیز ہے، جب سے یہ عالم وجود میں آیا اور چاند سورج کی گردشیں دنیا میں قائم ہوئیں تب ہی سے گہن کا سلسلہ جاری ہے، چوں کہ سورج زمین سے تقریباً ۹ رکروڑ میل دور ہے، اس لیے حقیقت کیا ہے اس کو جاننا دشوار ہی ہے، اس لیے ہر دور میں تحقیق وتلاش کی جتنی قوت لوگوں کے پاس رہی، اسی کے مطابق گفتگو ہوتی رہی بعض مذاہب نے بھی اپنے ماننے والوں کو اس کی وجہ بتلائی ہے کہ یہ کیوں ہوتا ہے، جب اسلام کا زمانہ آیا اس وقت مختلف عقائد ونظریات اس سلسلے میں پائے جاتے تھے، اسلام نے اپنے طرز سے گفتگو کی اور ہدایات دیں، آج جب کہ سائنس عروج پر ہے، جگہ جگہ رصدگاہیں قائم ہیں فلکیات اور سیارات کے بارے میں کافی تحقیقات کی جارہی ہیں، لہٰذا گہن کے بارے میں بھی بہت سی باتیں سامنے آئی ہیں۔

اقبال: جاوید صاحب! ہمارے ملک میں سب سے بڑی تعداد ہندو مذہب کے لوگوں کی ہے ان کے مذہب کی رو سے گہن کیوں ہوتا ہے۔

جاوید: ہندو مذہب کی قدیم روایات سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے شر کا منبع راکشسوں کو قرار دیا ہے اور خیر کا مرکز دیوتاؤں کو مانتے ہیں۔ دیوتاؤں اور راکشسوں میں ہمیشہ لڑائی رہی ہے جیسے کہ خیر اور شر میں تضاد ہے ایک مرتبہ دیوتاؤں اور راکشسوں نے مل کر ایک پہاڑ کو سمندر میں ڈھکیل دیا اور ایک سانپ جس کو "شیس ناگ" کہتے ہیں، اس پہاڑ کو لپیٹ دیا دیوتاؤں اور راکشسوں نے مل کر، ایک ایک طرف اس لپٹے ہوئے سانپ کو پکڑ کر پہاڑ کو، رئی کی طرح گھما کر سمندر کو بلونا اور متھنا شروع کیا، اس کو سمندر متھن کتھا کہا جاتا ہے، بلوتے بلوتے سمندر سے امرت نکلا، اس کو وشنو بھگوان نے لے لیا، اور کہا کہ میں سب کو پلاؤں گا، تاکہ امرت (آبِ حیات) پی کر سب دیوتا امر ہو جائیں، راکشس بھی پینے کے امیدوار تھے، ایک طرف دیوتاؤں کو بٹھایا گیا، دوسری طرف راکشس بیٹھے، پہلے دیوتاؤں میں دور چلا، ایک راکشس نے سمجھا کہ وشنو سارا دیوتاؤں کو پلادیں گے، ہم رہ جائیں گے، چناں چہ وہ دیوتا کی شکل میں آکر دیوتا کے گروپ میں شامل ہوگیا، دیوتاؤں کے گروپ میں سورج دیوتا، چاند دیوتا بھی بیٹھے ہوئے تھے، انہوں نے دیکھا کہ یہ یہاں آبیٹھا ہے تو ان دونوں نے وشنو بھگوان سے

شکایت کردی وشنو نے غصے میں اس راکشس کو قتل کردیا سر دھڑ سے الگ کردیا، مگر یہ شکایت اس وقت ہوئی جب وہ امرت پی چکا تھا او امرؔ ہو چکا تھا، اس راکشس کے سر سے راہو اور جسم سے کیتو دو اور راکشس بن گئے اور وہ دونوں سورج چاند کے چغلی کرنے کی وجہ سے دشمن ہو گئے، اب وہ چاند سورج پر حملہ کرتے رہتے ہیں، راہو کی زد سے چاند گرہن اور کیتو کی مار سے سورج گرہن ہوتا ہے، راکشس کو مار کر وشنو بھگوان بچا ہوا امرت ایک گھڑے میں جس کو کمبھ کہتے ہیں لے کر بھاگے تو اس کے چند قطرے کمبھ میں سے پریاگ ندی میں اور چند قطرے ایک تالاب میں گر گئے، اس لیے اب دونوں جگہ ہر بارہ سال کے بعد کمبھ کا میلا لگتا ہے اور لوگ اس امید پر وہاں غسل کرتے ہیں کہ شاید امرت کا کوئی حصہ ہم کو مل جائے اور عمر طویل ہو جائے اور گناہوں سے پاک ہو جائیں، ہندو لوگ گہن کے وقت راہو اور کیتو کے شر سے محفوظ رہنے کے لئے دان بھی کرتے ہیں، اور خود اس وقت سورج کا سامنا کرنے سے ڈرتے بھی ہیں اور اس کے اثرات کے بھی قائل ہیں، گہن کے بعد کسی متبرک تالاب میں نہاتے بھی ہیں۔

اقبال: آج کی سائنس اس کے بارے میں کیا کہتی ہے؟

جاوید: سائنس کی رو سے زمین سورج کے گرد چکر لگاتی ہے اور اسی گردش سے رات دن وجود میں آتے ہیں اور چاند زمین کے گرد چکر لگاتا ہے، جب زمین اور سورج کے درمیان چاند حائل ہو جاتا ہے تو سورج گہن ہوتا ہے اور جب زمین، سورج اور چاند کے درمیان حائل ہو جاتی ہے تو چاند گرہن ہوتا ہے۔ ان کُروں کی گردش اپنے اپنے حساب سے ایک خاص تناسب کے ساتھ قائم ہے، جب وہ ایک دوسرے کے محاذ میں آتے ہین تو ایک دوسرے کے لیے حاجب بن جاتے ہیں، جس کی وجہ سے روشنی دب جاتی ہے اور ایک کا سایہ دوسرے پر پڑتا ہے اور گہن معلوم ہونے لگتا ہے، زمین پر بھی پوری روشنی نہیں آپاتی۔

اقبال: اسلام نے اس سلسلہ میں کیا کہا؟

جاوید: اسلام کا موضوع قطعاً یہ نہیں ہے کہ کائنات کے رازوں اور حقائق کو ظاہر کر کے اور اس کے نظام کی حقیقت اور فلکیات، سیارات اور طبقات الارض پر بحث کرنے میں اپنا وقت صرف کرے، نہ اس کے مخاطبین اولین اس کی خوگر تھے اور نہ متحمل، وہ انتہائی

بھولے بھالے تھے، اسی لیے قرآن نے ان کی فہم کو سامنے رکھ کر گفتگو کی ہے، اس کا موضوع انسان کی ہدایت، ان کو اللہ کا بندہ بنانا اور زندگی کے آداب سکھلانا ہے؛ البتہ اتنا ہے کہ اسلام اس پر ضرور نگاہ رکھتا ہے کہ کائنات میں ظاہر ہونے والے واقعات خواہ سفلیات سے متعلق ہوں یا علُویات سے ان کو انسان مؤثر حقیقی نہ سمجھ لے، جس سے اللہ کو مؤثر حقیقی ماننے والے عقیدے پر زد پڑتی ہے نیز اسلام اس کی کوشش کرتا ہے کہ اپنے ماننے والوں کو اس کی تعلیم دے کہ کائنات میں ہونے والے ہر تغیر اور حادثے سے وہ عبرت پکڑیں، انابت الی اللہ پیدا کریں اور دوسری قوموں کی طرح اس کے بارے میں غلط عقائد کے قائل نہ ہوں، جیسے کہ کسوف کو کسی شخصیت کی موت کا اثر سمجھنا، اور ایسے موقع پر غیر اسلامی اعمال کا اِرتکاب بھی نہ کریں، مثلاً بھیک مانگنے کو نکل پڑنا وغیرہ، چناں چہ اسلام کو اس کا اندیشہ ہوا کہ لوگ اس موقع پر کسی غلط عمل میں مشغول نہ ہو جائیں تو اسلام نے اُس وقت مسلمانوں کے لیے صلوٰۃ کسوف کے عمل کو مشروع قرار دیا، تا کہ مسلمان دوسروں کے وضع کردہ کسی عمل کے بجائے خالص اسلامی عمل میں مشغول رکھنے کی ہدایت دی، اور گہن کو ایک نشانی اور آیت سمجھنے پر زور دیا، اس کو قدرت کا ایک کرشمہ سمجھنے کو کہا، اور یہ یقین پیدا کرنے کو کہا کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کے آگے یہ بڑے بڑے سیارے بھی بے بس اور سرنگوں ہیں، ان کو جن رفتاروں کے ساتھ جس حساب سے چلنے کا حکم دیا ہے اس میں ایسے جکڑے ہوئے ہیں کہ سرِ مو، اس کے خلاف پر قادر نہیں، پھر انسان کیسے سرکشی کی جرأت کرتا ہے، رہ گئی سائنس کی تحقیق، تو وہ اسلام کے خلاف نہیں، اس لیے کہ اسلام نے اگر چہ مخاطبین اولین کی رعایت میں گہن کے بارے میں سائنسی بحث کو نظر انداز کر دیا ہے مگر چوں کہ اسلام قیامت تک کے علوم کا مقابلہ کرنے والا بنا کر بھیجا گیا ہے اس لیے اسلام نے اجمالاً ان سیاروں کی رفتاروں کو ان کے حساب میں جکڑے ہونے اور ایک مقدار پر چلنے کو ذکر کر دیا ہے تا کہ یہ معلوم ہو جائے کہ یہ سیارے اور چاند و سورج ایک نظام کے تحت رواں دواں ہیں اور ظاہر ہے کہ اس گردش اور رفتار کے دوران ان کا کبھی کسی کے لیے حاجب بننا کوئی بعید بات نہیں بلکہ بسا اوقات ناگزیر بھی ہے، تو سائنسی تحقیق اسلام کے خلاف نہیں بلکہ اس کی تائید کے لیے قرآن کی آیات موجود ہیں، کہیں حاجب بننے کی نوعیت یا حجاب کی مقدار یا حجاب کے اوقات یا حجاب

کے کسی سن یا صدی میں وقوع کی تعداد سے اسلام نے بحث نہیں کی نہ یہ اس کا موضوع تھا، البتہ اگر تحقیقات سے یہ سب باتیں معلوم ہو جائیں تو اسلام کی تعلیم قطعاً اس کے منافی نہیں ہے نہ اسلام پر اس کی کوئی زد ہے، اگر سائنس علویات کے سفلیات پر کچھ اثرات مرتب ہونے کے خبر دے تو اسلام اس کا انکار نہیں کرتا، وہ صرف مؤثر حقیقی ماننے سے انکار کرتا ہے، ہاں! نفسِ اثرات کا انکار نہیں کرتا ایسے موقع پر اسلام کا مین (Main) مقصد عقیدہ اور عمل کا تحفظ، عبرت پذیری کی طرف مائل اور اچھے اعمال میں مشغول رکھنا ہے، جس کی ہدایت اس نے صلوٰۃ کسوف اور تہلیل و تکبیر کی ترغیب کی شکل میں دی ہے۔

اقبال: جاوید صاحب! آپ تو بڑی معلومات کے حامل معلوم ہوئے، مجھے کسوف کے سلسلہ میں بڑی تشفی بخش معلومات آپ سے حاصل ہوئیں۔

جاوید: یہ آپ کی ذرہ نوازی ہے، ورنہ میں کیا، میری ملاقات کیا۔ السلام علیکم

اقبال: وعلیکم السلام۔

(۲۷) کشش ارض

سلیم : جمیل صاحب! السلام علیکم۔

جمیل: وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔

سلیم جمیل صاحب! یہ آج آپ جھکے جھکے کیوں چل رہے ہیں، کیا کمر میں درد ہے؟

جمیل: نہیں بھائی کمر میں درد کہاں یہ تو کشش ارض کی کارفرمائی ہے، کیا تم نے یہ نہیں پڑھا کہ نیوٹن فلسفی کہتا ہے کہ جو چیز بھی زمین پر گرتی ہے، یا اوپر سے نیچے کی طرف آتی ہے، اس میں کششِ ارض کو دخل ہے، نیوٹن نے ایک مرتبہ دیکھا کہ ایک سیب ایک شاخ سے ٹپکا اور نیچے آکر گرا، اس سے اس نے کشش ارض کی تھیوری اخذ کی، اللہ کا بندہ یہ نہیں سمجھا کہ یہ تو شئ کے وزنی ہونے کا اثر ہے، ہر چیز کا وزن اس کو نیچے آنے پر مجبور کرتا ہے، دیکھئے اس وقت ایک پتھر اگر اوپر پھینکا جائے تو وہ ضرور نیچے واپس آئے گا، ظاہر ہے کہ پتھر کو نیچے اس کا وزن لائے گا۔ یہ اس کی حرکتِ طبعی ہوگی جو جمادات میں پائی جاتی ہے۔ اللہ رحم کرے ان بدھوؤں پر یہ لوگ تو جو چاہیں عقل کے خلاف بات چالو کر دیتے ہیں اور دنیا ہے کہ اس پر سر دُھننے لگتی ہے۔

سلیم جناب! اس تھیوری کے مان لینے میں کیا حرج ہے، واقعۃً مادیات میں کشش ہوتی ہے اور زمین کی کشش کے تو سبھی قائل ہو چکے ہیں۔

جمیل: ارے صاحب! عقل کے ناخن لیجئے، ذرا اتنا تو سوچو کہ اگر کششِ ارض ہوتی، تو ہوا میں اُڑتی ہوئی روئی یا کاغذ کا ٹکڑا جو انتہائی ہلکا ہوتا ہے، اس کو کششِ ارض سے جلد نیچے آنا چاہئے تھا نہ کہ صرف وزنی چیز پتھر، لوہا وغیرہ کو؛ معلوم ہوا کہ چیز وزن اور طبیعت کی وجہ سے نیچے گرتی ہے نہ کہ کششِ ارض سے۔

سلیم جناب! میرے نزدیک تو یہ تھیوری نہ قرآن کے خلاف ہے اور نہ مشاہدے کے، مثلاً قرآن مجید نے کہا ہے: وَ جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ کِفَاتًا اَحْیَاءً وَّ اَمْوَاتًا۔ کہ ہم نے زمین کو مُردوں اور زندوں کو کھینچنے والا اور جمع کرنے والا بنایا۔ معلوم ہوا کہ زمین میں

کشش ہے، پھر ہم دیکھتے ہیں کہ مادیات میں سے مقناطیس جو ارضیات ہی سے ہے، اس میں کشش موجود ہے کوئی انکار نہیں کر سکتا، تو جب جزءِ ارض میں کشش ہے تو کلِ ارض میں بدرجۂ اولیٰ کشش ہوگی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اگر کوئی چیز غیر ذی روح ہو تو وہ خود سے حرکت نہیں کر سکتی جب تک اس کے لیے کوئی خارجی محرک نہ ہو۔ دیکھو! پتھر اس وقت تک اوپر نہیں جا سکتا ہے جب تک کوئی اس کو پھینکے نہیں، چوں کہ وہ جماد ہے، غیر ذی روح ہے۔ لہٰذا جب وہ اوپر بلا کسی محرک اور پھینکنے والے کے نہیں جا سکتا تو اوپر سے نیچے بھی بلا کسی محرک کے نہ آنا چاہئے؛ ظاہر ہے کہ وہ محرک زمین ہی کی کشش ہے جو اُسے اوپر سے نیچے لاتی ہے۔ اسی وجہ سے نیوٹن نے جب ایک سیب کو شاخ سے نیچے کی طرف بلا کسی محرک آتے دیکھا، تو اس سے نتیجہ اخذ کیا کہ زمین ہی کی کشش اس کو نیچے لا رہی ہے۔ یہ ہی وجہ ہے کہ جب کوئی چیز اوپر سے نیچے گرتی ہے، تو وہ پہلے لمحات میں اتنی تیزی سے نیچے نہیں آتی جتنا کہ زمین سے قریب پہونچنے کے وقت تیزی سے آتی ہے، مثلاً ایک کلو وزنی چیز، چار میل اوپر سے گرے، تو وہ پہلے میل کی مسافت زیادہ وقت میں طے کرے گی اور دوسرے میل کی مسافت پہلے سے کم وقت میں طے کرتی ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ کشش ارض ہی کا نتیجہ ہے کہ جتنا زمین سے قریب ہوتا جاتا ہے کششِ ارض بڑھتی جاتی ہے، اور جتنا وہ اوپر جائے گی کششِ ارض کم ہوتی چلی جائے گی، اور شئ کا ثقل کم محسوس ہونے لگتا ہے، حتیٰ کہ مدارِ ارض سے نکل کر چیز بالکل ہلکی ہو جاتی ہے، اگر اس کو نیچے چھوڑا جائے تو کیوں کہ کششِ ارض ختم ہو چکی اس لیے وہ شئ نیچے نہیں آئے گی۔ چناں چہ مدارِ ارض سے اوپر راکٹ میں سوار لوگ راکٹ سے باہر نکل آتے ہیں، مگر گرتے نہیں ہیں معلق رہتے ہیں؛ اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ مختلف الوزن پتھر کسی متعینہ دوری سے ایک ساتھ نیچے گریں تو سب کے سب ایک ساتھ نیچے پہونچتے ہیں، اگر کششِ ارض نہ ہوتی تو ایک کلو وزن کا پتھر آدھا کلو وزن کیلو وزنی پتھر سے پہلے نیچے آنا چاہئے تھا، اور آدھا کلو وزن کو بعد میں مگر ایسا نہیں ہوتا بلکہ سب ایک ساتھ نیچے پہنچتے ہیں؛ معلوم ہوا کہ چوں کہ کششِ ارض ایک ہے اور وہ یکساں ہے اس لیے سب پتھر باوجود مختلف الوزن ہونے کے ایک ساتھ زمین پر پہنچتے ہیں۔

پھر کسی چیز کا نیچے آنا کششِ ارض سے اس وقت ہوگا جب کہ ہوا کا دفاع معارض نہ ہو،

روئی یا کاغذ کا ٹکڑا اس لیے نیچے نہیں آتا کہ ہوا اس کو اوپر کی طرف دفع کرتی ہے، اگر اسی روئی کے ٹکڑے کو ایسی نلکی میں ڈالا جائے جس میں ہوا کھینچ لی گئی ہو تو وہ بھی پتھر کی طرح تیزی سے نیچے گرے گی، اس سے معلوم ہوا کہ کششِ ارض موجود ہے کوئی مادی چیز جتنی اوپر جائے گی یا زمین کے اندر جتنی اترتی جائے گی اتنی ہی کششِ ارض کم ہوتی جاتی ہے اور چیز ہلکی ہونے لگتی ہے۔

بہرحال اب یہ مسئلہ تقریباً بدیہی ہوتا جا رہا ہے، پھر شرعی کوئی معارض بھی نہیں ہے اس لئے اس سے انکار کرنا مشاہدہ کا انکار ہوگا، ویسے بھی ہم نے ہر چیز کی اصل زمین کو مانا ہے اور ظاہر ہے کہ چیز اپنی اصل ہی کی طرف رجوع کرتی ہے۔

جمیل: سلیم صاحب! آپ تو فلسفی معلوم ہوتے ہو، آپ نے تو مسئلہ منقح کر دیا، معلوم ہوا میں غلط فہمی میں مبتلا تھا، آپ نے مجھے روشنی دی، آپ کا بہت بہت شکریہ۔ السلام علیکم۔

سلیم: وعلیکم السلام۔

(۲۸) جشن ندوہ

جاوید: حفیظ صاحب! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔

حفیظ: وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔

جاوید: حفیظ صاحب! سنائیے، کیسا سفر رہا، آپ تو ندوہ کے جشن تعلیمی میں تشریف لے گئے تھے۔

حفیظ: جی ہاں! چند ہی دن ہوئے ہیں واپسی ہوئی، سفر میں چوں کہ بے تکلف دوست ساتھ تھے اس لیے کوئی دقت پیش نہیں آئی، پھر مجھے تو آپ جانتے ہیں، لکھنے پڑھنے والا آدمی ہوں، اگر کوئی بات کرنے والا نہ ہو تو سفر میں بھی لکھنا پڑھنا جاری رکھتا ہوں۔

جاوید: اچھا! آپ یہ تو بتائیے کانفرنس اور جشن کیسا رہا؟

حفیظ: بھائی! جشن کا کیا کہنا سچ تو یہ ہے کہ اگر شرکت نہ کرتا تو حسرت رہ جاتی، جشن میں عالمِ اسلام کا دماغ سمٹ آیا تھا، اہلِ علم اور دانشوروں کا ایک جگہ اتنی تعداد میں مجتمع ہونا اور اسلامی اور تعلیمی مسائل پر غور وخوض اور اپنے خیالات وافکار کا اظہار ایک نادر چیز تھی، پھر ہندوستان جیسے ملک میں تو اور بھی عجوبہ ہی معلوم ہوتا ہے۔

جاوید: اچھا! تو یہ بتائیے کہ جشن کے بارے میں آپ کے تأثرات کیا ہیں؟

حفیظ: جشن بیحد کامیاب رہا، بیرون ہند کے مہمانوں کو ہندوستان کے ان بڑے دینی، مذہبی، اسلامی اور ثقافتی ادارے دیکھ کر ہندی مسلمانوں کے حالات، ان کی تہذیب، ان کی اسلامی غیرت وحمیت، دین سے وابستگی اور اس کے لیے فکر کا صحیح اندازہ ہوا، وہ یہ کہنے پر مجبور ہوئے کہ اسلام کی تعلیم وترویج کے لیے باوجود غربت وافلاس نیز اقتدار سے محرومی کے، اس درجے پر اتنی تہذیب وتعلیم کے لیے بیداری قابلِ تعریف ہے، پھر یہ کہ دوسرے سے قریب ہو کر ایک دوسرے کے مسائل کو سمجھنے اور مشورہ کرنے کا موقع ملتا ہے۔

جاوید: اچھا حفیظ صاحب! یہ بتلائیے کہ آپ نے فرمایا ہر ایک کو اپنے افکار وخیالات کے

اظہار کا موقع ملتا ہے تو اس جشن میں ملک اور بیرونی ملک کے سیکڑوں دانشوروں اور اہلِ علم جمع تھے، انہوں نے دینی تعلیم اور مدارس کے موجودہ طرزِ تعلیم اور ضروریات کے سلسلہ میں کن خیالات کا اظہار کیا؟

حفیظ: مدارس دینیہ کی ضروریات کے سلسلہ میں زیادہ تر اسکالروں نے اس مشورے پر زور دیا کہ مدارس دینیہ اور جامعات میں صنعت وحرفت کی تعلیم ضرور ہونی چاہئے تا کہ یہاں سے نکلنے والے طلبہ معاشی مشکلات کا شکار نہ رہیں اور قوم کے لیے ان کا وجود ایک بوجھ نہ ثابت ہو، بعض اہل علم نے تو انتہائی گرے ہوئے لب ولہجے میں اس کو ادا کیا۔

جاوید: اچھا حفیظ بھائی! خود آپ کا خیال اس سلسلہ میں کیا ہے، کیا یہ مشورہ آج کے حالات میں مناسب نہیں ہے۔

حفیظ: جاوید صاحب! بظاہر تو یہ باتیں مفید اور اچھی معلوم ہوتی ہیں لیکن اگر گہری نظر ڈالی جائے تو جن اغراض ومقاصد کے لیے ان دینی درسگاہوں کو قائم کیا گیا ہے اور مسلمانوں کی مذہبی ضرورت کو پورا کرنے اور ان کی قیادت کے لیے جن افراد کو یہاں تیار کیا جاتا ہے تو ان مقاصد سے ان مشوروں کا تضاد پایا جاتا ہے۔

جاوید: وہ تضاد کیا ہے، کیا کسی عالم یا دینی رہنما کا صنعت وحرفت سے واقف ہونا ان مقاصد کے خلاف ہے۔

حفیظ: خلاف تو نہیں مگر تجربہ یہی ہے کہ پھر کام ہونا مشکل ہے، مثلاً میں آپ سے کہتا ہوں آپ خوب جانتے ہیں کہ خالص دینی تعلیم کے لیے مسلمانوں کی آبادی کے تناسب سے جو بچے آتے ہیں یا قوم ان کو اس کام کے لیے وقف کرتی ہے وہ ایک فیصد سے بھی کم ہیں، ہزاروں کی مسلم آبادی رکھنے والے شہروں کے ہزاروں ہی بچے صنعت وحرفت اور دنیاوی تعلیم میں مصروف ہیں، اب یہ تھوڑی سی تعداد جو صرف دینی تعلیم کے لیے وقف کی جاتی ہے، اگر اس کی توجہ ٹیکنیکل تعلیم میں لگا دی جائے تو اول تو دینی تعلیم میں اتنی مہارت ہی حاصل نہ کر سکیں گے جو تمام وقت لگا کر کی جا سکتی ہے، اور اگر کر بھی لی تو جب ان کو دوسرا فن آتا ہو گا تو وہ دینی کام کیوں انجام دینے لگے، جس میں بڑی دقتوں کا سامنا اور قوم کی سخت وسست باتوں کو سننا پڑتا ہے۔ حق تو یہ ہے کہ اس طبقہ کی یہی معذوری اس کو دین کا کام کرنے پر مجبور کرتی ہے اور پھر آہستہ آہستہ اس خدمت سے اخلاص ومحبت کی

لازوال دولت بھی نصیب ہو جاتی ہے، شاید یہی راز تھا جس کی وجہ سے اکابر نے طلبۂ دین کو علم دین کے علاوہ ہر ہنر سے کورا رکھنے کی کوشش کی اور مدارس دینیہ کو ہنر کی تعلیم سے بچایا۔ سچ پوچھو تو میں تو اس کا بھی مخالف ہوں کہ دینی تعلیم کے ساتھ دوسری زبانوں کی تعلیم اس نہج پر دی جائے جس کی بنیاد پر ہمارے یہاں کے طلبہ یہاں سے فراغت کے بعد اس سرٹیفکیٹ کی بنیاد پر یونیورسٹیوں میں داخلہ لے سکیں اور سرکاری نوکریاں تلاش کریں۔ انگریزی یا دوسری زبان تو صرف اس حد تک ہی سکھلانی چاہئے جس سے وہ اسلام کی خدمت اس زبان میں بھی کر سکیں۔ چناں چہ جن اداروں میں اس زبان کی تعلیم کا نظم ہے اور ہمارے طلبہ اسے وسیلہ بنا کر انگریزی امتحانات دے کر سرکاری عہدوں کے چکر میں رہتے ہیں، اکابر نے اس کو پسند نہیں کیا ہے۔ حضرت مولانا علی میاں مدظلہٗ العالی ندوہ کے طلبہ کو ہر سال اس بات پر تنبیہ فرماتے ہیں کہ مدرسوں کی تعلیم کو پُل مت بناؤ، دین کا کام ہی کرنے میں اپنی فلاح سمجھو، ورنہ اگر اچھے اور ذہین طلبہ جب اُدھر چلے جائیں گے تو دین کا کام کون کرے گا، شاید آپ بھی میری اس رائے سے اتفاق کریں گے۔

جاوید: مگر سوال یہ ہے کہ اس گروہ کی معاشی مشکلات کا کیا ہوگا۔

حفیظ: آخر کون سا مولوی بھوکوں مر رہا ہے، زیادہ سے زیادہ وہ عام دنیادار کے مقابلہ میں ذرا عسرت کی زندگی گذارتا ہے، تو اتنی قربانی اس کو اسلام کے خاطر دینی ہی چاہئے۔

جاوید: مگر یہ حوصلہ سب میں کہاں۔

حفیظ: مگر یہ حوصلہ پیدا کرنا چاہئے اور اکابر نے یہ حوصلہ پیدا کیا ہے جس کی سیکڑوں مثالیں ہیں۔

جاوید: آپ کی بات میں بڑی پختگی ہے۔ خدا کرے کہ لوگ اس نقطۂ نظر کو سمجھ سکیں۔ خدا حافظ۔ پھر ملاقات ہوگی۔ السلام علیکم۔

حفیظ: وعلیکم السلام۔

(۲۹) جشن صد سالہ دارالعلوم دیوبند

خالد: ماجد میاں! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔

ماجد: وعلیکم السلام، کہئے مزاج تو بخیر ہیں۔

خالد: بس آج ہی کچھ طبیعت سنبھلی ہے۔

ماجد: آپ تو بڑے نازک مزاج معلوم ہوتے ہو، آپ جیسے لوگ حج کیسے کریں گے۔ جبکہ وہاں اور بھیڑ بھاڑ اس سے کہیں زیادہ ہوگی ہم نے تو اپنے ساتھیوں سے سُنا کہ وہ کہہ رہے تھے کہ اچھا ہوا کہ یہ اجلاس ہوا اور اس کا ہجوم دیکھ لیا اس سے حج کے موقعہ کی ہلکی سی جھلک نظر آ گئی۔

شاکر: آپ یہ تو بتلائیے کہ اتنے ہجوم کے باوجود انتظامات کیسے تھے؟

خالد: انتظامات تو بہت اچھے اور معقول تھے لیکن بعض امور میں لوگوں کو تکلیف بھی اٹھانی پڑی، مثلاً رضا کاروں کی کارکردگی ناقص تھی جس کی وجہ سے آنے والے مہمانوں کی رہنمائی اور ان کو ٹھہرنے میں دشواری ہوئی۔

شاکر: اس مسئلہ میں یہ عرض ہے کہ کتنا ہی بہترین انتظام ہو بعض دفعہ لوگوں کی بدویت انہیں اس سے فائدہ اٹھانے سے روکتی ہے، بعض لوگ کسی نظام کے تحت سلیقہ اور سنجیدگی کے ساتھ وقت گذارنے کے عادی ہی نہیں ہوتے خصوصاً ہمارے دیہاتی بھائی ایسے موقع پر انتہائی عدم تعاون سے کام لیتے ہیں جس کی وجہ سے معقول نظم کے باوجود سب لوگ زحمت میں پڑ جاتے ہیں۔

ناصر: دوسری بنیادی بات یہ ہے کہ دیوبند ایک مذہبی اور ایک دینی ادارہ ہے، جس کے ساتھ ہر مسلمان کا روحانی رشتہ ہے، اس کے کسی دینی اجلاس میں کسی کا اس نیت سے شرکت کرنا کہ ہمارے گھر جیسی خاطر داری اور مریدین کے حلقے جیسی ناز برداری ہوگی ظاہر ہے کہ یہ کم سمجھی کی بات ہے ایسی جگہ تو ہم کو طالب بن کر جانا چاہئے اور خادم بن کر رہنا چاہئے اور اپنے آپ کو مہمان نہ سمجھنا چاہئے۔

وہاں کی تکلیف اور راستے کی صعوبتوں کو ثواب سمجھ کر انگیز کرنا چاہئے تھا، تب تو یہ سفر واقعتاً دینی نقطۂ نظر اور مادرِ علمی کی محبت کی خاطر سمجھا جاتا ہے، ورنہ صرف تنقیدی نظر سے تو ہر اچھی چیز میں نقص نکال سکتے ہیں۔

خالد: ہمارے بعض ساتھی کہہ رہے تھے کہ یہ اندرا گاندھی کو دعوت کیوں دی؟ علماء کی مجلس، دینی محفل، دستار بندی کی مقدس ساعت میں غیر مسلم اور وہ بھی عورت اور انتہائی کرّ وفر کے ساتھ ممتاز نشست پر، بس یہ قیامت کی نشانی ہے، یہ علماء کو کیا ہو گیا ہے، پھر ایک سیاسی لیڈر نہیں کئی کئی پدھارے ہوئے تھے۔

ماجد: ان سے کہئے کہ آپ کے طرزِ فکر سے اگر کام لے کر اس ملک میں رہا گیا ہوتا تو آج دار العلوم تو دار العلوم، ہمیں اپنا وجود بھی سلامت نہ ملتا، آپ کس ملک میں رہ رہے ہیں، آپ کے ہم وطن کون ہیں؟ آپ کے سیاسی حالات کیا ہیں؟ آپ کو کن کے درمیان رہ کر اپنے وجود اور اپنے دین کو باقی رکھنا ہے؟ وقت کا دھارا کیا ہے؟ معاند کافر اور غیر معاند میں کیا فرق ہے؟ حاکم وقت چاہے وہ عورت ہی کیوں نہ ہو، اگر وہ کسی ادارے کے اہم جشن میں شرکت کا اظہار کرے یا آجائے تو اسلامی رواداریاں کیا ہیں؟ پھر ہندوستان جیسے ملک میں اسلامی قوت اور مسلمانوں میں دینی شعور، مذہبی بیداری اور دینی ادارے کے ساتھ عالمی سطح پر مسلم برادری کے تعلق سے اتنے عظیم مظاہرے کے موقع پر سیاسی شخصیات کا اپنا ذاتی مشاہدہ اور تأثر ہمارے سیاسی وجود پر کیا اثرات مرتب کر سکتا ہے، اس کا اندازہ محدود زندگی رکھنے والے اور دنیا سے الگ تھلگ صرف ایک ہی دائرہ میں رہ کر سوچنے والوں کو لگانا مشکل ہے۔

خالد: بعض لوگوں کو یہ کہتے بھی سنا کہ اجلاس جن مقاصد کے لیے بلایا گیا تھا ان امور پر گفتگو کے لیے کوئی خصوصی میٹنگ نہیں رکھی گئی، اجلاس صرف عوامی حیثیت کا ایک جلسہ ہو کر رہ گیا، جب کہ اس میں امت مسلمہ کے بڑے بڑے مسائل حل ہونے تھے۔

ناصر: اس سلسلہ میں یہ عرض ہے کہ اجلاس میں اندازے اور توقع سے زیادہ لوگوں کی آمد نے کوئی ایسا موقع ہی نہیں دیا کہ کوئی مخصوص میٹنگ ہوتی، پھر بھی ایک علمی سیمینار کے دو خصوصی اجلاس ملک کی دو مشہور شخصیات کی صدارت میں ہوئے جس میں علمی و تحقیقی مقالے پڑھے گئے، انہیں کی روشنی میں بعد میں بعض اہم تجویز پاس کی گئیں، دوسری

بات یہ ہے کہ جن امور اور مقاصد کے لیے اجلاس بلایا گیا تھا، اجلاس سے اس کے لیے بڑی راہیں استوار ہو گئیں ہیں، ماہرین کی توجہ اسلامی تعلیم و دینی اداروں اور ان کی قوت نفوذ کی طرف ملتفت ہوئی ہے، اب رہا مستقبل کے لیے لائحۂ عمل اور دین کی اشاعت کے لیے جدوجہد نیز نصابی ترمیمات پر غور وخوض وغیرہ تو ایسے امور ہیں کہ ان پر کسی بڑے اجلاس کی ہماہمی کے موقع پر توجہ دینا دشوار ہے، اس کے لیے تو ایک مخصوص قسم کے اہلِ فکر اور اربابِ دانش کے اوقات درکار ہیں، جو طویل غور وخوض کے بعد کوئی فیصلہ فرمائیں، جس کے لیے الحمد للہ اجلاس ایک مہمیز ثابت ہو چکا ہے۔

اقبال: کچھ لوگ کہتے ہیں کہ اجلاس کا پروگرام طے شدہ نظام کے بالکل خلاف پیش کیا گیا۔

ماجد: اس کی بڑی وجہ عالمِ اسلام کے غیر معمولی اربابِ علم اور عالم عرب کی اہم ترین شخصیات کا بر وقت تشریف لاتا رہا، ظاہر ہے کہ دور دراز ملکوں سے ایسے اہم مہمانوں کی آمد جو دار العلوم سے ان کی محبت کی علامت تھی ایک نعمت غیر مترقبہ تھی، ان حضرات کو ایسے موقع پر کچھ کہنے سننے کا موقع نہ دینا اخلاق کے خلاف ہوتا، جب کہ وہ بڑی تمنا اور جذبہ کے ساتھ اپنا پیغام سنانے کے لیے بے چین تھے، اس لیے جلسہ کے اربابِ حل و عقد اپنے طے شدہ پروگرام کو روک کر ان کے جذبات کا خیال رکھنے پر مجبور تھے۔

اقبال: بعض لوگ کہہ رہے تھے کہ اجلاس پر بے پناہ خرچ کیا گیا، جب کہ دین کفایت شعاری اور سادگی کی دعوت دیتا ہے۔

شاکر: کوئی اسراف نہیں کیا گیا، کیا مہمانوں کی خاطر مدارت ان کی حیثیت اور مرتبہ کی مطابق کرنا اسرافِ ہے؟ کیا پانی، بجلی، رہائش، پنڈال اور کھانے، پینے پر خرچ غیر ضروری تھا؟ لاکھوں انسانوں کے سہ روزہ قیام اور ان کی ضروریات کے لیے یقیناً ایک طویل خرچ کی ضرورت تھی۔

اقبال: بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ اس موقع پر شاہی چندوں کو قبول کیا گیا جب کہ دار العلوم میں حکومت کی امداد لینے سے بانی دار العلوم نے منع کیا ہے۔

شاکر: حکومت کی مدد سے مراد حکومت ہند کی وہ امداد ہے جس کے قبول کر لینے سے ادارہ کے نظام میں مداخلت کا خطرہ پیدا ہوتا ہے، لیکن مسلم بادشاہوں کے شخصی عطیات یا

اسلامی اشاعتی فنڈ سے دی جانے والی ان کی وقتی امدادی رقوم قبول کرنے میں قطعاً دارالعلوم پر کوئی اثر نہیں پڑتا اور نہ یہ بانی کی ہدایت کے خلاف ہے۔

ماجد: آخر میں، میں یہ کہنا چاہتا ہوں گا کہ لوگ تنقید کی نظر سے تو بہت سی باتیں کہہ رہے ہیں مگر اس اجلاس سے دارالعلوم کے ساتھ عالمی سطح پر مسلم برادری کا جو تعلق دیکھنے کا موقع ملا، مسلمانوں کی اپنے ادارے کے ساتھ جو محبت دیکھنے میں آئی۔ دارالعلوم نے دنیا کو کتنے علماء، قراء، حفاظ، مفسر، محدث، مفتی، صحافی، مشائخ، ادباء، اور مجاہدین عطا کیے ان کو دیکھنے اور سننے کا موقع ملا، حضرت علی میاں دامت برکاتہم نے دارالعلوم اور دیوبند کا جو تعارف کرایا، اس کی شخصیات کے جو کارنامے بیان کیے، اس سے عرب علماء اپنے دل میں ہندی علماء اور ان کی شاندار خدمات سے متاثر ہو کر واپس ہوئے۔ اجلاس میں جو تجاویز پاس ہوئیں ہیں، انشاء اللہ دارالعلوم بہت جلد مرحلے وار ان کو بروئے کار لانے کی سعی کرے گا۔ جو امت مسلمہ کی بہت بڑی خدمت ہوگی، اجلاس کے موقع پر دیوبند کے لوگوں نے جس قربانی اور مہمان نوازی اور محبت کا مظاہرہ کیا وہ قابل ستائش تھا۔ مختلف تنظیموں نے اپنے اپنے طور پر مہمانوں کے لیے زیادہ سے زیادہ سہولت پہونچانے کی جو کوشش کی وہ بھی قابل تعریف تھی۔ نیز حکومت ہند اور حکومت یوپی نے جس دلچسپی اور تعلق کا مظاہرہ کیا وہ بھی قابل قدر ہے، ہندوستان جیسے ملک میں جس میں مسلمان اقلیت میں ہیں اور غربت وافلاس کا بھی شکار ہیں۔ دیوبند جیسے چھوٹے سے قصبے میں جہاں زندگی کی سہولیات نہ ہونے کے برابر ہیں، دنیا بھر کے لاکھوں انسانوں کو دعوت دے کر ایک کامیاب اجلاس منعقد کر لینا ایک تاریخی چیز تھی۔ اور مجھے کہنے دیجئے کہ اس میں سب سے بڑا دخل حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب کی مساعی جمیلہ اور توجہات کو تھا، مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ جب اجلاس کے ایام قریب آئے اور انتظامیہ کچھ پریشان ہوئی تو حضرت ہی کے چہرے کی ہمہ وقتی بشاشت ان کے لیے ہمت کا کام دیتی تھی کہ ہمارے حضرت بشاش ہیں انشاء اللہ اجلاس کامیاب ہوگا، خدا تعالیٰ موصوف کی ذات کو جو درحقیقت اس وقت امت مسلمہ کی مسلمہ امانت ہے تا دیر ہمارے سروں پر قائم رکھے۔ آمین!

خالد: ماجد صاحب! اگر آپ سے دارالعلوم یا ابناء قدیم کے لیے تجاویز پیش کرنے کو کہا

جائے تو آپ کیا تجویز رکھ سکتے۔

ماجد: میرے نزدیک بہت سی باتیں قابل غور ہیں۔ کاش کہ دارالعلوم اور مسلمانوں کے بڑے بڑے دینی ادارے ان پر توجہ دیں، تو امت کو بڑا فائدہ حاصل ہو؛ نیز علماء کو بھی کام کا میدان مل سکتا ہے۔

دارالعلوم اور دینی اداروں کے لیے چند تجاویز

(۱) دارالعلوم اپنے فضلاء کے قائم کردہ تمام مدارس، انجمن، دارالمطالعہ، سنستھاؤں سے رابطہ رکھے، ان کی تعداد معلوم کرے، ان کے کام کی نوعیت معلوم کرے، اور وقتاً فوقتاً ان سے خط وکتابت کے ذریعہ تبادلۂ خیالات کرتا رہے۔

(۲) نظام تعلیم پر غور کیا جائے تا کہ مکتب سے لے کر انتہائی تعلیم تک کو جدید تقاضوں اور آسان شکلوں میں ڈھالنے کی کوشش کی جائے۔

(۳) پورے ملک میں پھیلے ہوئے نظام مسجد اور مکاتب کے متولیان کی کانفرنس بلا کر صرف علماء کو ملازم رکھنے کی تنبیہ اور مشورہ نیز ان کی تنخواہوں کا معیار بلند کرنے کی ہدایات اور نظام مسجد کو بہتر بنانے پر غور کیا جائے۔

(۴) تمام عربی مدارس کے تعاون سے ایک ''عربی مدارس رسالہ'' کا اجراء ہو، جس کے ذریعہ مدارس کے حالات اور ان کی ترقی سے واقف ہو جائے۔

(۵) وقتاً فوقتاً تمام مدارس عربیہ ہندیہ کے طلباء کے آپس میں کسی ایک جگہ تحریری، تقریری، قرأت ومقالات کے مقابلے اور اس پر انعامات تقسیم کیے جائیں۔

(۶) فن قرأت خصوصاً سبع قرأت کا فن مردہ ہوتا جا رہا ہے، بڑے مدارس حفص کے ساتھ سبع پر توجہ فرمائیں، خصوصاً وہ قراء مشق کے ساتھ کتابیں بھی پڑھا سکیں ان کی قلت ہے۔

(۷) تبلیغ کے کام کے ساتھ خاطر خواہ تعاون نہیں ہوا ہے، طلبۂ مدارس دینیہ کو بطور کورس کے کچھ وقت اس کام سے تعلق اور عوام کے حالات جاننے اور ان کی اصلاح سے متعلق بیداری پیدا کرنے پر خرچ کرنا چاہیے۔

(۸) تحریری مشق کے لیے پختہ کار مصنف اور صحافی حضرات کی ایک جماعت بڑے ادارے سے ضابطے میں منسلک کی جائے تا کہ اس ذوق کے طلباء ان سے تحریری مشق اور مضامین

نویسی میں خاطر خواہ رہنمائی حاصل کرسکیں۔

(۹) جدید علم کلام جس کے ذریعہ موجودہ فرقے اور کمیونزم وشوسلزم اور کیپٹیل ازم وسائنسی اعتراضات کے جوابات ووجود باری وتوحید باری پر سائنس کی روشنی میں دلائل بطور متن پڑھانے کے لیے مرتب ہو۔

(۱۰) دوسرے ملکوں کے حالات کے تحت جدید مسائل اور عیسائیت کے خلاف اور ان کے اعتراضات کے جوابات بطور متن کے پڑھانے کے لیے کوئی رسالہ لکھا جائے۔

(۱۱) منتخبات کی تیاری کے لیے ایک بورڈ کی تشکیل کی جائے، نیز ٹریننگ کورس تیار کیا جائے۔

(۱۲) اخلاقیات پر منتخب ایسی کتابیں ہوں جو کورس میں داخل کی جائیں۔

(۱۳) ایسی کتابیں جن میں مشاجرات صحابہ وقرون اولی کے حالات کی مناسب توجیہات اور جوابات ہوں تیار کرائی جائیں۔

(۱۴) اصول معاشیات پر کچھ کتابیں منتخب ہوں جن کو مطالعہ کے لیے ضروری قرار دیا جائے۔ اور سالانہ امتحان کے ساتھ اس مضمون کا بھی ایک پرچہ ہو۔

(۱۵) سیاسیات پر معلوماتی کتابیں جن کے مطالعہ کی سفارش ہو اور سالانہ امتحان کے ساتھ اس مضمون کا بھی ایک پرچہ ہو۔

(۱۶) مبادیاتِ سائنس پر منتخب کتابیں جن کے مطالعہ کی سفارش ہو اور سالانہ امتحان کے ساتھ اس مضمون کا بھی ایک پرچہ ہوا کرے۔

(۱۷) سال کے مختلف اوقات میں مختلف مرکزی مقامات پر ایسے سیمینار ہوں جن میں کالج اور یونیورسٹی کے مسلم طلبہ کے کیمپ لگائے جائیں اور کئی نشستوں میں ملک کے مشہور علماء کو بلا کر ان حضرات کے شبہات اور اعتراضات کو پیش کرنے اور ان کے جوابات دیئے جانے کا نظم ہو اور اہل علم کے ساتھ وہ کچھ وقت بھی گذاریں۔

(۱۸) حج کی عبادت، مدارسِ دینیہ اپنے ادارے کے کسی میدان میں حج کئے ہوئے اساتذہ کے ذریعہ طلبہ کو احرام بندھوا کر عملی طور پر حج کرنے کی مشق کرائیں اور مقدس مقامات کے لکڑی کے ماڈل تیار کرا کر سمجھائیں تا کہ ایک عالم حج کے موقعہ پر عوام کو صحیح حج کرنا بتا سکے۔

(۱۹) محرم، ربیع الاول، شعبان ایسے مواقع پر علاقائی ادارے یا دارالعلوم اپنے فضلا کے

ذریعہ اہم اہم مقامات پر جلسے کر کے مستند علماء سے بیان دلانے کا نظم کرے اور عوام اس سلسلہ کے اخراجات میں تعاون کریں ورنہ عوام کے خود کے انتخابات سے غلط قسم کے واعظین لوگوں کو گمراہ کرتے رہیں گے۔

(۲۰) ریاض الصالحین کو نصاب میں داخل کر کے درجہ سوم اور دوم میں صرف ترجمہ اور ضروری تشریح کے ساتھ پڑھا جائے؛ نیز اخلاق اور عادات ومعاشرت پر کوئی رسالہ بھی پڑھایا جائے تا کہ درمیان سے تعلیم چھوڑ کر جانے والے طلبہ بھی علوم عالیہ سے قدرے واقفیت لے کر جائیں۔

(۲۱) اسلامی تاریخ میں کوئی بہتر کتاب یا اس کا کوئی بہترین انتخاب کر کے اس طرح لکھا جائے جس میں تاریخی واقعات اور قرونِ اولیٰ کے واقعات پر پڑنے والے اعتراضات کے تسلی بخش جوابات اور توجیہات ہوں ان کو بطور نصاب کے پڑھایا جائے۔

(۲۲) فقہی اختلافات اور ان کے دلائل اور ابحاث کو کم کر کے زیادہ تر سماجیات، اصول معاشیات اور تمدن وحضارت اور اخلاق ومعاشرت سے تعلق رکھنے والے حصے کو انتہائی شرح بسط کے ساتھ پڑھایا جائے بلکہ سال کے ابتدا میں یہ اسباق ہوں تا کہ ان پر خاطر خواہ توجہ ہو سکے۔

(۲۳) کمیونزم، شوسلزم، فاش ازم یا ملک کے طول وعرض میں پھیلے ہوئے فرقوں کے بارے میں ان کے بنیادی عقائد کیا ہیں؟ اور ان کے اصولی جوابات کیا ہیں؟ ایسی کوئی مختصر کتاب بطور نصاب پڑھائی جائے۔

(۲۴) دارالعلوم کے نصاب پر حاوی یا اس سے زیادہ مناسبت رکھنے والے ان مدارس کی سندوں کو جن پر دارالعلوم کو اعتماد ہو معتبر قرار دیا جائے۔ ان طلباء کو دارالعلوم میں داخلے کے لیے داخلہ امتحان سے مستثنیٰ رکھا جائے۔

(۲۵) جدید حالات اور ضروریات کو سامنے رکھ کر ایک کورس کے انتخاب کے لیے ملک کے ماہرینِ تعلیم علماء کا ایک بورڈ بنا دیا جائے جو کم از کم تین سال کی مدت میں ایک کورس مرتب کر کے پیش کرے، اس بورڈ کے ممبران کو اس عرصے کے لیے وظائف بھی دیئے جائیں تا کہ وہ کامل انہماک سے اس مدت میں کام کرسکیں۔

(۲۶) چھوٹے مکاتب جو دارالعلوم کے طرزِ فکر سے اتحاد رکھتے ہیں ان کے لیے دارالعلوم

ایک کورس مرتب کرکے اس کے پڑھانے کی سفارش کرے۔

(۲۷) دار العلوم یا اس کی سطح کے بڑے ادارے اپنے یہاں دو کورس جاری کریں: ایک کورس صرف ان طلبہ کو پڑھایا جائے جو پورے علوم اور مکمل تعلیم کے اہل ہوں۔

دوسرا مختصر کورس جوان طلباء کو پڑھایا جائے جو مکاتب کی تعلیم یا امامت کرانے یا کسی تنظیم وغیرہ کو چلانے کی صلاحیت رکھتے ہوں، ہر شخص کو مکمل عالم بنانے اور اس کو سند دینے کی ضرورت نہیں بلکہ ہر کورس کی سند الگ ہو۔

(۲۸) دار العلوم ایک مجلسِ نشر واشاعت قائم کرے جس کے ذریعہ ابناء کی اہم تصانیف شائع ہوسکیں، جن کو وہ اپنے طور پر شائع نہیں کر سکتے، نیز ادارہ خود بھی وقتاً فوقتاً وقت کی اہم ضروریات پر کتابیں شائع کرتا رہے۔

(۲۹) سب سے پہلے تعلیم ہی کے مسئلہ پر غور ہو کہ اب بھی ہندوستان کے طول وعرض میں لاکھوں کروڑوں کی ایسی آبادیاں ہیں جہاں دین کی ابتدائی اور بنیادی تعلیم کا ایسا معقول نظام نہیں ہے جس کے تحت قرآن مجید کو صحت کے ساتھ پڑھنے اور اسلام کے بنیادی عقائد اور مسائل کی تعلیم دی جاسکے۔ اس سلسلہ میں ایک ایسی منظم اور ہمہ گیر مہم چلانے کی ضرورت ہے جو دار العلوم ہی کی نگرانی اور اس کے پلیٹ فارم سے چلے، اس کے وزیٹر مقرر ہوں، وہی ہر جگہ اس نظم کی نگرانی کریں اور اس کی کوشش کریں کہ ایک جگہ بھی ایسی باقی نہ رہے جہاں اس تعلیم کا نظم نہ ہو، خواہ اس کو مرحلے وار پورا کرنا پڑے۔ جن علاقوں میں تعلیمی بورڈ یا کسی کمیٹی کے تحت یہ نظام چل رہا ہے، اس کی بھی پوری معلومات فراہم کی جائیں اور اعداد وشمار کے ذریعہ سالانہ رفتار بھی معلوم کرائی جاتی رہے کہ کتنے علاقے اس اسکیم سے سال بھر میں مستفید ہو رہے ہیں۔ اگرچہ بعض تنظیمیں ان امور کو علاقائی طور پر انجام دے رہی ہیں مگر مرکزی سطح پر بھی اس کام کی نگرانی ہو اور دار العلوم کو بحیثیت مرکز قانونی طور پر اس کا ذمہ دار قرار دیا جائے۔ اس سے ایک یہ بھی فائدہ ہوگا کہ دار العلوم اپنے فضلاء، حفاظ، قراء کو مناسب جگہ بھیج سکتا ہے اور ان کی وجہ سے لوگوں کو صحیح العقیدہ اساتذہ فراہم ہو سکتے ہیں؛ نیز اس کام کی جو مشکلات ہیں یا ہمہ گیری کی شکل میں جو خطرات ہیں ان پر غور کیا جا سکتا ہے۔

(۳۰) ایک بورڈ بنایا جائے جو صوبے وار تمام مساجد اور مدارس کا سروے کرے اور ذمہ دار

ومتولیان کو کسی ایک جگہ جمع کرکے اس پر آمادہ کرے کہ وہ اپنے مکاتب، مدارس ومساجد میں عالم یا کسی مستند ادارے کے مستفید قراء وحفاظ ہی کو اپنے یہاں ملازم رکھیں تاکہ غلط عقائد یا ناقص علم والوں سے جو مفاسد تعلیم میں پیدا ہو جاتے ہیں ان سے بچا جاسکے۔

نیز مساجد ومدارس کی آمدنی کے لحاظ سے متولیوں کو ہدایت کی جائے کہ تنخواہوں کا معیار مناسب قائم کریں تاکہ اہل علم پریشان حالی کا شکار نہ ہوں۔

(۳۱) دار العلوم اور اس کے مسلک سے تعلق رکھنے والے تمام ہی بڑے مدارس کا دار العلوم کے ساتھ رابطہ پر زور دیا جائے تاکہ ایک دوسرے کے مشوروں سے فائدہ اٹھایا جاسکے۔

(۳۲) علماء کو اس طرف توجہ دلائی جائے کہ ابھی بھی عوام کا اعتماد آپ کو انتہائی قوت کے ساتھ حاصل ہے۔ خدارا اس کی قدر کریں اور ایک دوسرے کے خلاف اس رویہ کو بند کردیں جو عوام سے اس طبقہ کے اثر کو ختم کرتا یا گروہی عصبیت کو جنم دیتا ہے، عوام کو اپنے سے جوڑنے، ان کی دینی ضروریات کو مقدور بھر پوری کرنے کی ہمیشہ کوشش کریں۔ عوام میں نفوذ اور ان سے ربط کی یہ قوت انشاءاللہ بڑے زبردست فیصلوں کا ذریعہ بن سکتی ہے۔

(۳۳) ابناءِ قدیم کے ساتھ ادارہ ایک رابطہ رکھے اور اس کے لیے کوئی تنظیم بنائے۔

(۳۴) نصاب تعلیم پر غور وخوض کیا جائے، موجودہ دور کی ضروریات کو سامنے رکھ کر نصاب میں ردّ وبدل کی کافی گنجائش ہے۔

(۳۵) عالم عرب اور اس کی مشہور درسگاہوں اور دینی وعلمی شخصیات کے ساتھ دار العلوم کے روابط کو اور قوی کیا جائے۔

(۳۶) اصلاحِ رسوم اور سماج سدھار کے لیے ایک ہمہ گیر جدوجہد کی جائے۔

خالد: جناب! مجھے آپ سے گفتگو کرکے بڑی مسرت ہوئی، انشاءاللہ پھر ملاقات ہوگی۔
السلام علیکم

ماجد: وعلیکم السلام۔

(۳۰) تقلیدِ شخصی

یونس: یوسف صاحب! السلام علیکم۔

یوسف: وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔

یونس: یوسف صاحب! آپ مسلکاً کون ہیں؟

یوسف: الحمدللہ! میں صحیح العقیدہ مسلمان ہوں۔

یونس: یہ ٹھیک ہے کہ آپ صحیح العقیدہ مسلمان ہیں مگر میں تو یہ دریافت کرر ہا ہوں کہ اسلامی قانون میں آپ کس کے مقلد ہیں۔

یوسف: میں محمد رسول اللہ صلی اللہ وعلیہ وسلم کا مقلد ہوں۔

یونس: محمد رسول اللہ صلی اللہ وسلم کے تو سبھی مقلد ہیں مگر میرا تو سوال یہ ہے کہ اسلامی قانون طہارت، قانون صلوۃ، قانون صوم، وغیرہ میں آپ کس امام کے مقلد ہیں؟

یوسف: یونس صاحب! معاف کیجئے میں کسی ایک امام کی تقلید نہیں کرتا۔

یونس: اس کا مطلب ہے کہ آپ خود امام ہیں۔

یوسف: جی نہیں! میں امام ہونے کا ہرگز دعوی نہیں کرتا۔

یونس: جب آپ امام اور مجتہد ہونے کا دعوی نہیں کرتے تب تو آپ کو تقلید کے بغیر کوئی چارہ کار ہی نہیں قرآن مجید میں ہے: "فَاسْئَلُوْا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ" یعنی جب آدمی خود مسئلہ نہ جانتا ہو یا دلائل شرعیہ سے استنباط کی صلاحیت نہ رکھتا ہو تو اس کو اہل استنباط کی تقلید کرنی چاہیے۔

یوسف: جناب! میں نفس تقلید کی انکار نہیں کرتا اس کے بغیر تو غیر مجتہد کو چارہ ہی نہیں مگر میں تو تقلید شخصی کا انکار کرتا ہوں جو قطعاً ضروری نہیں مسلمانوں کو اس کا پابند بنانا ان پر ظلم کرنا ہے۔

یونس: ایسا کیوں؟

یوسف: اس لیے کہ ادلہ اربعہ ہی تمام ائمہ کے مآخذ ہیں ہر ایک قول کے مذہب پر کوئی نہ

کوئی دلیل موجود ہے لہٰذا کسی بھی مجتہد کے قول پر عمل کرنا اسلام ہی پر عمل کرنا ہے۔

یونس: یوسف صاحب! آپ کی گفتگو سے پتہ چلا کہ آپ نفس تقلید کے قائل ہیں اور اس کی دو قسموں کو بھی مانتے ہیں کہ ایک ہے تقلید شخصی اور دوسری ہے تقلید غیر شخصی، البتہ آپ تقلید شخصی کو واجب نہیں مانتے صرف شخصی تقلید کے قائل ہیں اور اس کو ضروری سمجھتے ہیں تو سوال یہ کہ جب ایک نوع کی دو قسمیں ہوں اور ان میں سے ایک ضروری ہو سکتی ہے تو دوسری قسم ضروری کیوں نہیں ہو سکتی ہے؟ جن کے فیصلے سے آپ کے نزدیک غیر شخصی تقلید ضروری ہوئی تو کیا انہیں کے فیصلہ سے شخصی ضروری نہیں ہو سکتی؟ دیکھئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں قرآن مجید کو مختلف قبائل کی رعایت سے سات طرح سے لکھنے پڑھنے کی اجازت ملی ہوئی تھی لیکن دور عثمانیؓ میں صرف لغتِ قریش پر قرآن مجید لکھوایا گیا اور دوسرے قرآن جلوا دیے گئے اور کسی نے اس پر نکیر نہیں کی بلکہ حضرت عثمانؓ کو جامع القرآن کا لقب ملا، حقیقتاً یہ تقلید شخصی ہی تھی۔

یوسف: یونس صاحب! میں سمجھتا ہوں کہ اسلام کیوں کہ عالم گیر اور ابدی دین ہے، اس لیے قدرت نے اس کے شارع کی زبان سے ایسی باتیں ادا کرائی ہیں جو اپنے اندر ایسی وسعتیں رکھتیں ہیں کہ ہر مزاج اور ہر ملک اور ہر دور کے لوگوں کی طبائع وضروریات کے مطابق ان سے قانون بنائے جا سکتے ہیں، مجتہدین کی جو مختلف آراء ہیں وہ اشارات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی انہیں وسعتوں کی وجہ سے ہیں تا کہ کسی بھی ضرورت میں اسلام کے علاوہ کسی دوسرے مذہب کا دروازہ کھٹکھٹانا نہ پڑے، اس لیے اختلاف امت کو رحمت کہا گیا؛ زمانہ ماضی میں کیسی ہی غیر متمدن قوم اسلام لائی ہو یا آج کیسی ہی متمدن قوم اسلام لے آئے اسلام کے قانون میں ایسی رعایتیں موجود ہیں کہ کسی نہ کسی امام کے مسلک میں ان کی ضرورت پوری ہو سکتی ہے، اسلام سے باہر جانے کی ضرورت نہیں، مگر اللہ بچائے ان علماءِ امت سے کہ انہوں نے اسلام کو سمیٹ کر ایسا بسم اللہ کے گنبد میں بند کیا ہے کہ امت رعایتوں کے لیے تڑپ رہی ہے، مگر یہ بے رحم علماء یہی رٹ لگائے ہوئے ہیں کہ "تقلید شخصی" واجب ہے، جس امام کی بیڑی پیر میں پڑ چکی وہ قیامت تک نہیں کھل سکتی، ایک کی اتباع کرتے ہوئے کسی دوسرے امام کی بات پر عمل کرنا تلفیق ہے اور تلفیق ممنوع ہے، اس سے خواہشات پر چلنے کا دروازہ کھل جائے گا،

مگر دنیا کب تک اس تنگ نظری کو برداشت کرتی، اب لوگ ان کو چھوڑ کر ''اَلدِّیْنُ یُسْرٌ '' کے پیغام کی روشنی میں جس امام کے مسلک میں اپنے لیے آسانی محسوس کرتے ہیں اس پر عمل کرنے لگے ہیں، کسی ایک امام کے غلام بن کر نہیں رہتے، اور یہ ہونا بھی چاہیے، مثلاً شکر سے مختلف مٹھائیاں بنائی جاتی ہیں، لہٰذا مٹھائی کا شوقین اپنی خواہش کے مطابق کبھی جلیبی کھاتا ہے، کبھی لڈو، کبھی برفی، تو ہر شکل میں وہ مٹھائی کھانے والا سمجھا جائے گا، اس پر یہ پابندی لگانا کہ مٹھائی کھانا ہو تو صرف جلیبی ہی کھانا لڈو مت کھانا یہ زیادتی ہے، یہی حال اسلامی قانون کا ہے چاہے وہ قانون حنفی ہو یا حنبلی ہو یا شافعی جس قانون پر عمل کرنا چاہے کرلے، سہولت اسی میں ہے، ورنہ دقت پیدا ہو جائے گی، صحابہ کے زمانہ میں لوگ کسی بھی صحابی کے قول پر عمل کرلیا کرتے تھے اس زمانے میں تقلید شخصی قطعاً ضروری نہیں سمجھی جاتی تھی۔

یونس: یوسف صاحب! اصل میں تقلید کے دو فرد ہیں: تقلید شخصی اور غیر شخصی۔ جب ''ھَلْ یَسْتَوِی الَّذِیْنَ یَعْلَمُوْنَ وَ الَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ ''۔ اور ''فَاسْئَلُوْا اَھْلَ الذِّکْرِ اِنْ کُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ '' وغیرہ آیات سے مطلق تقلید غیر مجتہد کے لیے ضروری ہوئی تو مطلق کے کسی بھی فرد کی ادائیگی سے مطلق کی ادائیگی ہو جائے گی، البتہ اس کا اختیار رہتا ہے کہ اس کے افراد میں سے جس کسی کو بھی ادا کر دیا جائے ادا ہو جائے گا، جیسے کفارۂ قسم واجب ہے، مگر اس کے افراد کئی ہیں، غلام آزاد کرنا، کھانا کھلانا، روزے رکھنا، تو یہ واجب کسی بھی فرد کی ادائیگی سے ادا ہو جائے گا اور اس کا ادا کرنا واجب ہوگا۔ تیسری صدی کے شروع تک تقلید غیر شخصی اور شخصی دونوں جاری تھیں، مگر اس کے بعد جب غیر شخصی پر عمل اتباع نفس کا ذریعہ بنتا نظر آیا تو اس واجب کی ادائیگی کو شخصی میں منحصر کر دیا گیا اور اسی پر اجماع ہو گیا، اس اجماع کو شاہ ولی اللہؒ اور خود غیر مقلدین کے معتمد ابن تیمیہؒ نے بھی نقل کیا ہے۔ نیز اس دور تک ائمہ کے مذاہب مکمل طور پر مدوّن ہو چکے تھے، اور ہر ایک عمل کرنے والے کے لیے ایک ہی کے یہاں سارے مسائل کا جواب مہیا ہو چکا تھا، اس لیے مطلق تقلید کا وجوب شخصی میں محدود کر دیا گیا، تاکہ خواہشات کی اتباع کا دروازہ نہ کھلے۔

یوسف: مجھے علماء کی یہ منطق قطعاً سمجھ میں نہ آئی کہ ایک شخص کا کئی کئی ائمہ کی تقلید کرنا

خواہش نفس کی پیروی ہے، جب بات کسی امام فقہ کی کہی ہوئی ہے، جو مستنبط بالادلۂ شرعی ہے تو وہ نفس پرستی کیسے کہلائے گی؟ اگر سفر میں کوئی شخص جمع بین الصلوٰۃ کرلے اور جب گھر پر آرام سے ہو تو وقت پر نماز پڑھتا ہے، تو اس میں کونسی خرابی ہے، جب کہ یہ عمل بعض ائمہ کا اختیار کردہ بھی ہے۔ ''اَلدِّیْنُ یُسْرٌ '' کے یہی معنی ہیں کہ جو ضرورت درپیش ہے، اس کے لیے جو آسان شکل عمل کرنے کے لیے درکار ہو وہ کسی بھی امام کے یہاں مل جائے، اس پر عمل کرلو، وہ عمل اسلام ہی کے مطابق سمجھا جائے گا، اس لیے کہ سارے ائمہ حق پر ہیں، ان کی بات اسلام کی بات ہے۔

یونس: یوسف صاحب! آپ کی گفتگو سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ بات کو سمجھتے نہیں ہیں، آپ کی اتنی بات تو صحیح ہے کہ ہر امام ادلۂ شرعیہ ہی سے مسئلہ مستنبط کرتا ہے، اس لیے اس کا فیصلہ اسلام سے خارج کوئی فیصلہ نہیں، مگر چوں کہ ہر امام کے اصول استخراج الگ الگ ہیں اُن کے طریق استنباط کے اختلاف کی وجہ سے مسائل میں اختلاف پیدا ہو جاتا ہے، لہٰذا چند ائمہ کی تقلید کرنا درحقیقت مختلف اصولوں کو ٹکرادینا ہے، ہر امام ایک اصل اور ایک کلیہ کے تحت جزئیات مستنبط کرتا ہے، ایک امام کسی حکم کی علت ایک کو قرار دیتا ہے، تو دوسرا دوسری چیز کو علت مانتا ہے، جس کی وجہ سے ہر ایک کے یہاں الگ الگ حکم ہو جاتا ہے، لہٰذا جب ایک امام کو امام مان لیا گیا، اب جب تک سارے مسائل میں اسی کی بات نہیں مانی جائے گی تب تک روحانی صحت حاصل نہیں ہو سکتی، اس کی مثال ایسی سمجھیے جیسے ایک شخص کسی جسمانی مرض میں مبتلا ہو، اب اس کو اپنا علاج کرانا ہے اور علاج کے چار طریقے مشہور ہیں، ویدک، یونانی، ایلو پیتھک، ہومیو پیتھک۔ اب مریض کو اس کا اختیار ہے کہ ان میں جس طریق سے چاہے علاج کرائے، حکیم سے کرائے، وید سے کرائے یا ہومیو پیتھک والے سے کرائے۔

سب ہی طریق علاج مرض کو دور کرنے کے لیے ایجاد کئے گئے ہیں، سب ہی مریض کے خیر خواہ ہیں، مگر مریض کو اس کی قطعاً اجازت نہیں دی جائے گی کہ چاروں کی دوا ایک ساتھ استعمال کرے، مثلاً ڈاکٹر کی ٹیبلیٹ، حکیم کا معجون، وید کا سفوف، ہومیو پیتھک والے کی گولی؛ یہ سب ایک ساتھ ہتھیلی پر رکھ کر پھانک لے، یا صبح کسی کی اور دوپہر کسی کی اور شام کسی کی، تو ایسے مریض کا اللہ ہی حافظ ہے، اس کی صحت کے بگڑنے کے شدید

خطرات ہیں کیوں کہ کوئی مواد کو سکھا کر علاج کرتا ہے کوئی مواد کو پکانے کی دوا دیتا ہے، کوئی مرض کا سبب سردی کو سمجھا ہے، تو کوئی گرمی کو، کوئی پہلے تنقیہ کراتا ہے، تو کوئی قوت دافعہ کو بڑھانے کی دوا دیتا ہے، ظاہر ہے کہ یہ طریق علاج کا اختلاف، اس بات کا متقاضی ہے کہ مریض جب تک ان میں سے کسی ایک کا علاج کرا رہا ہو، اس وقت تک دوسرے کا علاج ہرگز شروع نہ کرے ورنہ نقصان ہوگا۔ بس یہی حال ان ائمہ فقہ کا سمجھ لیجئے کہ جسمانی اطباء کی طرح ان کے بھی چار اسکول مشہور ہیں: حنفی اسکول، شافعی اسکول، مالکی اسکول، حنبلی اسکول۔ یہ چاروں استنباط مسائل میں اپنے اپنے اصولوں پر کاربند ہیں، کوئی کسی وجہ کے تحت حکم لگا رہا ہے، کوئی کسی وجہ کے تحت؛ ایک کے یہاں آیت مطلق ہے، تو دوسرا مجمل مان رہا ہے، کسی کے یہاں ایک شئی میں علت حرمت کیلی اور مکیلی ہوتا ہے، تو دوسرے کے یہاں پائیداری اور ازوخار، کسی کے یہاں امام نماز میں واسطہ فی العروض ہے تو صرف امام کی قرأت کافی سمجھی جارہی ہے اور مقتدی کو قرأت سے روکا جارہا ہے، کسی کے یہاں واسطہ فی الثبوت ہے تو امام کی قرأت مقتدی کے لیے کافی نہیں مقتدی کو بھی قرأت کرنی پڑ رہی ہے، کوئی نماز کو حرکات اور افعال کا مجموعہ مان رہا ہے تو رفعِ یدین کرنے کو کہتا ہے، کوئی نماز کو سراپا سکون مان کر عدم رفع کا قائل ہے۔ بہر حال علل اور اصول میں اختلافات کی وجہ سے احکامات میں اختلافات نمایاں ہوتے ہیں۔ اب چند ائمہ کی تقلید کی اجازت دی گئی تو مسلمان کی روحانی صحت کے خراب ہونے کا شدید اندیشہ ہے، وہ آسانیوں کو ڈھونڈتا پھرے گا وہ نفس کا مقلد بن جائے گا، جب خون نکلے گا تو وہ شافعی بن جائے گا اور مس ذکر ہوگا، تو حنفی ہو جائے گا، یہ تلفیق ہے نفس کی اتباع ہے قانون سے بچنے کے لیے پناہ تلاش کرنے کی فکر ہے۔

یوسف: اگر اللہ تعالیٰ کو یہ منظور ہوتا کہ صرف ایک ہی امام کی بات پر عمل کیا جائے تو وہ اپنے قانون میں ایسی وسعتیں ہی نہ رکھتے جن سے مختلف ائمہ کو مختلف احکامات نکالنے کا موقع ملتا، ایسا لگتا ہے کہ یہ تنگ نظر علماء حنفی اور شافعی اور اسکولوں میں لوگوں کو محدود کر کے دنیا پر اسلام کے راستے بند کرنا چاہتے ہیں، اگر یہ بندشیں ختم کردی جائے تو شاید سارا عالم بہت جلد اسلام لے آئے۔

یونس: یوسف صاحب! ٹھیک ہے کہ سارا عالم اسلام لے آئے مگر ان کے اسلام کی شکل

ایسی ہوگی جیسے اگر چند آرٹسٹ انسان کی الگ الگ تصویر بنائیں، ظاہر ہے کہ جو شخص جتنی بڑی تصویر بنائے گا اسی کے مطابق اس میں کان ناک ہاتھ پیر بنائے گا، مثلاً ۶ رفٹ لمبی تصویر بنانے والا اس کے مناسب کان ناک لگائے گا اور ۵ رفٹ والا اس کے مناسب کان ناک بنائے گا، اب اگر کوئی شخص ایسی تصویر بنائے کہ تصویر تو ہو ۳ رفٹ کی مگر اس میں کان ۶ رفٹ والی تصویر کا، اور ناک ۵ رفٹ والی تصویر کی، تو اس کی تصویر انسان کا کارٹون بن جائے گی؛ ایسے ہی جب ایک شخص نماز کے قانون میں حنفی ہو اور زکوٰۃ کے قانون میں شافعی ہو اور طہارت کے قانون میں مالکی ہو، تو اس کا اسلام، اسلام کا کارٹون تو بنے گا کوئی خوبصورت اسلام نہیں بنے گا۔

یوسف: مگر اس اختلاف کی مثالیں تو موجود ہیں جس سے آپ بچنا چاہ رہے ہیں دیکھئے مطاف میں نماز چاروں سمتوں میں کھڑے ہوکر ادا ہو جاتی ہے اس لیے کہ ہر سمت والے کا رُخ بیت اللہ ہی کی طرف رہتا ہے، تو ایک شخص متعدد ائمہ کی تقلید کیوں نہیں کرسکتا، جب کہ ان سب کا رُخ نصوص شرعیہ ہی کی طرف ہے یا مثلاً اشتباہِ قبلے کے وقت، جہتِ تحرّی ہی قبلہ ہو جاتی ہے، اور دو رکعت ایک سمت تحرّی پر پڑھ کر اگر تحرّی بدل جائے تو سمت بدل لینے کی اجازت ہے، تو ایک مسئلہ میں کبھی ایک امام کی بات اور جب دل کا فیصلہ بدل جائے تو اسی مسئلہ میں دوسرے امام کی بات مان کر عمل کرنے میں کیا حرج ہے؟

یونس: یوسف صاحب! کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ تقلید شخصی چھوڑ کر ایسی آزادی اختیار کرلی جائے کہ ظہر ہاتھ چھوڑ کر اور عصر ہاتھ سینہ پر باندھ کر اور مغرب ناف کے نیچے ہاتھ باندھ کر پڑھی جائے تا کہ لوگ یہ دیکھیں کہ مسلمان کی عبادت گرگٹ کی طرح مختلف رنگ بدلتی ہے؛ آخر آپ دین کو کیوں تحریہ بنانا چاہتے ہیں، اللہ کے واسطے اس اجماعی مسئلہ کی اہمیت کو سمجھئے اور ایک خدا، ایک رسول، ایک قرآن کے ساتھ تقلید کے لیے بھی ایک امام کو منتخب کرلیجئے، ورنہ کچھ دن میں یہ مسئلہ بھی شیطان اٹھوائے گا کہ جب سارے انبیاء حق پر تھے اور ہم سب کو حق پر مانتے ہیں جیسا کہ عقیدہ ہے لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ تو کیوں نہ ہم ایک مسئلہ میں عیسوی شریعت پر عمل کر کے غسل جنابت نہ کریں، اور یعقوبی شریعت پر عمل کر کے جمع بین الاختین کرلیں، اور آدمؑ کی شریعت پر عمل

کر کے بہن اور بھائی کا نکاح اختلافِ بطن کے بعد کر دیا کریں، اور سلیمانی شریعت پر عمل کر کے چار سے زیادہ نکاح کرلیا کریں، اور موسوی شریعت پر عمل کر کے بدلہ لینے کو واجب سمجھیں۔ میرے بھائی! آپ اجماع کی حقیقت کو سمجھ کر اب ایسی باتیں نہ کریں بلکہ تقلید شخصی ہی پر کار بند رہیں۔

یوسف: یونس صاحب! آپ کی گفتگو میں بڑے غور سے سُن رہا تھا، واقعی آپ نے تقلید غیر شخصی کی جو مضرتیں بیان فرمائیں اور اس مسئلہ پر جو مبسوط کلام کیا اس نے مجھے اپنے خیالات پر نظر ثانی کرنے پر مجبور کر دیا ہے، اس لیے مجھے اب آپ کی بات سے اتفاق کرنے ہی پر دل آمادہ کر رہا ہے، لہٰذا میں بلا کسی قیل وقال کے آپ کی بات سے اتفاق کرتا ہوں اور اس ہدایت پر آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

یونس: یہ آپ کی ذرہ نوازی ہے۔ السلام علیکم۔

یوسف: وعلیکم السلام۔

(۳۱) شیعیت اور اسلام

جاوید: صدیقی صاحب! السلام علیکم۔

صدیقی: وعلیکم السلام جاوید بھائی۔

جاوید: کیا آپ اس سے خوش نہیں ہیں کہ ایران کی رضا شاہ پہلوی حکومت جو امریکہ کی برسہا برس سے پٹھو چلی آ رہی تھی اور جس کے اشارہ پر اسلام دشمن طاقتیں ایران پر اپنا اڈہ جمائے ہوئے تھیں، ایران کی معیشت تباہ ہو رہی تھی، دولت سمٹ کر امریکہ کے بینکوں میں پہنچ رہی تھی بڑے بڑے شاہی جشنوں میں قومی روپیہ پانی کی طرح بہایا جا رہا تھا، ان سب حالات پر اللہ کے کچھ نیک بندے برسوں سے کڑھ رہے تھے مگر اقتدار وقت نے ان کو دوسرے ملکوں میں جلاوطنی کی زندگی گزارنے پر مجبور کر دیا تھا، کسی کو ان کی تائید کی اجازت نہیں تھی، مگر قدرت کے یہاں دیر تو ہے اندھیر نہیں ہے، چناں چہ ایک وقت آیا کہ ایمان کو کفر پر فتح ہوئی اور آیت اللہ اور روح اللہ خمینی جیسی نیک ہستی اور دینی حمیت سے سرشار و ملک کے حقیقی بہی خواہ نے شاہی حکومت کے خلاف بیڑہ اٹھایا اور برسوں کی جدوجہد کے بعد اپنے ہم وطنوں کی نصرت سے برسوں کی جمی ہوئی مضبوط ترین شاہی حکومت کو اکھاڑ کر پھینک دیا، اور اس کے قوی ترین حلیف منہ دیکھتے رہ گئے، اور زمام اقتدار اپنے ہاتھ میں لے کر اصلاحات جاری کیں، اسلام کا بول بالا کیا، اس کو اسلامی جمہوریہ ایران کے نام سے موسوم کر کے اسلام دشمن طاقتوں کے گال پر ایسا طمانچہ رسید کیا جس کی سوزش وہ کبھی بھلا نہیں سکتے۔

صدیقی: جاوید بھائی! آپ نے جو تجزیہ کیا، شروع شروع میں، میں بھی ان کو خمینی صاحب کا بڑا ہی جرأتمندانہ قدم اور اللہ کی طرف سے ان کی غیبی تائید سمجھ رہا تھا۔ یقیناً شاہی حکومت بڑی طاقتوں کا کھلونا بن چکی تھی اور اسلام ایران میں انتہائی خطرے میں تھا، ملک کی معیشت تباہ تھی، شاہی خاندان شاہ خرچیوں میں مصروف تھا اور غریب عوام دم توڑ رہے تھے، اس انقلاب سے بڑی توقعات وابستہ تھیں، مگر افسوس! اس انقلاب کی

تہہ میں جو اسکیم پھیلی ہوئی تھی، اس کا فساد انقلاب کے فوراً بعد ظہور میں آ گیا۔ اس وقت
پتہ چلا کہ اس انقلاب کی بنیاد نیک نیتی پر مبنی نہیں تھی۔ اسلام کو دکھلاوے کے لیے
استعمال کیا جا رہا تھا اور کام وہ ہونے لگے جو اسلام اور اس کے قانون کو دنیا میں رسوا
کر رہے تھے۔ اصلاحات کے نام پر اپنے سیاسی حریفوں کو بلا قصور بلا مقدمہ چلائے
لاکھوں کی تعداد میں تہہ تیغ کر دیا گیا۔ ملک کے بڑے بڑے فنکار، ماہرین، شبہات پر
قتل کر دیئے گئے۔ اگر اس کے خلاف کوئی زبان ہلتی دیکھی تو فوراً اس کو بھی کاٹ دیا گیا۔
اگر کسی نے ہمہ گیر قتل وخون ریزی کا سبب پوچھا تو کہا گیا کہ یہ سب اسلام دشمن عناصر
تھے۔ ان کو صفحۂ ہستی سے مٹا دینا ہی بہتر ہے، پھر اس پر بس نہیں کیا گیا بلکہ جب
حکومت کو کچھ استحکام حاصل ہو گیا تو پھر ایک مخصوص ذہن کے تحت اثنا عشری مسلک اور
جعفری فقہ وعقائد کو ملک کا مذہب قرار دیا گیا اور اس فرقہ کے عقائد کی ترویج واشاعت
میں بے پناہ سرگرمی دکھلائی گئی اور سنی آبادی پر جو ملک میں اقلیت میں ہے مظالم کا سلسلہ
شروع کر دیا گیا اور مساجد ومدارس میں شیعہ اساتذہ اور ائمہ ہی مقرر کیے جانے لگے اسی
فرقے کی کتابیں شائع کرنے کا حق باقی رکھا گیا، سنی عقائد کا گلا گھونٹا جانے لگا۔ یہ
اندرونی طور پر ہو رہا تھا۔ مگر باہر یہ پروپیگنڈہ زوروں سے کیا جا رہا تھا کہ اسلام دیکھنا
ہے تو ایران آؤ، دعوت دے کر ٹکٹ بھیج کر، کرائے کے ٹٹو بلائے جاتے اور ان کو مساجد
ومقابر کی سیر کرا کے بازاروں میں برقعہ پوش عورتوں کو دکھا کر یہ تاثر دیا جاتا کہ ایران
ایک زبردست اسلامی ملک بن چکا ہے، جہاں ایک عورت بھی بے پردہ نہیں ہیں۔
جہاں سبھی سرکاری عہدوں پر جبہ ودستار اور ریش ورومال والے بیٹھ کر قرآن وحدیث
کے مطابق فیصلہ کر رہے ہیں۔

ابھی یہ ظلم وستم اور ہاتھی کے دانت دکھلانے کے اور کھانے اور، والا شور چل رہا تھا کہ ایک
زبردست جنگ عراق کے ساتھ چھیڑ دی گئی اور اس کو ایسا اسلامی جہاد قرار دیا گیا کہ گویا
اسلام اور کفر کی جنگ ہے، عراق کو طاغوت اکبر قرار دے کر وہ یلغار کی گئی کہ لاکھوں
نوجوانوں کے ساتھ ساتھ کم عمر ابتدائی کلاس کے بچوں کو بھی اس جنگ میں جھونک دیا
گیا۔ کروڑوں عربوں روپیہ کا ہتھیار خریدا گیا، پورے ملک کی دولت داؤ پر لگا دی گئی،
جنگ کو اتنا طول دیا گیا کہ آج آٹھ سال پورے ہونے جا رہے ہیں مگر جنگ ہے کہ

رُکنے کا نام ہی نہیں لیتی، پھر صرف اسی جنگ پر بس نہیں بلکہ ایران کی اس نام نہاد
جمہوریہ کے جو عزائم ان کے ذمہ داروں کی طرف سے ظاہر کیے جا رہے ہیں۔ ان سے تو
معلوم ہوتا ہے کہ ان کا مقصد صرف عراق کو ہی شکست دینا نہیں ہے بلکہ پوری عرب
ریاستوں کو زیر وزبر کرنا اور ان پر اپنا جھنڈا لہرانا ہے؛ نیز حرمین شریفین کے تقدس کو بھی
پامال کر کے ان مقامات پر بھی قبضہ کرنا ہے اور پھر اسی پر بس نہیں بلکہ وہاں پہنچ کر اپنے
مخصوص عقائد کے تحت وہاں کے مقدس مقامات اور مدفون مقدس شخصیات کی بے حرمتی
اور توہین کرنا ہے، اور اپنے مخصوص فرقے کی پورے عالم پر مذہبی بالا دستی اور حکومت
قائم کرنا ہے۔ اور سنی عقائد اور ان کے ماننے والوں کی بیخ کنی کرنا ہے، اس کے لیے
اندرونی طور پر اسکیمیں خاموش طریقے پر جاری ہیں اور رائے عامہ کو اپنا ہم نوا بنانے
کے ہتھکنڈے بھی چالو ہیں، بیچاری مخلص سعودی حکومت جو ان مقامات مقدسہ کی محافظ
اور خدمت گذار ہے۔ اس کے خلاف ملک ملک پھر کر غلط فہمیاں پھیلا کر اس کو ظالم قرار
دیا جا رہا ہے۔ حج کے مبارک موقع پر عین عبادت میں شور شرابا، مظاہرے اور قتال کے
ذریعہ حجاج میں خوف وہراس پیدا کیا جا رہا ہے، تاکہ لوگ حج میں آنا بند کر دیں اگر
سعودی فوج مداخلت کرتی ہے تو اس کو ظالم قرار دیا جاتا ہے اور دنیا میں پھر کر یہ مشورہ دیا
جا رہا ہے کہ مکہ مدینہ سعودیہ کے باپ کا نہیں پورے عالم کے مسلمانوں کا ہے۔ لہٰذا
ایک عالمی مسلم ٹرسٹ بنا کر ان دونوں شہروں کو اس کے نظم ونسق میں دے دینا چاہیے، یہ
ہیں وہ ایرانی انقلاب کے خدوخال۔ بھلا ان حالات سے کسی مسلمان کو خوشی ہو سکتی ہے؟

جاوید: صدیقی صاحب! آپ نے سچ فرمایا، یہ تو ساری اسکیمیں اسلام دشمن ہیں۔
ایران کی ان حرکات سے دنیا اسلام کے بارے میں کیا رائے قائم کرے گی۔ لوگ
کہیں گے کہ اسلام بڑا ظالم ہے۔ اس نے انسانی خون کو اتنا ارزاں کر دیا، کیا اس کی
تعلیمات یہی ہیں؟

پھر خمینی یا ایران کے ذمہ دار ایسا کیوں کر رہے ہیں؟ جبکہ دیکھنے میں وہ انتہائی معصوم اور
ولی صفت درویش نظر آتے ہیں، کیا ان کا ضمیر ان کو ان حرکات پر ملامت نہیں کرتا؟

صدیقی: جاوید بھائی! وہ یہ سب کام کو عین عبادت سمجھ کر کر رہے ہیں۔ وہ تو اس کو افضل
جہاد قرار دیتے ہیں۔ نجات کا ذریعہ اور اللہ کی خوشنودی کا وسیلہ یقین کر رہے ہیں۔

جاوید: یہ کیوں کر ہوسکتا ہے؟

صدیقی: اس کی اصل وجہ سمجھنے کے لیے آپ کو شیعیت کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔

جاوید: اچھا تو شیعیت کیا ہے؟ اور اس کے عقائد کیا ہیں؟

صدیقی: جاوید بھائی! شیعہ باطل فرقوں میں سب سے پہلا فرقہ ہے جو اسلام کے دور اول ہی میں پیدا ہو گیا تھا، اور جس نے خلافت کے مسئلہ کو لے کر امت میں افتراق پیدا کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ خلافت نبوت کی طرح منجانب اللہ ہے، خلیفہ کا مسئلہ انتخابی نہیں ہے، بلکہ نبی کی طرح منجانب اللہ تقرری کا مسئلہ ہے اور اس عہدہ پر حضرت علی کو فائز کیا جا چکا تھا، وہ ہی خلیفہ بلا فصل تھے۔ صدیق اکبرؓ کی خلافت غاصبانہ تھی، جن لوگوں نے صدیق اکبرؓ کے ہاتھ پر بیعت کی، وہ سب مرتد، کافر اور دنیا پرست تھے، منافقانہ طور پر اسلام سے جڑ گئے تھے، مقصد حکومت پر قبضہ کرنا تھا، سوائے چند صحابہؓ کے سب معاذ اللہ کافر تھے۔ انہوں نے تمام عمر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اذیت پہنچائی اور مرتے وقت بھی نبی کو کوئی وصیت نامہ نہیں لکھنے دیا، اس لیے کہ ان کو ڈر تھا کہ کہیں جس طرح انہوں نے زبانی طور پر علیؓ کو خلیفہ بنایا ہے، اسی کو کہیں لکھوا بھی نہ دیں، ورنہ پھر انکار کرنا دشوار ہو جائے گا۔ یہ فرقہ اپنے عقیدے میں نبوت کو ختم نہیں مانتا، نبوت خلافت کے ذریعہ جاری ہے، اس طرح کہ ہر خلیفہ امام ہے اور امام کو وہ سب اختیار حاصل ہیں جو نبی کو حاصل ہوتے ہیں۔ امام شریعت میں ترمیم و تنسیخ کرنے کا مجاز ہے، وہ واجب الطاعت ہے، وہ معصوم ہے، وہ اپنی موت وحیات کا مالک ہے، اور اس پر وحی آتی ہے، اللہ خود اس کا تقرر کرتا ہے، مسلم عوام کے انتخاب کی اس کو ضرورت نہیں؛ ظاہر ہے جس فرقہ کے یہ عقائد ہوں وہ سنی عقائد اور ان کے ماننے والوں کو کہاں برداشت کر سکتے ہیں۔ جن کے نزدیک صدیق اکبرؓ خلیفہ بلا فصل ہیں، مسلمانوں کے منتخب فرمودہ تھے۔ نبی کے بعد سب سے افضل تھے۔ امام کو نبوت جیسی شان اور معصومیت قطعاً حاصل نہیں۔ وہ سارے صحابہ کو مقدس اور نبی سے سچی محبت رکھنے والے اور اسلام کے شیدائی مانتے ہیں، عقیدے کے اسی ٹکراؤ نے شیعوں کو سنیوں کا دشمن روزِ اول ہی سے بنا رکھا ہے، چناں چہ جب جب بھی تاریخ میں ان کی کسی ملک پر حکومت قائم ہوئی ہے انہوں نے سنیوں سے دشمنی نکالی ہے، اور جہاں سنی آباد تھے، ان سے برسرِ پیکار رہے، حرم کی بے حرمتی کی، آج

جب کہ ایران میں ان کو قوت حاصل ہو گئی اور تیل کی دولت ان کے پاس ہے اور مذہبی ذہن رکھنے والے سنی دشمن عناصر ملک پر قبضہ کر چکے ہیں، اقتدار اور دولت ان کے ہاتھ آ گئی ہے تو وہ اب پوری قوت اس پر خرچ کرنا چاہتے ہیں کہ تمام اسلامی ملکوں پر بالا دستی حاصل کر لیں اور اپنے عقائد کو سب جگہ پھیلا کر ایک کونے سے دوسرے کونے تک شیعہ حکومت قائم کر دیں، اس کے لیے وہ حرمین شریفین کو اول نشانہ بنانا چاہتے ہیں جو مسلمانوں کی مقدس ترین جگہ ہے اور وہاں سنی حکمراں ہیں جو خادم حرمین شریفین ہیں۔

جاوید: صدیقی صاحب! سیاسی لوگوں کے بارے میں تو یہ سمجھا جاتا ہے کہ ان کا کوئی مذہب نہیں ہوتا، ان کا مقصد تو حکومت کرنا اور سب فرقوں کو ساتھ لے کر چلنا ہوتا ہے، ان کو اپنی حکومت اقتدار اور کرسی سے واسطہ ہوتا ہے، وہ مذہب کو لوگوں کا ذاتی معاملہ سمجھتے ہیں، حکومت تو سب کے ساتھ مساوی سلوک کرتی ہیں، اور ہر عقیدے والے کو اختیار دیتی ہے کہ وہ اپنے مسلک پر اس طرح عمل کرے کہ دوسرے مسلک والوں کا احترام باقی رہے۔

صدیقی: جاوید بھائی! خمینی صاحب سے یہی توقع تھی کہ اب جبکہ ان کو ایران میں اقتدار ملا ہے تو وہ ایک سیکولر ذہن اپنائیں گے اور ایک کامیاب سیاست داں کی حیثیت سے مذہبی اور فرقہ وارانہ ذہنیت کو چھوڑ کر حکومت کے نظام کو ایسا بنائیں گے کہ شیعہ سُنی پرانے اختلافات سے کوئی بحث ہی نہیں ہوگی بلکہ سیاسی لوگوں کی طرح ہر فرقہ کی مقدس شخصیات کا احترام ملحوظ رکھیں گے، مگر افسوس! انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ بلکہ اپنی ذہنیت ہی کو اجاگر کر کے حکومت کا رخ ادھر موڑ دیا۔ وہاں عملاً بس ایک ہی فرقہ کی عملداری ہے بلکہ اب بھی وہ اپنی ایسی کتابیں شائع کرنے سے دریغ نہیں کر رہے ہیں جن میں وہ ہی شیعی عقائد کی بھرمار، شیخین کی تحقیر وتکفیر، صحابہ پر سب وشتم اور ان کا دنیا پرست ومنافق ہونا دکھلایا جا رہا ہے، جس سے کروڑوں سینوں کی دل آزاری ہو رہی ہے، اور افسوس تو یہ ہے کہ پھر ان سب باتوں کو وہ عین اسلام کہہ کر لوگوں کو ایران میں اسلام دیکھنے کی دعوت دے رہے ہیں۔ نہ معلوم اسلام کی ایسی تصویر کشی کر کے وہ اسلام کو دنیا میں کیسے پسندیدہ کہلوا سکتے ہیں۔ جس کے دور اول کے لوگ ہی ان کی نظر میں قابل اعتبار نہیں۔

جاوید: تو دنیائے اسلام اس پر خمینی صاحب کو کچھ کہہ نہیں رہی ہے، کوئی احتجاج کیوں نہیں

کرتا؟ ان کو یہ کیوں نہیں کہا جاتا کہ تم کو یہی روش اختیار کرنا ہے تو اس کو کم از کم اسلامی انقلاب تو نہ کہو۔ اسلام یہ نہیں ہے۔ اس سے اسلام بدنام ہوگا۔

صدیقی: پوری دنیا چلا رہی کہ یہ اسلام نہیں ہے، اس کو اسلامی انقلاب نہ کہو۔ یہ خمینی انقلاب ہے، مگر ایرانی حکومت ایسی بے حس ہوگئی ہے کہ سارا عالم اسلام ایک طرف اور ایران ایک طرف۔ دنیا ملامت کر رہی ہے۔ نفرت کر رہی ہے مگر ان کو کوئی حس ہی نہیں۔

جاوید: پھر آخر وہ دنیا کو کس طرح باور کرا رہے ہیں کہ وہ اسلام کے اور مسلمانوں کے بہی خواہ ہیں۔؟

صدیقی: اس کی یہ شکل اختیار کر رکھی ہے کہ وہ دنیا سے کہتے ہیں کہ امریکہ دیکھو اسلام کا دشمن ہے، ہم اس کے دشمن ہیں ہم نے اس کو ذلیل کر دیا۔ اسرائیل جو عربوں کا اور مسلمانوں کا دشمن اول ہے۔ ہم اس کے دشمن ہیں۔ اس کو ہم ہی شکست دے سکتے ہیں، عربوں کا حال یہ ہے کہ جب ہم امریکہ اور اسرائیل کے خلاف نعرہ لگاتے ہیں اور حج میں جہاں سارے عالم کے مسلمان جمع ہوتے ہیں ان دونوں کے خلاف نعرہ لگا کر مسلمان کے دشمن اول کی اور اس کے حلیفوں کی نشاندہی کرنا چاہتے ہیں تو سعودیہ ہماری مخالفت کرتا ہے، ہمارے نوجوانوں کے مظاہرے بند کراتا ہے۔ ان کو قتل کراتا ہے، یا تو سعودی ڈرپوک ہے، یا پھر مسلمانوں کے دشمن کا ساز باز ہے۔

جاوید: مگر اس کی وجہ سے حج جیسی مقدس عبادت انتشار کا شکار ہوتی ہے، لوگوں کی توجہ اَللّٰھُمَّ لَبَّیْک سے ہٹ کر، سیاسی نعروں اور شخصیات کی طرف چلی جاتی ہے۔ حج کے موقع پر جہاں کفار جمع ہو کر اپنے باپ دادا کے مناقب ذکر کرتے تھے، اس کو پسند نہیں کیا گیا، صرف اللہ کا ذکر کرنے کو کہا گیا۔ وہاں سیاسی شخصیات کا تذکرہ اور ان کی تعریف سعودیہ کیسے برداشت کرے گا، یہ حج کی روح کے منافی ہے، پھر ان مظاہروں کے موقع پر انتظام میں دشواری کھڑی ہو جاتی ہے۔ کبھی کبھی لوگ بھگدڑ کا شکار ہو کر کچل جاتے ہیں۔

صدیقی: ایران تو ان کاموں کو حج سے افضل بتلا رہا ہے بلکہ اس کا کہنا ہے کہ حج ہوتا ہی اس لیے ہے کہ مسلمان اپنے سیاسی مسائل وہاں حل کریں، وہ خمینی وغیرہ کو صرف سیاسی شخصیات کہاں مان رہا ہے۔ وہ تو ان کو نبی مان رہا ہے۔ وہ حج میں نعرہ لگاتے ہیں۔ ”اللہ

واحد خمینی قائد“ اس کام کے لیے حج کے مجمع سے بہتر جگہ اس کے لیے کوئی نہیں ہے، بلکہ منع کرنے والی حکومت کو وہ اسلام دشمن، کافر، وہابی اور امریکہ نواز قرار دے دیتا ہے، تاکہ سارے عالم کا مسلمان سعودی حکمرانوں سے بدظن ہو جائے اور ایران کو اسلام اور مسلمانوں کا بہی خواہ سمجھنے لگے، اس کی کوشش ہے کہ سعودی عوام بھی اپنے یہاں ایران کی طرح انقلاب لا کر ان شاہوں کو نکال باہر کریں اور ملک کو ان بادشاہوں کی فضول خرچیوں سے بچائیں جو عوام کا گلا گھونٹ رہے ہیں، اور اس سلسلہ میں ایران کو اپنا قائد بنالیں

جاوید: مگر ایران خود چپکے چپکے جو اسرائیل سے اور امریکہ سے ساز باز کئے ہوئے ہے، اور انہی سے خود واسطے اور بلا واسطے کروڑوں ڈالر کے ہتھیار خرید کر ایرانی دولت ان کو دے رہا ہے، کیا یہ ہاتھی کے دانت دکھلانے کے اور کھانے کے اور والی بات نہیں ہے، اب لوگوں کے سامنے دورخی پالیسی آچکی ہے۔

صدیقی: جاوید بھائی! یہ بھانڈا وقتۃً پھوٹ چکا ہے، مگر بے شرم لوگوں کی آنکھ کا پانی ڈھل چکا ہے، ان کو کوئی شرم نہیں آتی، ایران پھر بھی عالم اسلام کے مسلمانوں کو گمراہ کر رہا ہے، ان کی آنکھوں میں دھول جھونک رہا ہے۔ ساری دنیا میں ہزاروں رسالوں، اخبارات، کتابوں اور وفود کے ذریعہ رات دن اس کا یہ پروپیگنڈہ جاری ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کا حقیقی بہی خواہ ایران ہے، اسلام حقیقی روپ میں ایران میں نافذ ہے، حرمین کی حفاظت کے حقیقی حقدار ایرانی ہیں امریکہ جیسے دولت مند اور ترقی یافتہ ملک کو ایران نے ناک چنے چبوا دیئے، یہ بلا خدائی نصرت کے نہیں ہوسکتا، عراق کی حکومت کافر اور کمیونسٹ ہے، اس کو ختم کرنا ہر مسلمان کا فریضہ ہے، وغیرہ وغیرہ۔

جاوید: آخر دنیا کب تک فریب میں آتی رہے گی۔ کب تب دنیا کو گمراہ کیا جاتا رہے گا؟ ایک نہ ایک دن تو ظلم کا خاتمہ ہوگا۔ کاغذ کی ناؤ زیادہ دن نہیں چلتی۔

صدیقی: یہ صحیح ہے، اب دنیائے اسلام پوری طرح باخبر ہو رہی ہے، اور وہ دن دور نہیں کہ ظالم اپنے ظلم کی سزا پائے گا۔ اچھا! آپ کا شکریہ۔ السلام علیکم

جاوید: وعلیکم السلام۔

(۳۲) ختم نبوت ورد قادیانیت

حکیم: السلام علیکم ڈاکٹر صاحب!

ڈاکٹر: وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ۔

حکیم: ڈاکٹر صاحب! آپ کہاں تشریف لے گئے تھے۔

ڈاکٹر: جناب! میں قادیان ضلع گرداس پور پنجاب گیا تھا۔

حکیم: وہاں کس سلسلہ میں جانا ہوا؟

ڈاکٹر: وہاں مرزا غلام احمد صاحب کی سیرت طیبہ پر ایک سیمینار تھا، اس میں شرکت کرنی تھی۔

حکیم: اچھا آپ قادیانی مذہب کے لوگوں سے ربط رکھتے ہیں، یہ تو ہمیں آج معلوم ہوا۔

ڈاکٹر: اس میں تعجب کی کیا بات ہے، کیا وہ لوگ مسلمان نہیں ہیں؟

حکیم: ہرگز نہیں۔

ڈاکٹر: کیوں؟

حکیم: اس لیے کہ وہ ختم نبوت کے منکر ہیں جو اسلام کا مسلمہ عقیدہ ہے۔

ڈاکٹر: وہ کہتے ہیں، ختم نبوت اسلام کا عقیدہ نہیں ہے، بھلا نبوت جیسے مبارک سلسلہ کو کیسے ختم کیا جا سکتا ہے؟ نبوت جو خدا تعالیٰ کا عظیم فیضان ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے خاتم کیوں کر ہوں گے، کسی چیز کے سلسلہ کو ختم کر دینا تو عیب کی بات ہے۔

حکیم: ڈاکٹر صاحب! میں آپ کی توجہ چاہوں گا، آپ تو ماشاء اللہ ڈاکٹر ہیں، بات کی معقولیت کو آپ نہیں سمجھیں گے تو اور کون سمجھے گا، دیکھئے ختم نبوت کے معنی قطع نبوت کے نہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سارے انبیاء کے بعد مبعوث فرما کر نبوت کی تکمیل کر دی گئی ہے، گویا نبوت اگر کوئی قصر ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کی تعمیر کی آخری اینٹ ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء کے اسٹیج کے صدر اجلاس ہیں، جس کا انتخاب تو سب سے پہلے ہوتا ہے، مگر اس کا خطاب سب سے آخر میں اور اس کے خطاب کے بعد اجلاس ختم ہو جاتا ہے؛ پھر کوئی مقرر تقریر نہیں کرتا ہے، وہ خطبے میں سابقہ تمام خطیبوں کے پیغامات کا خلاصہ بیان کر دیتا ہے۔ وہ سب کے خطابات کو سراہتا ہے

اور آخر میں جامع اور مکمل دستور حیات پیش کر دیتا ہے۔ جو اس کو اللہ تعالیٰ نے سنانے کو دیا ہوتا ہے۔ چنانچہ آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے خطبے کے آخر میں فرمایا: ''اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَ رَضِیْتُ لَکُمُ الإِسْلَامَ دِیْنًا''۔

ڈاکٹر: آپ نے سچ فرمایا اچھی بات کہی، لیکن سوال یہ ہے کہ انبیاء کی بعثت کا مقصد عالم انسانیت کی اصلاح ہے، اور ظاہر ہے کہ سابقہ ادوار میں جتنا بگاڑ تھا آج کے اس نئے دور میں اس سے ایک ہزار گنا زیادہ ہے، تو جب اس دور میں بار بار اور مسلسل نبی آتے رہے بلکہ ایک وقت میں کئی کئی انبیاء ایک ساتھ مبعوث ہوتے تھے، تو اب اس مبارک سلسلہ کو ختم کر دینے کے کیا معنی؟ جب کہ اب پہلے سے زیادہ ضرورت ہے۔

حکیم: ڈاکٹر صاحب! آپ بڑے ذہین اور گہری فکر کے مالک ہیں؛ کتنا وقیع اور دقیق سوال آپ نے فرمایا، صحیح ہے، پڑھے لکھے لوگ غور وفکر کے مالک ہوتے ہیں۔ ان میں سب سے بڑی خوبی تو یہ ہوتی ہے کہ وہ تعصب، تحزب، بلاک بندی اور آبائی عقیدوں کی حد بندیوں میں نہیں رہتے، جب معقول بات مدلل لگتی ہے اور ٹھوس ہو تو ایسے لوگ اس کو فوراً قبول کر لیتے ہیں۔ دنیا کا کوئی لالچ کوئی دباؤ ان کو صحیح بات کے قبول کرنے سے نہیں روک سکتا۔ ہاں! تو اس سوال کا جواب تو خود آں جناب کے دل میں ہے، میں اس کی وضاحت کئے دیتا ہوں، ورنہ وہ بات تو آپ جیسے ذکی لوگوں کے ذہن میں پہلے سے ہوگی، اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری نبی کی تعلیمات کو ''اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَ اِنَّا لَہٗ لَحَافِظُوْنَ'' کے ذریعہ ایسا تحفظ بخش دیا ہے جو کبھی ختم نہیں ہو سکتا۔ پھر علماءِ امت کو ''امر بالمعروف'' اور ''نہی عن المنکر'' کی ذمہ داری سونپ دی گئی ہے۔ جو نبوت کے اس کام کو قیامت تک جاری رکھیں گے، پھر ایک صدی یا ہزار سال پر کام میں کچھ ضعف ہونے لگتا ہے، تو اللہ تعالیٰ مجددین پیدا فرماتے رہتے ہیں جو کام میں پھر نئی روح پھونک دیتے ہیں۔

نیز قیامت کے قریب جب حالات بہت ابتر ہونے لگیں گے تو اللہ تعالیٰ امام مہدی کو پیدا کریں گے اور جب دجالی فتنہ پیدا ہوگا، تو حضرت عیسیٰ اس کی سرکوبی کے لیے آسمان سے نازل کئے جائیں گے، تو گویا ہر فساد اور ہر بگاڑ کا انتظام اللہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ کر دیا ہے۔ فرمایا کہ یہ امت ساری کی ساری کبھی گمراہی پر جمع نہ ہوگی۔ کوئی نہ کوئی جماعت حقہ ہمیشہ اس امت میں باقی رہے گی۔ بہر حال آپ صلی اللہ علیہ

وسلم کے بعد کسی نئے نبی کی بعثت کی ضرورت نہیں رہی۔ وہ اکیلے ہی لاکھوں نبیوں کا کام انجام دے گئے ہیں، اب ساری دنیا عجم وعرب قیامت تک ان کی تعلیمات سے فیض حاصل کر کے سارے فتنوں کو کچل سکتی ہے، ان کی تعلیمات ہر دور کے نئے سے نئے فتنہ کے چیلنج کا جواب دینے کے لیے کافی ہیں، اسی لیے آپ سے پہلے سارے اہل کتاب آخری نبی ہی کا انتظار کر رہے تھے۔ جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شکل میں آگیا اور اس میں وہ سب علامتیں انہوں نے کھلی آنکھوں دیکھ لیں جو ان کی کتابوں میں مذکور تھیں۔

ڈاکٹر: حکیم صاحب! میں آپ کے اس جواب سے کافی تسکین پاتا ہوں۔ مگر سوال یہ رہ جاتا ہے کہ ان نصوص کا کیا ہوگا جن میں نبوت کے سلسلہ کے جاری رہنے کی صراحت ہے؟ مثلاً قرآن مجید میں ہے: "یَا بَنِیْ اٰدَمَ اِمَّا یَاْتِیَنَّکُمْ رُسُلٌ مِّنْکُمْ یَقُصُّوْنَ عَلَیْکُمْ اٰیَاتِیْ فَمَنِ اتَّقٰی وَ اَصْلَحَ فَلَاخَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَاھُمْ یَحْزَنُوْنَ"۔ یعنی اے اولاد آدم! میری طرف سے تم میں رسول آتے رہیں گے، جس جس نے اپنے آپ کو ان کے انکار سے بچایا اور اپنی اصلاح کر لی ان کو نہ خوف ہے نہ ملال، اس سے معلوم ہوا کہ انبیاء کے آنے کا سلسلہ ہر دور میں جاری رہے گا۔

حکیم: آپ نے بڑی ہی معنی خیز آیت تلاوت فرمائی ہے، اس آیت شریفہ کا تعلق حضرت آدمؑ سے لے کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت تک ہے، اس مدت میں جو وقتاً فوقتاً انبیاء ورسل آئے وہ اس کا مصداق ہیں، اگر آپ کے بعد بھی انبیاء کی آمد لازم ہوتی تو عربی قواعد کے رو سے آیت میں "اِمَّا" کی جگہ "اِذَا" ہوتا۔ یہ تو ایک باریک بات ہے، آپ جیسا گرامر کی نزاکتوں کو سمجھنے والا شخص ہی اس استدلال کو سمجھ سکتا ہے۔

ڈاکٹر: حکیم صاحب! بات تو آپ نے واقعتہً بڑی علمی کہی۔ الحمدللہ میں اس کو سمجھ گیا، مگر ہاں! اس روایت کا کیا جواب ہوگا، جس میں حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم آخری نبی تو ہیں۔ مگر یہ مت کہو کہ ان کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔

حکیم: ڈاکٹر صاحب! یہ روایت پہلے تو اس درجہ کی نہیں ہے جس کو ان تمام صریح روایات کے مقابلہ میں لایا جائے، جن میں "لَانَبِیَ بَعْدِیْ" مذکور ہے۔ اور اگر مان لیا جائے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ حضرت عائشہؓ کو یہ خطرہ تھا کہ کہیں لوگ نزولِ عیسیٰؑ کا انکار نہ کر دیں، اس لیے فرمایا کہ "نبی نہیں آئے گا" یہ مت کہو۔ مطلب یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نبی ہیں، وہ آپ کے بعد نازل ہوں گے، مگر مبعوث ہو کر نہیں آئیں گے۔ جیسے ایک بادشاہ کسی ملک میں جائے تو وہ بادشاہ ہی ہے، مگر دوسرے ملک میں بادشاہت مقامی

بادشاہ ہی کی چلے گی۔

ڈاکٹر: آپ نے صحیح فرمایا مگر مرزا غلام احمد کا نام بھی قرآن میں مذکور ہے اور ان کے مبعوث ہونے کی خبر دی گئی ہے، کہا گیا ہے: "یأتي من بعدی إسمه أحمد"۔

حکیم: صحیح ہے، احمد کے آنے کی خبر مذکور ہے، مگر اس سے مراد خود محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، انہیں کا نام احمد ہے، ان سے پہلے کسی کا نام یہ نہیں تھا، اور پیشین گوئی قرآن میں حضرت عیسیٰؑ کی ذکر کی گئی ہے کہ وہ اپنے بعد حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کی آمد کی اطلاع دے گئے ہیں؛ اور ظاہر ہے کہ عیسیٰؑ کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی آئے ہیں نہ کہ مرزا صاحب۔

ڈاکٹر: ختم نبوت پر قرآن میں کون سی آیت ہے؟

حکیم: قرآن مجید نے صاف اعلان کیا: "مَاکَانَ مُحَمَّدٌ اَبَا اَحَدٍ مِنْ رِجَالِکُمْ وَ لٰکِنْ رَّسُوْلَ اللّٰہِ وَ خَاتَمَ النَّبِیّٖنَ"۔

ڈاکٹر: کیا ضروری ہے کہ خاتم النبیین کے معنی آخری نبی ہی کے لیے جائیں۔ خاتم، افضل کے معنی میں بھی آتا ہے، عرب جاہلیت کے بہت سے اشعار اس پر دال ہیں۔

حکیم: ڈاکٹر! قرآن صرف اشعار اور لغت کی مدد سے نہیں سمجھا جا سکتا۔ اس کا اصل شارح خود نبی ہوتا ہے۔ جب آپ نے قرآن میں مذکور خاتم کے معنی نبیوں کے خاتم اور آخری نبی کے بتلائے ہیں اور "لَا نَبِیَ بَعْدِیْ" فرمایا ہے، تو خود صاحبِ قرآن کی صریح وضاحت کو چھوڑ کر دوسرے معنی لینے کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

ڈاکٹر: حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے "لَانَبِیَ بَعْدِیْ" فرمایا ہے، تو اس کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں: "لا" اس جملہ میں مبتدا ہو اور "نَبِیَ" خبر ہو، جس کے معنی یہ ہو سکتے ہیں، میرے بعد "لا" نام کا نبی ہوگا۔

حکیم: ڈاکٹر صاحب! یہ لوگوں کی سخن سازیاں ہیں اگر یہ ہی معنی ہوتے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس جملہ کے بعد "وَ أنَا خَاتَمُ النَّبِیِّین" نہ فرماتے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: میرے بعد تیس نبوت کے جھوٹے مدعی نکلیں گے، ان میں ہر ایک نبوت کا دعویٰ کرے گا حالانکہ میں آخری نبی ہوں، میرے بعد کوئی نبی نہیں۔ اسی لیے جب بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی نے نبوت کا دعویٰ کیا، امت نے اس کو رد کر دیا۔ ختم نبوت امت کا اجماعی عقیدہ ہے، قرآن مجید نے آپ کی بعثت إلیٰ کَافَۃِ النَّاسِ قرار دی ہے۔ جو قیامت تک کے انسانوں کے لیے ہے، اس لیے کہ "کافہ" عامہ کے

معنی میں آتا ہے۔

ڈاکٹر: مگر "کافہ" روکنے کے معنی میں بھی آتا ہے، یعنی یہ معنی کیوں نہیں ہوسکتے کہ میں لوگوں کو برائیوں سے روکنے آیا ہوں۔

حکیم: مگر 'کافہ' قرآن میں ہر جگہ 'عامہ' کے معنی میں ہے، کسی جگہ اس معنی میں نہیں ہے۔

ڈاکٹر: مرزا غلام احمد پر وحی آتی تھی، انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کو بھی تسلیم کیا ہے، بلکہ اپنے کو ان کا ظلی اور بروزی نبی کہا ہے، ان کی بڑی بڑی تصنیفات ہیں، ان کے ماننے والے زیادہ تر تعلیم یافتہ افراد ہیں، یہ خود ان کی نبوت کا زندہ ثبوت ہے۔

حکیم: مرزا پر کئی دور گذرے ہیں، جن میں انہوں نے مختلف دعوے کئے ہیں، پہلے وہ بیشک حضور کو آخری نبی کہتے تھے، مگر انگریز نے ایک سازش کے تحت ان کو ایسا مسخر کرلیا اور ان کو اس پر آمادہ کیا کہ وہ مسلمانوں میں ایک مذہبی مقدس شخصیت بن کر ابھریں، تاکہ ان کے ذریعہ انگریز مسلمانوں کو اپنی مخالفت اور جہاد سے باز رکھے، چناں چہ مرزا نے اس مقصد کے لیے پہلے اپنے کو مجدد کہنا شروع کیا اور جہاد کی حرمت کا فتوی دیا، پھر مہدی ہونے کا دعویٰ کیا، اس کے بعد مسیح موعود بنے اور آہستہ آہستہ جرأت اتنی بڑھ گئی کہ نبوت کا دعویٰ کردیا اور آخر میں جاکر تو وہ اپنے آپ کو حضور صلی اللہ علیہ سلم سے بھی افضل کہنے لگے (العیاذ باللہ)۔ ان کی ذاتی زندگی انتہائی گندی اور غیر مہذب، جس کی بنیاد پر وہ ایک شریف آدمی بھی نہیں کہلائے جاسکتے، چہ جائیکہ نبی، وہ نبوت کی صفات سے قطعاً کورے تھے، ان کی ایک بھی پیشین گوئی صحیح نہ نکلی، جبکہ نبی کی پیشین گوئی حرف بہ حرف صحیح ہوتی ہے، ایک نبی کبھی دوسرے نبی کی مذمت نہیں کرتا ہے، انہوں نے حضرت عیسیٰؑ کی برائی کیں، وہ دماغی اور جسمانی بیماریوں کا مجموعہ تھے، اس وجہ سے ان کی باتیں مالیخولیا کے مریض کی طرح ہوتی تھیں۔

ڈاکٹر: اگر وہ اتنے برے کردار کے آدمی تھے تو پھر اتنے لوگوں نے اُن کی نبوت کو کیوں تسلیم کرلیا جن میں پڑھا لکھا طبقہ بھی ہے؟

حکیم: دیکھئے ڈاکٹر صاحب! یہ دنیا ایسی ہے کہ یہاں مٹی بھی بکتی ہے، اس دنیا کا حال تو یہ ہے کہ کوئی بھی آدمی تحریک چلائے، کوئی نئی آواز لگائے، کوئی بھی دعویٰ کردے، کچھ نہ کچھ لوگ اس کے ساتھ ضرور ہوجاتے ہیں، اور اگر اس کے ماننے پر ملازمتیں، سرکاری مناصب کا لالچ بھی ساتھ ہو تو پھر پوچھنا ہی کیا۔ نیز جب چند خاندان ایک عقیدہ قائم کر لیتے ہیں تو پھر ان کی نسلیں آنکھ بند کرکے اسی عقیدہ پر چلتی رہتی ہیں، سماج کا خوف، اپنے

مذہب کے لوگوں کے فتوے کا ڈر، ان کو ادنی غور وفکر کا موقع نہیں دیتا، وہ تحزب اور گروہی عصبیت میں مبتلا کردیئے جاتے ہیں، ان کو اپنے عقیدہ کی تحفظ اور اپنے گروہ کی حفاظت اور ان کی تعداد بڑھانے کے مشورے دیئے جاتے ہیں، اور پھر مسئلہ وقارِ قومی کا ہوجاتا ہے، اس کی تائید میں لٹریچر شائع کیا جاتا ہے، اس کو قومی بنانے کے لیے استعدادیں خرچ ہوتی ہیں، پیسہ بہایا جاتا ہے اور معاملہ وہاں پہنچ جاتا ہے جہاں سے معقول سے معقول اور مستند سے مستند دلیل بھی ان کو واپس نہیں لاسکتی، البتہ آپ جیسے جری اور معقول اور انصاف پسند اور نیوچرل (Natural) مطالعہ کے عادی افراد ضرور ایسے ہوتے ہیں جن کا کوئی راستہ نہیں روک سکتا۔

ڈاکٹر: حکیم صاحب! آپ نے جو باتیں کہیں وہ میرے دل کو چھوگئیں۔ میں پہلے سے بھی اس جماعت اور عقیدہ سے زیادہ منشرح نہیں تھا، مگر آپ نے تو میرے دل کے دریچے کھول دیئے ہیں، آج سے میں اس عقیدہ سے توبہ کرتا ہوں، آپ نے مجھے ایک سچا اور سیدھا راستہ دکھلایا ہے، میں آپ کا ممنون ہوں، میں آپ کے ہاتھ پر آج کی اسی مجلس میں تائب ہوتا ہوں، آپ دعا فرمائیں اللہ میری اب تک کی بھولوں اور گستاخیوں کو معاف فرمائے اور استقامت عطا فرمائے۔

حکیم: اللہ حق کے متلاشی کو کبھی محروم نہیں رکھتے، اللہ نے آپ کو جنت ہی کے لیے پیدا فرمایا تھا، لہٰذا اسی راستہ کی توفیق مرنے سے پہلے عطا فرمادی، اللہ کا شکر ادا کرنا چاہئے، میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ آپ کو اور مجھے بھی مرتے دم تک صحیح عقیدے پر برقرار رکھے۔

آمین! السلام علیکم

ڈاکٹر: وعلیکم السلام۔

(۳۴۳) مطلقہ کے نادان دوست

شہاب: السلام علیکم، جناب فاروق صاحب!

فاروق: وعلیکم السلام، کہیے مزاج تو بخیر ہیں؟

شہاب: اجی! مزاج تو آپ اپنے بتلائیے کیسے ہیں؟ آج کل مسلم پریس آپ کا مزاج خوب پوچھ رہا ہے۔

فاروق: بس جانے دیجیے ان مولوی ملّوں کو، یہ تو رائی کا پربت بنا ڈالتے ہیں، ذرا سی بات تھی مگر ان لوگوں نے آسمان سر پر اٹھا لیا، میں نے جو کچھ کہا تھا وہ قرآن کی رو سے کہا تھا، لوگ سمجھنے کی کوشش تو کرتے نہیں، کتنی ہی مدلل اور معقول بات کہو، الٹا ہی اثر مرتب ہوتا ہے۔

شہاب: وہ کیا بات تھی جو باوجود مدلل کے نہیں سمجھی گئی؟

فاروق: عورت کے ساتھ قرآن کی ہمدردی کی بات تھی، مطلقہ عورت کو عدت کے بعد بھی شوہر کو نفقہ دیتے رہنا ضروری ہے، یہ ہی قرآن سے ثابت کیا تھا، بھلا قرآن جو خدا کا قانون ہے اس میں بے سہارا عورت کے لیے شوہر پر کوئی ذمہ داری نہیں ڈالی جاتی یہ کیسے ہوسکتا تھا۔

شہاب: جناب قرآن مجید کی وہ کونسی آیت ہے جس میں یہ حکم مذکور ہے اور چودہ سو سال سے کسی مجتہد، کسی مفتی اور کسی عالم کی اس پر نظر ہی نہیں پڑی، نہ کسی وکیل نے آج تک کسی اسلامی عدالت سے مطلقہ کو یہ حق دلوایا، یہ تو آپ نے کمال کر دیا کہ ایسا قانون جو عورت کے لیے ایک زبردست سہارا ہے اس کو آپ نے قیاس سے نہیں، اجماع سے نہیں، قرآنِ مجید سے ثابت کر دیا، اس پر تو آپ کو تمام علماء کی طرف سے مفسرِ قرآن کی ڈگری ملنا چاہیے، بڑے بڑے علماء اپنی ساری زندگی کھپا کر بھی ایک آیت میں موجود، ایک بالکل واضح قانون کو بھی نہ سمجھ سکے، اچھا تو جلد بتلائیے کہ وہ آیت شریفہ کونسی ہے؟

فاروق: سورۂ بقرہ کی آیت ۲۴۲ جو دوسرے پارے میں ہے: "وَ لِلْمُطَلَّقَاتِ مَتَاعٌ بِالْمَعْرُوْفِ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ" یعنی مطلقات کے لیے نفقہ ہے، نکاح ثانی تک

زمانہ کے دستور کے مطابق اور یہ اللہ سے ڈرنے والے مؤمنین پر واجب ہے اس دعوے کے لیے اس سے زیادہ واضح دلیل اور کیا ہوسکتی ہے۔

شہاب: اچھا آیت "وَ لِلْمُطَلَّقَاتِ مَتَاعٌ بِالْمَعْرُوْفِ" کا مطلب آپ یہ سمجھتے ہیں، افسوس صد افسوس! میں تو سمجھتا تھا کہ آپ کوئی دور کی کوڑی لائے ہوں گے

بڑا شور سنتے تھے پہلو میں دل کا
جو چیرا تو اک قطرۂ خون نہ نکلا

اجی میاں! عقل کے ناخن لیجیے، یہ آپ نے کہاں سے اپنے آپ کو مجتہد سمجھ لیا، آپ تو قرآن فہمی کی ابجد سے بھی کورے معلوم ہوتے ہیں، قرآن کا کوئی انگریزی ترجمہ دیکھ لیا ہو گا۔ چوہے کو ہلدی کی گرہ مل گئی۔ وہ سمجھا کہ میں پنساری ہوگیا۔ خدارا اپنے آپ کو آفس تک محدود رکھیے۔ مفتی اور مجتہد بننے کا دعویٰ نہ کیجیے۔ یہ لوہے کے چنے ہیں۔ بڑی دیر میں چبتے ہیں، اگر آپ جیسے دو چار مفسر پیدا ہوگئے تو قرآن کا اللہ ہی مالک ہے۔

فاروق: اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن و حدیث ایسی چیستان ہے کہ اس کو کوئی سمجھ ہی نہیں سکتا۔ آخر دنیا کب تک مولویوں کی غلام بنی رہے گی۔ کیا قرآن کو ان کے علاوہ کوئی سمجھ ہی نہیں سکتا؟ ان کو نہ کسی کی مصیبت کی پرواہ، نہ ضرورت کا احساس۔ ان کو ناجائز کے علاوہ کچھ لکھنا ہی نہیں آتا۔ آخر "متاع بالمعروف" کے یہ معنی لینے میں کیا حرج ہے، جب کہ اس سے عورت کی اتنی بڑی مصیبت کا حل نکل آتا ہے، میں سمجھتا ہوں کہ آیت کے یہ معنی لینے سے تو اسلامی قانون کی برتری ظاہر ہوتی ہے کہ عورت کو اسلام نے کسی موڑ پر بے سہارا نہیں چھوڑا۔

شہاب: اب بھی آپ اپنی ضد پر قائم ہیں اپنی اس تفسیر بالرائے سے توبہ نہیں کر رہے ہیں اور آیت کے وہ معنی لینے پر تلے ہوئے ہیں جو آج تک کسی مفسر اور مجتہد نے نہیں لیے؛ حالاں کہ اس سے اسلام کے اور دوسرے کئی احکامات متاثر ہوتے ہیں، کئی آیات منسوخ قرار پاتی ہیں، مسلم پرسنل لا بدنام ہوتا ہے۔

فاروق: میں سمجھتا ہوں کہ آیت کے یہ معنی لینے سے تو اسلامی قانون کی برتری ظاہر ہوتی ہے کہ عورت کو اسلام نے کسی موڑ پر بھی بے سہارا نہیں چھوڑا، میرا بیان تو مسلم پرسنل لاء کی خوبی بیان کرنے کے لیے تھا، نہ کہ نقصان پہنچانے کے لیے۔

شہاب: فاروق صاحب! آپ نے ضابطۂ فوجداری کی دفعہ ۱۲۵ر کے خلاف پیش کیے

جانے والے ترمیمی بل کی مخالفت کر کے ایک زبردست غلطی کی ہے، آپ نے سپریم
کورٹ کے شاہ بانو کیس میں فیصلہ کی تائید کر دی ہے، جو مسلم پرسنل لاء میں مداخلت کا
راستہ صاف کرنے کی کوشش ہے، ایک ایسے وقت میں جب کہ لوگ مسلم پرسنل لاء کے
پیچھے ستو باندھ کر پڑے ہوئے ہیں، آپ نے مسلمان ہوتے ہوئے قرآن کی آیات
کے مفہوم میں تحریف کر کے دشمن کے ہاتھ مضبوط کئے ہیں، اسلامی تاریخ کا یہ
ایسا بھیانک جرم ہے، جس کو کبھی معاف نہیں کیا جا سکتا۔

فاروق: اچھا بتلایئے! اس قانون پر عمل کرنے میں کیا خرابی ہے، میرے نزدیک تو اس کا
سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ آج کل لوگوں نے طلاق کو ایک کھیل بنا لیا ہے، اس کی
جرأت ختم ہو جائے گی اور عورت ورگ کا مستقبل بے خطر ہو جائے گا۔

شہاب: آپ پوچھ رہے ہیں کہ اس میں کیا خرابی ہے؟ سنئے! اس میں کیا خرابی ہے،
ضابطہ فوجداری کی دفعہ ۱۲۵ر کے تحت بیوی کی تعریف میں اس عورت کو بھی شمار کیا گیا ہے
جس کو طلاق دی گئی ہو، یا اس نے خود طلاق لے لی ہو اور اس کی عدت گذر چکی ہو؛ مگر
اس نے ابھی دوسرا نکاح نہ کیا ہو، جب کہ اسلامی قانون کی رو سے وہ شوہر کے لیے
اجنبیہ ہو چکی ہے، جس کے نفقہ کا بوجھ اس پر قطعاً نہیں ڈالا جا سکتا، اگر دفعہ ۱۲۵ر کو
نافذ العمل رکھا جائے تو مندرجہ ذیل خرابیاں لازم آئیں گی اور کئی اسلامی قانون منسوخ
نظر آئیں گے، مثلاً:

(۱) اس سے طلاق کی نفی لازم آتی ہے کیوں کہ جب طلاق کے بعد اور عدت کے بعد بھی بیوی
رہتی ہے، جب کہ طلاق اسلام میں بندوق کی گولی کا کام کرتی ہے۔

(۲) جب طلاق کا اثر ختم ہو گیا تو عدت کا بھی سوال ختم ہو جاتا ہے، اس سے عدت سے متعلق
آیات منسوخ قرار پاتی ہیں۔

(۳) اس قانون کی رو سے، عورت جب دوسرا نکاح کرے گی تب ہی پہلے شوہر کے نکاح
سے نکلے گی؛ معلوم ہوا کہ پہلے شوہر کو چھوڑنا اب عورت کے اختیار میں ہے تو طلاق اب
شوہر نہیں دے سکتا، ہاں! بیوی دے سکتی ہے۔ جبکہ طلاق کا حق قرآن نے شوہر کو دیا تھا۔

(۴) اس سے لازم آتا ہے کہ عورت پہلے شوہر کی بیوی رہتے ہوئے دوسرے شخص سے نکاح
کا معاملہ طے کر سکتی ہے، اس سے بیک وقت دو شوہر کا تصور قائم ہوتا ہے۔

(۵) جب کہ قانون مطلقہ کو عدت کے بعد بھی نفقہ دلا کر بیوی ہی بتا تا رہے گا تو بہت سے

ناواقف شوہر اس سے جنسی تعلق بھی قائم رکھیں گے، اس سے ایک حرام کے حلال سمجھنے کی
راہ پیدا ہوگی اور طلاق ایک بے معنی چیز ہو کر رہ جائے گی۔

(۶) اس قانون سے فائدہ اٹھا کر عورتیں نکاح ثانی کا خیال ہی چھوڑ دیں گی، اس لیے کہ
جب پہلا شوہر باوجود طلاق کے کفالت کر رہا ہے تو پھر بلا وجہ دوسرا نکاح کر کے دوسرے
شوہر کی غلامی اور خدمت کا پھندہ گلے میں کیوں ڈالیں، غالباً دشمن کا مقصد بھی یہ ہی ہے
کہ مسلمانوں میں جو تھوڑا بہت نکاح ثانی کا دستور عورتوں میں موجود ہے اس کو ختم
کرانے کی سبیل نکال دی جائے تا کہ اکثریت کے مذہبی عائلی قانون کو مسلمانوں میں
بھی رائج کیا جا سکے، نیز اس قانون سے مردوں میں بلا شادی کئے کسی کے ساتھ زندگی
گذارنے کی وبا پھیلنے کا اندیشہ ہے جیسا کہ یورپ میں ہوتا ہے، وجہ یہی ہے کہ نکاح
کے بعد قانوناً علیحدگی دشوار بنا دی گئی ہے، طلاق کے بعد بھی نفقہ دلایا جاتا ہے، وراثت
میں بھی یورپ میں اولاد سے زیادہ بیوی کا حق تسلیم کیا جاتا ہے، اس لیے اب لوگ بلا
شادی کے ہی کسی عورت کو زندگی گزارنے اور بچہ پیدا کرنے کے لیے رکھ لیتے ہیں یا پھر
کئی بچے پیدا ہو جانے کے بعد استخارہ کر کے نکاح کر لیتے ہیں۔

(۷) اس قانون کے ڈر سے شوہر باوجود عدم موافقت کے طلاق نہیں دے گا اور حقوق
زوجیت بھی ادا نہیں کرے گا۔ ہمیشہ معلق رکھ کر ستائے گا، جیسا کہ ہو بھی رہا ہے، یہ شکل
عورت ورگ کے لیے اور بھیانک ہے۔

فاروق: اس کا مطلب تو یہ ہے کہ قرآن کی یہ آیت "متاع بالمعروف" پر عمل نہ کیا جائے۔

شہاب: پہلے تو اس آیت کے یہ معنی ہی نہیں، سارے مجتہدین، مفتیانِ کرام، مفسرین اس
پر متفق ہیں کہ اس سے مہر اور مدت عدت کا نفقہ یا اخلاقی طور پر کچھ دینا ہے نہ کہ عدت
کے بعد نکاح ثانی تک کا نفقہ۔ بھلا چودہ سو سال سے ماہرین قانون کے ذریعہ سمجھے
جانے والے مفہوم کو کیسے بدلا جا سکتا ہے؛ نیز جب یہ معنی لینے سے بہت سی آیات میں
مذکورہ احکام عدت، طلاق وغیرہ کا نسخ لازم آتا ہے، تو اس مفہوم کو کیسے بدلا جا سکتا ہے،
اگر ان آیات کا اس مفہوم کے ساتھ ماننا ضروری ہے تو عدت، طلاق نکاح وغیرہ پر مشتمل
دوسری آیات کا ماننا کیوں ضروری نہیں جو اس کے ماننے سے کالعدم ہو رہی ہیں۔

فاروق: آخر شوہر کو طلاق دینے کی یہ سزا دینے میں کیا حرج ہے کہ نکاح ثانی تک نفقہ دلایا
جائے۔

شہاب: کسی معقول وجہ سے طلاق دینا جرم نہیں۔ بلکہ شریعت نے شوہر کو بہت سے مصالح کے پیش نظر یہ حق دینا ضروری سمجھا ہے۔ جس کو آج وہ بھی تسلیم کر رہے ہیں، جن کے یہاں یہ حق نہیں تھا اور انہوں نے بالآخر عورت سے چھٹکارا حاصل کرنے کی یہ شکل اختیار کر رکھی تھی کہ اتنا ستاؤ کہ خودکشی کر لے یا خود ہی زہر دے دیتے تھے تا کہ دوسری شادی کی جا سکے۔ بہر حال جب طلاق دینا جرم نہیں تو پھر سزا کیسی؟

فاروق: اس کا مطلب تو یہ ہے کہ شوہر سے عدت کے بعد مطلقہ کو نفقہ دلایا ہی نہیں جا سکتا۔

شہاب: جی ہاں! اس لیے کہ کسی پر کسی کا نفقہ صرف تین وجہ سے واجب ہوتا ہے۔

(۱) بحق زوجیت؛ کہ زوجہ کا نفقہ شوہر پر واجب ہوتا ہے، چاہے زوجہ کتنی ہی مال دار کیوں نہ ہو۔

(۲) بحق قرابت؛ اگر اولاد یا والدین یا کوئی قریبی رشتہ دار اتنا غریب ہو کہ وہ اپنا خرچ کھانے پینے کا بھی برداشت نہیں کر سکتا، تو ان کا نفقہ ان کے مالدار قرابت داروں پر واجب ہے۔

(۳) بحق ملکیت؛ کہ غلام باندی کا نفقہ ان کے آقا پر واجب ہے۔ زوجہ کے لیے نفقہ اس لیے واجب ہے کہ وہ بحق زوج محبوس ہے اور قاعدہ ہے کہ محبوس کا نفقہ حابس کے ذمہ واجب ہوتا ہے۔ اسی لیے عدت کی مدت تک نفقہ واجب ہوتا ہے کہ اس وقت یہ دیکھنے کے لیے تین حیض کی مدت مقرر ہے کہ کہیں اس کے پیٹ میں شوہر کا بچہ تو نہیں ہے اور اگر ہے تو پوری مدت حمل نفقہ دینا پڑے گا، اس لیے کہ وہ شوہر کے حق کے لیے محبوس ہے۔ بچہ جننے تک دوسری شادی بھی نہیں کر سکتی، لیکن عدت گزرنے یا وضع حمل کے بعد وہ آزاد ہے، اب کسی کے حق میں محبوس نہیں ہے، اس لیے اب نفقہ دلوانا شوہر پر ظلم و زیادتی ہے۔

فاروق: اگر مطلقہ عدت کے بعد دوسرے نکاح کی پوزیشن میں نہ ہو بڑھاپے کی وجہ سے بیماریوں کی وجہ سے یا کوئی اس سے نکاح کے لیے تیار نہ ہو تو کیا وہ بے یار و مددگار گداگری کرتی پھرے؟

شہاب: ہر گز نہیں! اسلام نے اس کا علاج کر رکھا ہے، بے سہارا، فاقہ کش نہیں بنایا۔ چناں چہ مطلقہ کی کئی حالتیں ہیں۔ ہر حالت میں کفالت کی سبیل موجود ہے، مثلاً وہ مطلقہ جس کا مہر مقرر نہ تھا اور طلاق قبل الوطی اور قبل خلوت صحیحہ ہوتی ہے تو اس کو متاع ملے گا اور

اس کی دوسری شادی میں کوئی دشواری نہیں اس لیے کہ یہ سیکنڈ ہینڈ نہیں ہوئی ہے۔ دوسرے وہ مطلقہ جو قبل الوطی ہوئی ہے، اس کو آدھا مہر ملے گا، اور اس کی دوسری شادی بھی دشوار نہیں ہے۔ تیسرے وہ مطلقہ جس کا مہر مقرر تھا اور طلاق بعد الوطی ہوئی ہے، اس کو پورا ملے گا۔ مدت عدت کا نفقہ ملے گا، اگر حاملہ ہوگی تو یہ نفقہ وضع حمل تک ملتا رہے گا، اور اگر حاملہ نہیں ہے، تو اگر حائضہ ہے، تو عدت تین حیض ہے، اگر حیض بہت فصل سے آئیں اور کئی سال میں حیض پورے ہوں تو نفقہ ملتا رہے گا، اگر حائضہ نہیں، آئیسہ ہے، تو تین ماہ تک نفقہ ملے گا۔

چوتھے اگر مطلقہ اولاد والی ہے، تو دو حالت سے خالی نہیں: اولاد بالغ ہے یا نابالغ، اگر نابالغ اولاد ہے، تو لڑکے کو سات سال اور لڑکی کو نو سال تک حق حضانت ہونے کی وجہ سے اپنے پاس رکھ سکتی ہے، جس کی وجہ سے شوہر کو اس مدت کا، بچوں کا خرچ اور پرورش کی اجرت عورت کو دینی پڑے گی، اگر عورت کے پاس مکان نہ ہو تو بچوں کی پرورش کی مدت تک مکان کا کرایہ دینا پڑے گا، اگر کوئی بچہ دودھ پیتا ہوگا تو شوہر کو اس کی اجرت بھی دینی پڑے گی، اور اگر اولاد بالغ ہے، تو بالغ مال دار اولاد پر ماں کا نفقہ واجب ہے۔ اور اگر اولاد نہیں ہے یا اولاد بہت غریب ہے اور عورت دوسرا نکاح نہ کر سکے، تو اس کے رشتہ داروں پر وراثت کے حقوق کے حساب سے اس کی کفالت واجب ہے، اور اگر کوئی رشتہ دار بھی نہ ہو یا ہو، مگر نادار ہو، تو بیت المال اس کی کفالت کرے گا، اور اگر اسلامی حکومت، بیت المال نہ ہو، تو پھر مسلمانوں کی جماعت، اجتماعی نظم کے ذریعے اس کی کفالت کرے گی؛ بہر حال وہ بے یار و مددگار کسی حال میں نہیں رہتی، ہر حال میں اس کی کفالت کی شکل موجود ہے۔

فاروق: اتنے ذریعے اس کی کفالت کے تلاش کرنے کے بجائے، اگر شوہر ہی کو کفیل بنا دیا جائے تو کیا حرج ہے؟

شہاب: حرج یہ ہے کہ اس میں عورت کی عزتِ نفس مجروح ہوتی ہے، اس لئے کہ شوہر اس کے لئے اجنبی ہو چکا، اس پر اس کا کوئی قانونی و عدالتی حق شرعاً نہیں رہا، تو بجائے اس کے کہ ایک اجنبی کے دروازے پر اس کو بھکاری بنا کر بٹھایا جائے، بہتر یہ ہے کہ جن پر اس کو قانونی اور عدالتی حق حاصل ہے، جیسے اولاد، یا ماں باپ، یا بیت المال، درجہ بدرجہ ان سے ان کا حق دلوا کر اس کو اپنے حق کی عزت کی روزی کیوں نہ دلوائی جائے؛

بہر حال یہ قانون اور فیصلہ جہاں غیر شرعی ہے وہیں غیر فطری بھی ہے، عورت کے لیے ذلت کا سبب بھی ہے اور بہت سے اسلامی احکامات کے منسوخ ہوجانے کا باعث بھی۔

نیز یہ فیصلہ حکومت کے اس وعدہ اور قانون کے بھی خلاف ہے جو دستور میں مسلم پرسنل لاء کو دیا گیا ہے۔ یہ مسلم پرسنل لاء میں کھلی مداخلت ہے جس کو برداشت نہیں کیا جاسکتا، اسلام کا شرعی قانون اللہ کا قانون ہے۔ یہ مسلمانوں کا خود کا بنایا ہوا پرسنل لاء نہیں ہے، اس میں خدا رسول کے علاوہ کوئی ترمیم و تنسیخ کا حق نہیں رکھتا، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کے بعد اس میں ہمیشہ کے لیے ترمیم و تنسیخ کا دروازہ بند ہو چکا ہے۔

جو مسلمان لیڈر یا حکام یا جج صاحبان اس میں عورت کی ہمدردی دکھلا رہے ہیں وہ درحقیقت عورت ورگ کے نادان دوست ہیں، جن کو بعض نادان عورتیں سمجھ نہیں پا رہی ہیں۔

فاروق: شہاب صاحب! مجھے آپ کی باتیں سن کر بڑی خوشی ہوئی واقعتاً آپ اسلام کے اچھے اِسکولر ہیں۔ آپ نے اس مسئلہ پر میری لاعلمی اور غلطی کو ثابت کر دیا، میں مسلم سماج اور خصوصاً علماءِ کرام سے معافی کا خواستگار ہوں اور حکومت کے سامنے دیئے گئے اپنے بیان کو واپس لیتا ہوں اور حکومت سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ اس قانون اور فیصلہ کے رد کا اعلان کرے اور ہمیشہ کے لیے مسلم پرسنل لاء میں ترمیم کے ارادے سے توبہ کرے؛ نیز مسلمانوں کو اطمینان دلائے کہ وہ دستور کے مطابق اپنے شخصی قانون میں ہمیشہ آزاد رہیں گے؛ نیز حکومت اپنے وزراء کو اس کا پابند کرے کہ وہ کبھی بھی اس مسئلہ پر ایسا بیان نہ دیں کہ جس سے مسلمانوں میں بے چینی پھیلے اور شکوک پیدا ہوں۔

شہاب: جناب فاروق صاحب! میں آپ کے اس جرأت مندانہ رجوع سے خوش ہوں صبح کا کھویا ہوا شام کو گھر واپس آجائے تو اس کو کھویا ہوا نہیں کہتے، مسلمان کی یہ ہی شان ہونی چاہئے کہ وہ غلطی واضح ہوجانے پر فوراً کان پکڑے، میں نے دورانِ گفتگو آپ کی شان میں کوئی گستاخی کی ہو تو معاف فرمائیں۔

فاروق: گستاخی نہیں! آپ نے مجھ پر احسان فرمایا اور مجھے آخرت کے محاسبہ سے بچالیا میں آپ کا شکر گزار ہوں۔

شہاب: السلام علیکم۔

فاروق: وعلیکم السلام۔

(۳۴) بابری مسجد

حامد: السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔

محمود: وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔

حامد: محمود صاحب! پچھلے دنوں ملک میں جو واقعات پیش آئے، بابری مسجد کو شہید کیا گیا۔ اس سلسلہ میں آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟

محمود: حامد صاحب! یہ اس فرقہ پرستی کا لازمی نتیجہ تھا جس کے لیے فرقہ پرست تنظیمیں رات دن عوام کے پاس جا کر ان کا ذہن بگاڑتی رہیں، ملک گیر پیمانہ پر یاترائیں نکالی گئیں، جن میں اشتعال انگیز تقریریں اور نعرے لگائے گئے، فرقہ پرست اخبارات نے بھی نفرت پھیلانے میں کوئی کسر باقی نہ رکھی، دوسرے طبقہ کی وقیع دلیلوں کا مذاق اڑایا گیا، اور ان کو دھمکیاں دی گئیں۔

حامد: کیا حکومت ان سب باتوں سے واقف نہیں تھی؟

محمود: حکومت ان تمام حرکات وافعال سے باخبر تھی، مگر کوئی مضبوط قدم اٹھانے سے آخر وقت تک کتراتی رہی، ادھر صوبائی حکومت عوام عدالت اور مرکزی حکومت کو آخری وقت تک یہ یقین دلاتی رہی کہ مسجد کی ہر قیمت پر حفاظت کی جائے گی۔

مگر افسوس! کہ نہ عدالت کے فیصلہ کا انتظار کیا گیا اور نہ سیکولرزم کی پرواہ کی گئی، نہ دوسرے ملکوں پر اس کے کیا اثرات ہوں گے اس کو سمجھا گیا، نہ جمہوری قدروں کی رعایت کی گئی، نہ اپنے حلفیہ وعدوں اور یقین دہانیوں کا بھرم رکھا گیا، فرقہ پرستوں نے سوچے سمجھے ناپاک منصوبہ کے مطابق دن دھاڑے بزدلانہ طریقہ پر صدیوں پرانی مسجد کو جو ملک کا وقار تھی دیکھتے ہی دیکھتے زمین دوز کر دیا اور بے شرمی کے ساتھ مگر مچھ کے آنسوں بہاتے ہوئے پہلے سے سوچے سمجھے منصوبہ کے تحت فرقہ پرست لیڈروں نے استعفیٰ دے دیئے، اور بہانہ بنالیا کہ ہم کو علم نہیں تھا کہ نوجوان جوش میں ہوش کھو بیٹھیں گے، اور اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکیں گے اور یہ شرمناک حرکت کر گزریں گے،

حالاں کہ ان ہی لوگوں میں سے ایک نے کاشی سے دوسرے نے متھرا سے یاترا شروع کی تھی اور ڈیڑھ لاکھ لوگوں کو جمع کیا۔ نیز صوبائی حکومت ان کو سہولت دیتی رہی، مرکزی حکومت کو اندرونی طور پر اس خطرے سے لوگوں نے باخبر کیا تھا مگر مرکزی حکومت اکثریت کا غصہ مول لینا نہیں چاہتی تھی، اس لیے اس نے بھی بعد میں بہانہ سازی کرنے اور مگرمچھ کے آنسوں بہانے کی مشق کر رکھی تھی؛ بہر حال جو کچھ ہوا وہ جمہوریت اور سیکولرزم کی پیشانی پر کلنگ کا ٹیکا ہے، اس سانحہ پر مسلم اقلیت کا ردعمل فطری تھا، شر پسندوں نے اس سے بھی فائدہ اٹھایا اور شقاوت و بربریت کا وہ مظاہرہ کیا کہ پورا ملک خون میں نہا گیا، ہزاروں جانیں ضائع ہوئیں، سیکڑوں بچے یتیم ہو گئے، سیکڑوں عورتیں بیوہ ہو گئیں، اربوں کھربوں کا مالی نقصان ہوا، اور ساری دنیا میں ملک بے عزت ہو گیا۔ لوگ پوچھتے ہیں؟ کیا یہ وہی ملک ہے، جہاں کے لوگ آہنسہ کو بطور عقیدہ تسلیم کرتے ہیں؟ افسوس صد افسوس! ان کو کیا جواب دیا جائے اور کیا کہہ کر قوم و ملک کی عزت بچائی جائے۔

حامد: یہ فرقہ پرست ایسی شرم ناک حرکتیں کیوں کرتے ہیں، جبکہ یہ حرکات پورے ملک اور قوم دونوں کی بربادی و بدنامی کا باعث ہیں۔

محمود: وہ اپنے سیاسی مقاصد اور اقتدار کے حصول کے لیے فرقہ پرستی کو آلۂ کار بنانا چاہتے ہیں۔

حامد: مگر لوگ ان کی چالوں کو کیوں نہیں سمجھتے ان کے بہکاوے میں کیوں آ جاتے ہیں؟

محمود: باتیں کچھ اس طرح کی جاتی ہیں کہ عام انسان متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

حامد: مثلاً کیا کہا جاتا ہے؟

محمود: کہا جاتا ہے کہ یہ ملک ہندؤں کا ہے مسلمان باہر سے اس ملک میں آئے ہیں انہوں نے اس ملک پر حملے کئے، اس ملک کو لوٹا اور برباد کیا، اور پھر اس پر قبضہ کر لیا۔

حامد: آج کا ہندو جن پورو جون کا سنتان ہے، وہ خود باہر سے یعنی وسط ایشیاء سے آئے تھے جو آریہ کہلاتے تھے، مقامی آبادی دروڑ کی تھی، ان پر آریوں نے حملہ کر کے جنوبی ہند بھاگنے پر مجبور کیا۔ لہٰذا اگر باہر سے آنا اور حملے کرنا جرم ہے تو اس کا ارتکاب تو خود ہندؤں نے بھی دراوڑوں پر کیا۔

محمود: وہ کہتے ہیں کہ مسلمانوں نے اپنے دور اقتدار میں سیکڑوں مندروں کو توڑ ڈالا۔

حامد: جہاں تک مندروں کو توڑنے کا سوال ہے تو مسلم قوم اسلامی قانون کے تحت کسی ملک کو فتح کر لینے کے بعد اس ملک کی مفتوحہ آبادی کو انسانی حقوق عطا کرتی ہے، ان کے جان و مال کی حفاظت کرتی ہے، ان سے عہد ذمہ لے لینے کے بعد ان کے معابد کی حفاظت کرتی ہے، اگر وہ خستہ ہو گئے ہوں تو ان کی مرمت کراتی ہے۔ جس کا زندہ ثبوت آٹھ سو سالہ مسلم دور حکومت کے باوجود اس ملک میں سیکڑوں ہزاروں مندروں کا وجود ہے، مسلم بادشاہوں کی طرف سے مندروں کو جاگیریں ملیں، جن کی اسناد آج بھی مندروں کے پاس موجود ہیں۔

محمود: کیا یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ مسلم دور حکومت میں ایک بھی مندر پر حملہ نہیں ہوا۔

حامد: بعض مندروں کو مسلم بادشاہوں یا مسلم فاتحین نے اگر توڑا بھی ہے، تو اس کی وجہ ان مندروں کو حکومت کے خلاف بطور اڈے کے استعمال کرنا تھا۔ دوران جنگ ان میں ہتھیار جمع کرنا اور دشمنوں کے چھپانے کے لیے استعمال کرنا تھا۔ ظاہر ہے کہ جب خالص مذہبی مقامات جنگ کے مقاصد میں استعمال ہونے لگیں اور دشمنوں کی پناہ گاہ بن جائیں، تو پھر ان کا تقدس باقی نہیں رہتا، کوئی بھی حکومت پھر ان کا لحاظ نہیں رکھ پاتی، اس کو ان مقامات پر حملہ کر کے دشمن کو نکالنا ہوتا ہے، اور اس عمل کے دوران عمارت اور مورتیوں کو نقصان پہنچنا فطری ہے۔ خود ہماری حکومت بھی سکھوں کے گردوارے کو جب ہتھیاروں اور دہشت پسندوں کی پناہ گاہ کی صورت میں استعمال ہوتا دیکھ رہی تھی، تو اس نے حملہ کیا، سپاہی اس میں داخل ہوئے، گردوارے کا احترام مجروح ہوا، ٹوٹ پھوٹ ہوئی، قتل و خون کیا گیا۔ معلوم ہوا کہ وار ٹائم یا ہنگامی حالات میں ہرنا کردنی، کرنی نا گزیر ہوتی ہے۔

دوسری وجہ یہ بھی ہوئی کہ غیور اور باحیا مسلم بادشاہوں یا پاکباز انسانوں نے مندروں کو جب اس حال میں دیکھا کہ ان میں دیوی دیوتاؤں کی مورتیوں کو عریاں اور ان کے مقامات ستر کو کھلی ہوئی صورت میں دکھلایا گیا ہے اور اس بے حیائی اور بے شرمی کی حامل شکلوں پر آرٹ اور فن مجسمہ سازی کا پردہ ڈال کر ان مقدس مقامات کو جہاں مرد و عورت، ماں بہن سب سر جھکانے حاضر ہوتے ہیں، حیا سوز منظر کی شکل میں پیش کیا ہے، تو

انہوں نے اس فطری غیرت کے جذبے سے مورتیوں کو برداشت نہیں کیا اور توڑ پھوڑ کا عمل پیش آ گیا ہوگا۔

تیسری وجہ یہ بھی رہی ہوگی کہ اکثر اس زمانہ میں مندر کی مورتیاں سونے چاندی موتی اور جواہرات سے لیس ہوتی تھیں، مسلم فوجیں موقعہ پا کر مال کی حرص میں مندروں کو نشانہ بنا لیتی تھیں، تاکہ مال و دولت ہاتھ آ جائے اور بادشاہ تک ان کی ان حرکات کی خبر بھی نہ پہنچنے پاتی ہوگی، یا بادشاہ بھی سب دیندار نہیں ہوتے تھے۔ بعض نے مال و دولت کے لیے کہوایسا ارتکاب بھی کر ڈالا ہو، یہ اس کا ذاتی فعل ہوتا تھا، اسلام کا اس سے کوئی تعلق نہیں تھا۔

چوتھی بات یہ تھی کہ زہد اور تیاگ کی تعلیم دینے والوں کا مندروں کی مورتیوں کو سونے چاندی اور جواہرات جیسی قیمتی دھاتوں میں ڈھلے ہوئے مجسموں میں پیش کرنا یہ زہد و تیاگ کا مذاق اڑانا ہے، تو مورتی کو توڑنا در حقیقت ایک تنبیہ تھی جو مذہب اور عقیدے کے نام پر ہونے والے ڈھونگ کی نقاب کشائی تھی، جو عوام کے ساتھ ایک ہمدردی تھی۔

لوگوں نے اس کا نام بت شکنی اور مندر توڑ جذبہ رکھ لیا، رہ گیا مندر توڑ کر مسجد بنانا، علماء کسی بادشاہ کے اس فعل کو کیسے سند جواز دے سکتے تھے، غصب کی ہوئی ناجائز جگہ پر نماز کی اجازت کیسے دی جا سکتی تھی۔ ہاں! ہندوؤں نے کسی جگہ اگر مندر بیچ دیا ہوگا اور مسلمانوں نے خریدی ہوئی جگہ پر مسجد بنائی ہوگی۔

محمود: کیا بابری مسجد۔ مندر توڑ کر نہیں بنائی گئی؟

حامد: جہاں تک بابری مسجد کو مندر بنانے کی بات ہے یہ بالکل خلاف عقل ہے، اس لیے کہ یہ بات مسلّم ہے کہ بابر کا پوتا اکبر، آخر میں انتہائی ہندو نواز ہو گیا تھا بلکہ ہندوانہ طرز پر عبادت کرنے لگا تھا، قشقہ لگاتا، دھوتی پہنتا، جینوئے (زُنار) زیب تن کرتا تھا، بہت سے مسلم شعار اس نے ممنوع کر دیئے تھے۔ اس نے ہندو عورتوں سے شادیاں کر لی تھیں، ہندوؤں کا اس وقت دور دورہ تھا، اسی دور میں تلسی شاعر ایودھیا آیا اور اس نے رام چرلر ماس لکھا۔ جب کہ اس وقت صرف چالیس سال ہوئے تھے، اگر یہ مسجد مندر توڑ کر بنائی گئی ہوتی تو ایودھیا کا ہر آدمی اس سے واقف ہوتا اور تلسی جس نے اِس دور میں رام چرت مالس لکھا، وہ ضرور اس کا تذکرہ کرتا اور اس ظلم کو بیان کرتا اور اکبر جیسا ہندو

نواز بادشاہ اس کو بھی برداشت نہ کرتا، اس کی ہندو رانیاں مسجد کو تڑوا کر مندر بنوا ڈالتیں۔ معلوم ہوا اس دور میں کوئی اس کا مدعی نہیں تھا کہ یہ مسجد مندر توڑ کر بنائی گئی ہے؛ یہ سب بعد کے دعوے ہیں جو ہندو مسلم دشمنی پیدا کرنے کے لیے کیئے جاتے رہے ہیں؛ اور آج بھی اسی مقصد کے لیے یہ دعویٰ کیا جا رہا ہے، ورنہ تو خود وہ لوگ جو آج مندر کے غم میں گھل رہے ہیں، ان میں سے ایک صاحب جنتا حکومت میں وزیر خارجہ رہے تھے۔ دوسرے صاحب وزیر اطلاعات ان کو اس دور میں اس مسئلہ کے اٹھانے کا خیال تک نہ آیا۔ لیکن جب ان کی حکومت ختم ہوگئی اور دوبارہ حکومت حاصل کرنے کے لیے اور کوئی نعرہ عوام میں چلتا نظر نہ آیا تو مندر کا سہارا لے لیا۔ معلوم ہوا کہ صرف سیاسی مفاد کے لیے یہ دعویٰ کیا جا رہا، ورنہ تو ایک صاحب اپنی عمر میں ۴۶ رسال بعد رام کی زیارت کرنے کیوں نکلے؟

اس سے پہلے ان کو کبھی وہاں حاضری دینے کا خیال نہ آیا یہ کیسے رام بھگت ہیں؟ نیز ہندو عقیدہ کے مطابق دنیا کے چار دور ہیں: ست یگ، دواپر، تیرتیا، اور کل یگ؛ بعض کی تحقیق ہے کہ رام ان میں سے ترتیا میں گذرے ہیں جو انسانی آبادی سے پہلے کا دور ہے، جو دنیا میں جنات کی آبادی کا دور تھا، لہٰذا جب رام انسانی آبادی سے پہلے کے دور کے یعنی جنات کے دور میں سے تھے تو انسانی دور میں ان کے مندر بننے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، نہ انسانوں نے ان کو دیکھا، نہ اس وقت انسانوں کا وجود تھا، نہ انسانوں کو ان کے جائے پیدائش کا علم تھا۔

محمود: وہ کہتے ہیں کہ یہ مسئلہ عقیدے کا ہے، اس میں عقلی گھوڑے دوڑانے اور عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانے کی ضرورت نہیں۔

خالد: عقیدے کی جہاں تک بات ہے تو رام کے روپ میں وشنو نے اوتار لیا، یہ ایک طبقے کے عقیدے کی بات ہو سکتی ہے، اس میں عدالت کے فیصلہ کی ضرورت نہیں، لیکن کسی جگہ پر ماضی میں رام مندر تھا اور بعد میں کسی دور میں اس کو توڑ کر مسجد بنائی گئی یہ تاریخی اور دیوانی مسئلہ ہے، اس کے لیے عدالت کو ثبوت مانگ کر فیصلہ کا حق حاصل ہے۔

محمود: وہ کہتے ہیں کہ مسلمانوں نے اپنی حکومت میں ہندو تہذیب و ثقافت کو مٹایا۔

خالد: یہ غلط ہے، اگر ایسا ہوتا تو مسلمانوں کے اتنے طویل دورِ حکومت کے بعد ہندو

تہذیب پوری طرح مٹ گئی ہوتی، بلکہ تہذیب و کلچر ایسی چیزیں ہیں کہ ہر ایک قوم دوسری قوم سے کچھ لیتی ہے اور کچھ کو دیتی ہے، چناں چہ مسلم قوم نے بہت سے آداب زندگی اپنے ہم وطنوں کو دیئے ہیں، جن سے وہ محروم تھے، اور بہت سے رسم و رواج ان کے خود اختیار کر لیے جب کہ وہ اسلامی تہذیب کے قطعاً خلاف تھے۔

محمود: وہ کہتے ہیں مسلمانوں نے ہندو عقائد کی دھجیاں اڑائیں۔

خالد: جہاں تک عقائد کا تعلق ہے مسلمانوں کے پاس توحید کا معقول عقیدہ تھا، جو سارے عالم کے لیے رحمت تھا اور انسانی شرافت، عزت اس سے برقرار رہتی تھی، مسلمانوں نے اس نعمت کے باب میں بخل سے کام نہیں لیا، اس عظیم عقیدے کو جو نجات اور عزت کا ضامن تھا، اپنے ہم وطنوں کو بھی تلقین کیا اور ان کو پتھر اور دھات کے خود تراشے ہوئے سیکڑوں معبودوں کی پرستش سے باز رہنے کی تلقین کی اگر یہ احسان کرنا بھی دشمنی ہے تو پھر عقل کے ناخن لینا چاہیے۔

محمود: خالد صاحب! آج آپ نے بڑے ہی قیمتی اور مدلل جوابات عنایت فرمائے ہیں، میں ضرور آپ کی باتیں ان تک پہنچاؤں گا۔

خالد: خدا کرے کہ لوگ اپنے ذاتی یا جماعتی مفاد کے مقابلہ میں ملک کے امن اور مفاد کو مقدم رکھیں جو ایسا کریں گے، وہ ہی درحقیقت سچے ہندوستانی ہیں، آپ میری یہ باتیں ضرور ان حضرات تک پہنچائیں، ان میں جو نیوچرل (Natural) ذہن سے غور و فکر کرنے کے عادی ہیں وہ ضرور اس بات کو سمجھیں گے۔

محمود: اچھا! خدا حافظ!

(۳۵) طلاق ثلاثہ کا حکم نقل و عقل کی روشنی میں

حامد: مولانا صاحب! السلام علیکم۔

حمید: حامد صاحب! وعلیکم السلام۔

حامد: مولانا حمید صاحب! کہئے کیسے مزاج ہیں۔

حمید: الحمدللہ! بخیریت ہوں۔

حامد: مولانا صاحب! علماءِ اہلِ حدیث نے تین طلاقوں کو ایک طلاق ماننے کا اعلان کیا ہے۔ آج کل اخبارات میں اس فیصلہ پر بڑی خوشی کا اظہار کیا جا رہا ہے۔

حمید: حامد صاحب! یہ فیصلہ آج نہیں ہوا ہے، یہ تو مسلمانوں میں علماءِ اہلِ حدیث کا قدیم فیصلہ ہے۔

حامد: مولانا صاحب! اگر یہ فیصلہ ایک طبقے کے علماء نے پہلے سے دے رکھا ہے جیسا کہ خود آپ بھی تسلیم کر رہے ہیں، تو اس کو اگر سبھی مسلمان خواہ وہ کسی بھی مسلک کے ہوں، تسلیم کر لیں تو کیا حرج ہے؟

حمید: مگر اس وقت مانا جا سکتا ہے جبکہ وہ مسئلہ شرعی دلائل سے ثابت ہو۔

حامد: اگر شرعی دلائل سے ثابت نہ ہوتا تو اہلِ حدیث اس کو کیوں تسلیم کرتے۔

حمید: کیا آپ ان کے دلائل سے واقف ہیں، ان کے پاس کیا عقلی نقلی دلائل ہیں۔

حامد: میں نے ان کے علماء سے بات چیت کی ہے، ان کے پاس جو دلائل ہیں، میں ان کو بیان کرتا ہوں۔

حمید: بیان کیجئے، ہم بھی دیکھیں ان میں کتنی قوت ہے۔

حامد: مولانا صاحب! سنئے یقیناً نکاح ایک شرعی، سماجی اور قانونی مضبوط بندھن ہے، مگر شوہر و بیوی میں نباہ نہ ہونے کی شکل میں صلح و آشتی کی تمام کوششوں کے ناکام ہو جانے کے بعد آخری چارۂ کار کے طور پر ہمیشہ کی ضیق سے چھٹکارے کے لیے طلاق وہ طریقہ ہے جس کی اجازت نہ دینا ایک فطری مذہب کے لیے غیر فطری فیصلہ سمجھا جاتا، اس لیے

ایسے ناگزیر حالات میں تدریجی طور پر اس بندش کو ختم کرنے کا ایسا آسان طریقہ اسلام میں بتایا گیا ہے، جس میں علیحدگی کے عمل کی گرہوں کو ایک ایک کر کے کھولنے کی سفارش کی گئی ہے، تاکہ ایک گرہ کے کھل جانے کے بعد اگر پھر سابقہ عہد و پیمان اور ماضی کی خوش گوار ادائیں یاد آ جائیں تو ان بندشوں کو مزید کھولنے سے باز رہا جائے اور یہ مقدس رشتہ برقرار رہے، اسلام کی اس ہدایت کو قرآن مجید نے بھی بیان کیا ہے اور اس میں تدریجی اقدام پر زور دیا ہے، احادیث میں جو شریعت کا دوسرا ماخذ ہے، اس تدریجی اقدام کے خلاف بیک وقت کے انقطاع کو جو تین طلاقوں کے ذریعہ وجود میں آتا ہے نا پسند کیا ہے، اس کے خلاف کرنے پر سخت وعیدیں وارد ہوئی ہیں۔ نصوص کے اس انداز کو سامنے رکھ کر علماءِ اہل حدیث نے غیر تدریجی انداز، علیحدگی اور انقطاع یعنی تین طلاقوں کو (چاہے وہ بیک لفظ دی گئی ہوں یا بہ لفظ) طلاق کے قانونی اثر سے ہی خارج کر دیا اور شرعی تدریجی ہدایت کے مطابق صرف ایک ہی طلاق کا حکم لگایا ہے، اس لیے کہ جس بات سے روکا جائے جو مشروع طریقہ کے خلاف ہو اس کا اعتبار نہیں ہوتا؛ دیکھو تراویح ۲۔۲ رکعات پڑھنی مشروع ہے، اب اگر کوئی دو رکعات پر نہ بیٹھے اور چار رکعت پڑھ لے، تو باوجود چار رکعات پڑھ لینے کے دو رکعات ہی تراویح میں شمار ہوں گی، اور دو رکعت تراویح پھر پڑھنی پڑے گی؛ اسی طرح عدت کے زمانہ میں نکاح ممنوع ہے، اگر پھر بھی کوئی کر لے تو منعقد ہی نہ ہوگا۔

حمید: آپ نے جو باتیں ذکر کیں وہ تسلیم ہیں مگر یہ قاعدہ بالکل غلط ہے کہ شریعت نے جس چیز سے روکا ہے اس کا اعتبار ہی نہیں ہوگا، فقہی قانون تو یہ کہ نہی افعال شرعیہ سے منہی عنہ کے معتبر ہونے پر دال ہے، ممانعت کے باوجود عمل کرنے پر گنہگار تو ضرور ہوگا، مگر فعل معتبر سمجھا جاتا ہے۔ دیکھئے حالت حیض میں طلاق دینا ممنوع ہے لیکن پھر بھی اس حالت میں طلاق دینے سے طلاق پڑ جاتی ہے۔ حضرت ابن عمرؓ نے حالت حیض میں طلاق دی تھی حضور نے رجوع کو کہا۔ اگر نہیں پڑی تھی تو رجوع کس چیز سے کرایا گیا دیکھئے شرط لگا کر حلالہ کروانا منع ہے، اس پر لعنت وارد ہوئی ہے پھر بھی اگر کرایا جائے، تو حلالہ معتبر ہو جاتا ہے، جنابت کے بعد غسل ضروری اور مشروع ہے، اور زنا حرام، ممنوع اور قبیح ہے، مگر اس کے باوجود زنا کے بعد غسل واجب ہوگا، عید کے دن کا روزہ حرام اور

ممنوع ہے، مگر نذر کے روزے کی نیت سے اس دن روزہ رکھ لیا جائے تو نذر کا روزہ ادا ہو جاتا ہے، بہت سی صورتوں میں شروط فاسدہ کی وجہ سے بیع فاسد ہوتی ہے مگر قبضہ صحیح مانا جاتا ہے کسی کا مال غصب کرنا ممنوع ہے اور حرام ہے مگر مغصوبہ مصلے پر نماز صحیح ہو جائیگی بہر حال یہ کہنا کہ جس چیز سے شرعاً روکا گیا ہے وہ شرعاً معتبر نہ ہو اصول فقہ سے ناواقفیت کی علامت ہے، لہٰذا تین طلاقیں بیک وقت اگرچہ ممنوع اور ناپسندیدہ ہیں مگر دیدینے کے بعد وہ تین ہی مانی جائیں گی اگر شرع کے مبغوض ماننے کی وجہ سے تین طلاقوں کے اثر کو غیر مؤثر مانا جا رہا ہے تو پھر نفس طلاق کو بھی شرعاً مبغوض مانا گیا ہے لہٰذا اسلام میں طلاق کے وجود کا انکار کر دینا چاہئے۔ نیز جب ممنوع کا وقوع نہیں ہوتا تو تین طلاقیں اکٹھی دینے کی صورت میں ایک طلاق بھی نہ پڑنی چاہئے چنانچہ روافض اسی پر عمل کر کے ایک طلاق بھی اس صورت میں واقع نہیں کرتے۔ رہ گیا آپ کا مثال تراویح اور عدت میں نکاح کے منعقد نہ ہونے کی مثال پیش کرنا تو یہ مثالیں درست نہیں اس لئے کہ تراویح میں اس نے ۲/۲ رکعات کی نیت کی تھی تو دو رکعات پوری ہو گئیں، اب اگلی دو رکعات بلا نیت کے رہ جانے کی وجہ سے معتبر نہ ہوں گی، اور عدت میں نکاح نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ شریعت نے عدت میں نکاح کی نفی کی ہے کہ نکاح ہوتا ہی نہیں ہے، نہی نہیں کی، کہ نکاح نہ کرنا۔ نفی اور نہی میں فرق ہے؛ جس بات کی نفی کی جائے اس کے کرنے سے وہ فعل معتبر ہی نہ ہوگا، اور جس فعل سے نہی کی جائے تو وہ فعل کرنے سے تو معتبر ہو جائے گا، مگر نافرمانی کی وجہ سے گناہ کا موجب ہوگا؛ نیز اگر اکٹھی تین ممنوع اور طریقہ کے خلاف ہونے کی وجہ سے غیر مؤثر ہیں، تو آیت میں اس کے بعد "وَ مَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ" کیوں فرمایا گیا؟ جب آپ کے کہنے کے مطابق تین طلاق کے باوجود ایک ہی ہو، تو اس نے اپنے اوپر کیا ظلم کیا؟ اس کا تو کوئی نقصان ہی جب نہیں ہوا، تو فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ کیوں کہا گیا؟

حامد: مولانا صاحب! آپ قرآن مجید میں یہ دکھلا سکتے ہیں کہ طلاقیں اگر اکٹھی دی جائیں تو وہ معتبر ہوتی ہیں۔

حمید: جی ہاں! قرآن مجید نے کہا: اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ۔ اس آیت کا مطلب ہے، طلاقیں دو ہیں، جو اگر اکٹھی بھی دی

جائیں تو واقع ہو جاتی ہیں، ان کے بعد عدت میں رجوع کا بھی حق رہتا ہے۔

حامد: آپ نے آیت کا مطلب غلط سمجھا ہے، آیت میں ''مَرَّتَان'' کا لفظ استعمال ہوا ہے جو عدد کے لیے نہیں ہے بلکہ دو مرتبہ طلاق دینے کے معنی میں ہے، اور ''الطَّلاقُ مَرَّتَان'' میں ''الطَّلاقُ'' بمعنی تطلیق ہے، مطلب یہ ہے دو مرتبہ الگ الگ طلاق دینا ہے۔ اگر آیت میں دو طلاقیں اکٹھی دینے اور ان کے معتبر ہونے کا مفہوم ہوتا تو عبارت الطَّلاقُ اِثْنَانِ ہوتی۔

حمید: حامد صاحب! یہ قرآن پاک کا اعجاز ہے کہ اس نے بجائے ''اثنان'' کے ''مَرَّتَانِ'' فرمایا، کیوں کہ مرتان کا قاعدہ یہ ہے کہ جب یہ فعل کے ساتھ بولا جاتا ہے، تو دو مرتبہ الگ الگ فعل کرنے کے معنی بتلاتا ہے، جیسے: اَکَلْتُ مَرَّتَیْن کے معنی، میں نے دو مرتبہ کھانا کھایا۔ اور جب اسم کے ساتھ بولا جاتا ہے تو عدد کے معنی دیتا ہے، جیسے اَلْعَیْنُ مَرَّتَان آنکھیں دو ہیں۔

لہٰذا ''الطَّلاقُ مَرَّتَان'' کے معنی ہیں، طلاقیں دو ہیں، جو اگر اکٹھی بھی دی جائیں تو پڑ جاتی ہیں، اور ان کے بعد رجوع ہو سکتا ہے۔

حامد: حدیث میں بیک وقت کی تین طلاقوں کو ایک مانا گیا اور رجوع کا حق دیا گیا ہے۔

حمید: وہ کونسی حدیث ہے اور کون سی کتاب میں ہے۔

حامد: ابوداؤد میں روایت ہے کہ رُکانہؓ نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دی تھیں، جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے آکر ذکر کیا، تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کتنی کا ارادہ کیا تھا؟ انہوں نے کہا، ایک کا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قسم کھا کر کہہ رہے ہو، انہوں نے کہا: واللہ! آپ نے فرمایا کہ جاؤ، ایک ہی پڑے گی، رجوع کرلو۔ یہ روایت مسندِ احمد میں بھی موجود ہے۔

حمید: حدیث رُکانہؓ سے استدلال صحیح نہیں ہے، اس لیے کہ یہ روایت دو طرح ابوداؤد میں روایت کی گئی ہے: ایک روایت میں رُکانہؓ کے طلاق ''البتۃ'' دینے کا ذکر ہے۔ دوسری روایت میں ''طَلَّقَهَا ثَلاثًا'' کا تذکرہ ہے۔ جس روایت میں ''طَلَّقَهَا ثَلاثًا'' مذکور ہے، وہ ابن جریج کے طریق سے مروی ہے۔ ابوداؤد نے ''البتۃ'' کے لفظ سے ان کے طلاق دینے والی روایت کو ابن جریج کے طریق والی پر جس میں ''ثلاثًا'' کا لفظ ہے

ترجیح دی ہے، اور رُکانہ کی روایت کو ''بَابُ فِی الْبَتَّةِ'' کے تحت ہی نقل فرمایا ہے، اور وجہ ترجیح یہ ذکر فرمائی ہے کہ انہوں نے ''بتۃ'' کے لفظ سے طلاق دی تھی؛ اس کو رُکانہ کے گھر کے لوگ نقل کر رہے ہیں، اور ایسے معاملہ میں گھر کے لوگوں کی بات ہی معتبر مانی جائے گی۔ رُکانہ کی بیوی کا نام سہیمہ تھا، علامہ شوکانی اہل حدیث میں سے ہیں، ''نیل الاوطار'' میں فرماتے ہیں کہ یہ بات پایۂ ثبوت کو پہونچ چکی ہے کہ رکانہ نے طلاق ''بتۃ'' دی تھی نہ کہ طلاق ''ثلاثہ''۔ حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں لکھا ہے کہ ابوداؤد نے رُکانہ کے اہلِ خانہ کے بیان سے جو یہ لکھا ہے کہ انہوں نے طلاق ''بتۃ'' دی تھی، یہی صحیح ہے۔ ابنِ حجر مسندِ احمد کی روایت پر ابوداؤد کی روایت کو ترجیح دیتے ہیں، اس لیے کہ مسند احمد کی روایت ابن حجر کے نزدیک معلل ہے اور اس کا متن بھی اضطراب سے خالی نہیں؛ اس سے معلوم ہوا کہ رکانہ کی طلاق ''البتۃ'' کے لفظ سے دی گئی تھی اور ''البتۃ'' کے لفظ میں ایک اور تین کی گنجائش ہوتی ہے، اس لیے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی مراد اور نیت دریافت کی، ورنہ لفظ ''ثلاثہ'' اگر موجود ہوتا تو نیت معلوم کرنے کی ضرورت ہی نہ ہوتی صراحتاً تین طلاق پر تو ہمیشہ مغلظہ کا حکم لگایا جاتا تھا، رُکانہ سے مزید پختگی کے لیے آپ نے قسم بھی لی، اس لیے کہ ''البتۃ'' کے لفظ میں تین بھی نیت کی وجہ سے پڑ سکتی تھی، جب انہوں نے قسم کھا کر ایک کی نیت کا اظہار فرمایا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک کا فیصلہ فرمادیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ درایۃً بھی ابوداؤد کی ابن جریج کے طریق والی روایت معتبر نہیں، ورنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا قسم لینا بے معنی ہو جاتا ہے۔ ترمذی اور ابن ماجہ نے بھی روایت ''البتۃ'' کے لفظ سے نقل کی ہے نہ کہ ثلاثہ کے لفظ سے اس طرح دار قطنی اور ابن حبان، حاکم وغیرہ نے بھی ابوداؤد کی اس ترجیح کی تحسین کی ہے اور اکثر محدثین نے ابن جریج کی روایت کو منکر اور ضعیف گردانا ہے۔

جہاں تک مسند احمد میں رکانہ کی حدیث جس کو ابن عباسؓ نے ''ثلاثہ'' کے ساتھ روایت کیا ہے اور اس میں تین طلاقوں کے باوجود جو بیک مجلس اور بیک لفظ تھیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو ایک گردانا اور رجوع کو کہا اور انہوں نے رجوع کیا، مگر یہ روایت بھی قابل حجت نہیں، اس لیے کہ اس میں ایک راوی داؤد ابن الحصین ہیں۔ ان کی روایت جب عکرمہ کے طریق سے ہو تو اس کا اعتبار نہیں جیسا کہ یہ بات امام بخاری کے استاذ

علی ابن مدینی نے لکھی ہے، اور داؤد ابن حصین نے یہ روایت رکانہ والی عکرمہ کے واسطے سے ہی نقل کی ہے، نیز اس روایت میں ایک راوی محمد ابن اسحاق ہیں، ان پر اصحاب فن نے بہت جرح کی ہے۔ بہر حال اس طرح یہ روایت منکر قرار پاتی ہے، جس کو قوی ترین روایت کے مقابلے میں قبول نہیں کیا جاسکتا۔ صرف محدث ابو یعلی نے رُکانہ کی توثیق کی ہے، مگر یہ معلوم نہیں ہے کہ سند کی توثیق کی ہے یا متن کی، سند کی توثیق سے متن کی توثیق لازم نہیں آتی، جیسا کہ اہل حدیث کے مسلم محدث مولانا عبدالرحمٰن مبارکپوری نے اپنی کتاب ''ابکار'' میں لکھا ہے کہ روایت کے ثقہ ہونے سے جو حدیث ثقہ قرار پائے تو ضروری نہیں کہ وہ متن کے اعتبار سے بھی ضرور صحیح ہو، پھر خود امام احمد جو اپنی مسند میں حدیث رُکانہ نقل فرما رہے ہیں، جس میں تین طلاق کو ایک گردانا گیا ہے، ان کا اپنا مسلک تین کو تین ہی ماننے کا ہے، جب راوی اپنی مروی عنہ کے خلاف رائے رکھے اور فتویٰ دے تو اس کے فتوے کا اعتبار ہوتا ہے نہ کہ روایت کا۔ اسی طرح اس روایت کے راوی عبداللہ ابن عباسؓ بھی اگر چہ وہ رُکانہ والی روایت، روایت کررہے ہیں، مگر فتویٰ اس کے خلاف دیتے تھے۔ معلوم ہوا کہ جب راوی اپنی مروی عنہ کے خلاف فتویٰ دے، تو یہ اس بات پر دال ہے کہ وہ روایت اس کے نزدیک منسوخ ہے؛ ابن عباسؓ کا فتویٰ مؤطا امام مالک میں موجود ہے۔ نیز چاروں ائمۂ فقہ اور امام بخاریؒ، امام مسلمؒ، سفیان ثوریؒ، امام اوزاعیؒ، ترمذیؒ جیسے قدیم تمام محدثین تین طلاق کو تین ہی قرار دینے کے قائل ہیں ایک لاکھ صحابہ میں محض بیس صحابہ صاحبِ فتویٰ اور صاحبِ اجتہاد ہیں، ان میں سے چودہ کے فتوے تین طلاق کو تین ہی ماننے کے ہیں؛ یہ خوارج اور روافض کا پھیلایا ہوا فتنہ ہے جنہوں نے غلط طور پر بعض لوگوں کے نام تین طلاق کو ایک ماننے والوں میں جوڑ دیئے ہیں جن کا کوئی فقہی مقام نہیں ہے، اور جن کا کوئی فقہی مقام ہے تو وہ دور اول کے اتنے صحابہ اور فقہائے عظام جو سب کے نزدیک مسلّم ہیں، ان کے مقابلے میں کوئی درجہ نہیں رکھتے۔

حامد: مولانا صاحب! امام مسلم، ترمذی اور ابوداؤد وغیرہ محدثین نے ابنِ عباس کی ایک روایت نقل کی ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ دورِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اور دورِ صدیقیؓ اور حضرت عمرؓ کے ابتدائی دور تک تین طلاقوں کو جو ایک ساتھ دی گئی ہوں ان کو ایک ہی مانا

جاتا تھا بعد میں حضرت عمرؓ نے اپنے دور میں جب دیکھا کہ لوگ ایک ساتھ تین طلاق دینے لگے ہیں اور طریقہ کے مطابق ایک ایک طلاق مختلف طہروں میں دینا چھوڑ دیا ہے تو انہوں نے سزاءً تین کو اب بجائے ایک قرار دینے کہ تین ہی مان لینے کا فیصلہ کردیا، تاکہ شوہر کو جلد بازی کی سزا مل جائے اور رجوع کی رعایت حاصل نہ رہے۔

حمید: وہ کونسی روایت ہے؟ اس کے الفاظ کیا ہیں؟

حامد: وہ روایت مسلم میں اس طرح ہے کہ: كَانَ الطَّلاقُ عَلىٰ عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ وَ اَبِىْ بَكْرٍ وَ سَنَتَيْنِ مِنْ خِلَافَةِ عُمَرَ رَضِىَ اللّٰهُ تَعَالىٰ عَنْهُ طَلَاقُ الثَّلَاثِ وَاحِدَةٌ فَقَالَ عُمَرُ اَنَّ النَّاسَ قَدِ اسْتَعْجَلُوْا فِىْ اَمْرٍ كَانَتْ لَهُمْ فِيْهِ اَنَاةٌ فَلَوْ اَمْضَيْنَاهُ عَلَيْهِمْ فَاَمْضَاهُ عَلَيْهِمْ۔

حمید: اس روایت کی سند میں اضطراب ہے، کہیں واسطہ ابو صہباء کا ہے کہیں نہیں۔ اس روایت کو امام مسلم نے تین سندوں سے بیان کیا ہے، دو سندوں میں طاؤس ابو صہباء کے واسطہ سے ابن عباسؓ سے روایت بیان کررہے ہیں۔ مگر تیسری سند میں ابو صہباء کا واسطہ غائب ہے، پھر بھی پہلی دو سندوں سے یہ واسطہ اس طرح ہے کہ ابو صہباء کے سوال پر ابن عباسؓ نے یہ جواب دیا کہ پہلی تین دوروں میں تین طلاق ایک سمجھی جاتی تھی مگر حضرت عمرؓ نے اپنے ابتدائی دور میں تین کو تین ہی قرار دے دیا۔ مگر تیسری سند سے جو روایت ہے جس میں ابو صہباء کا واسطہ غائب ہے، اس میں ابو صہباء کے سوال کرنے اور اس کے جواب میں ابن عباسؓ کے فرمانے کا تذکرہ نہیں ہے، اس لیے تین میں اضطراب ظاہر ہوتا ہے، پھر یہ کہ ان تینوں سندوں سے بیان ہونے والی روایتوں کا تعلق ایک ہی مسئلہ سے ہے، وہ اس طرح کہ جو شخص غیر مدخولہ کو تین لفظوں میں تین طلاقیں دیدے، تو صرف ایک پڑتی تھی، اس لیے کہ غیر مدخولہ ایک ہی طلاق سے بائنہ ہوجاتی تھی، دوسری اور تیسری طلاق کا محل نہ رہنے کی وجہ سے وہ لغو ہوجاتی تھیں۔ دورِ عمرؓ میں لوگوں نے جب غیر مدخولہ کو بیک لفظ تین طلاقیں دینا شروع کیا تو انہوں نے کہا کہ جب تین ایک ہی لفظوں میں دیتے ہیں تو تین ہی پڑ جائے گی جیسا کہ غیر مدخولہ کا قانون دورِ نبوی سے یہی چلا آرہا ہے، تین لفظوں میں الگ الگ دے گا تو ایک پڑے گی اور اگر بیک لفظ تین کا عدد بولے گا، تو تین پڑے گی۔

مگر تعجب کی بات ہے کہ ابن قیم نے مسلم میں مذکور ان تین روایات کو دو واقعوں کے ساتھ جوڑ کر فرمایا کہ پہلی دو روایتیں جس میں ابوصہباء کا واسطہ ہے، ان کا تعلق غیر مدخولہ سے ہے۔ اور تیسری روایت جس میں طاؤس براہِ راست ابن عباسؓ سے نقل کرتے ہیں، ابوصہباء کا واسطہ اس میں نہیں ہے، وہ روایت عام ہے، خواہ مدخولہ ہو یا غیر مدخولہ ہو، اس میں تین طلاق کی شکل میں صرف ایک پڑے گی اور اس روایت کو ابن قیم قوی کرنے کے لیے فرماتے ہیں کہ اس کو ابن عباسؓ سے ایک نے نہیں، تین رواۃ نے نقل کیا ہے یعنی طاؤس، ابوصہباء اور ابوجوزاء؛ اور ابوجوزاء کے واسطے والی روایت حاکم میں موجود ہے۔

حالاں کہ واقعہ یہ ہے کہ ابوصہباء اور ابوجوزاء ایک ہی راوی کی دو نسبتیں ہیں، اس حدیث کے ایک راوی نے بجائے ابوصہباء کے ابوجوزاء کہہ دیا ہے، ابن قیم حاکم کا حوالہ دے رہے ہیں، حالاں کہ سب مانتے ہیں کہ حاکم کمزور اور ضعیف روایت پر صحیح کا عنوان لگانے میں جری ہیں۔

طاؤس نے اور روایات چاہے ابن عباس سے براہِ راست سنی ہوں، مگر یہ روایت براہِ راست نہیں سنی، اس لیے کہ دوسرے طریق میں ابوصہباء کا واسطہ ذکر کر رہے ہیں اور ابوصہباء ضعیف ہیں۔

سچ پوچھو تو روایت ہی غلط ہے۔ ابن رجب حنبلی امام احمد شافعی وغیرہ کا خیال اس روایت کے بارے میں یہ ہی ہے، ویسے بھی راوی کا منفرد ہونا، چاہے ثقہ ہو، حدیث میں علت سمجھا جاتا ہے۔ امام بخاری نے اس روایت کو لیا ہی نہیں ہے، جبکہ اس روایت سے اتنا اہم مسئلہ متعلق تھا۔ اگر یہ روایت قابل قبول ہوتی تو بخاری ضرور اس کو ذکر کرتے۔

پھر اس روایت کے راوی جو ابن عباس ہیں ان کا خود کا فتویٰ بھی اس روایت کے خلاف ہے، جو اس کی دلیل ہے کہ روایت ان کے نزدیک منسوخ تھی، اس اصول کو خود مشہور سلفی عالم نواب صدیق حسن خان نے بھی تسلیم کیا ہے۔

پھر یہ حدیث ان تمام صحیح ترین روایات کے خلاف ہے، جن روایات میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں تین طلاقوں کو جب کہ وہ بیک لفظ دی جائیں تین ہی مانا گیا، تین کا فیصلہ فرمایا، اور رجوع کے حق کو ختم کر دیا، اور آپ نے انتہائی غصہ کا اظہار کیا؛ اگر تین ایک ہی شمار ہوتی تھی، تو پھر غصہ ہونے اور رجوع سے محروم ہو جانے کی بات کیوں کی

جاتی، سیدھی بات تھی فرما دیتے کہ پچھتاؤ مت، تین سے تو ایک ہی پڑتی ہے، رجوع کر لو۔ جب کہ صحیحین میں حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ ایک شخص نے تین طلاقیں دیں، تو آپ نے ان کو تین ہی قرار دیا، اور زوجِ اول سے پھر نکاح کے لیے حلالہ کو شرط قرار دیا۔

اسی طرح مشہور صحابی عویمر عجلانیؓ کے لعان کے بعد تین طلاقوں کے دینے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ان کو نافذ کر دینے کا تذکرہ ہے۔ نسائی میں محمود بن لبید سے روایت ہے کہ آپ کو ایک شخص کے بارے میں اطلاع دی گئی کہ اس نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں بیک وقت دے دی ہیں، آپ غصہ میں کھڑے ہو گئے اور فرمایا کہ میری موجودگی میں تم لوگ کتاب اللہ سے کھلواڑ کرتے ہو، آپ کے غصہ کو دیکھ کر ایک شخص نے کہا کہ میں اس کو قتل نہ کر دوں۔ دار قطنی میں ہے کہ ابن عویمرؓ نے حالت حیض میں اپنی بیوی کو ایک طلاق دی تھی، آپ نے ان کو رجوع کر لینے کو فرمایا۔ ابن عویمرؓ نے پوچھا کہ اگر میں تین دی ہوتی، تو کیا رجوع کا حق تھا؟ آپ نے فرمایا: نہیں۔ ان احادیث کے علاوہ فقہاءِ صحابہ میں ابن عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت عثمان غنیؓ، حضرت عمرؓ، عبداللہ بن عباسؓ، ابن مسعودؓ، حضرت عائشہؓ وغیرہ تمام کے فتاوے تین کو تین ہی قرار دینے کے موجود ہیں۔

بہر حال ان صریح روایات اور فقہاء، صحابہ اور ائمہ اور تمام محدثین عظام کے فیصلہ کے مطابق یہ بات طے ہوتی ہے کہ بیک وقت کی تین طلاقیں تین ہی مانی جائیں گی، اور حضرت عمرؓ کے اپنے دور کے اس فیصلہ والی روایت کو جبکہ اس میں سند اور متن کے لحاظ سے اتنا اضطراب ہے کہ رد کر دیا جائے گا، یا پھر اس روایت کو وہ توجیہ کی جائے گی جو محدثین کرام نے کی ہے کہ اس روایت کا تعلق غیر مدخول بہا سے ہے جبکہ اس نے الگ الگ تین لفظوں میں طلاق دی ہو۔ ابن عباسؓ کی ایک روایت بھی اس پر دال ہے جو ان کے ایک شاگرد طاؤس ہی سے مروی ہے۔ شارح مسلم امام نوویؒ نے ایک یہ جواب بھی دیا ہے کہ دورِ نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) میں اور دور صدیقی و عمر رضی اللہ عنہما کے ابتدائی دور تک، لوگ ایک طلاق دینے کے لیے تین مرتبہ أنت طالق بطور تاکید کے کہتے تھے۔ زمانہ صدق وصلاح کا تھا۔ اس لیے ان کی نیت پر ایک فیصلہ کر دیا جاتا تھا۔ دور عمر میں جب دیکھا کہ جب لوگوں کی بات کا اعتبار نہیں، لہٰذا ان کی نیت کے اعتبار کو چھوڑ کر الفاظ پر تین ہی کا فیصلہ برقرار رکھا گیا، شارح مسلم نے اس قول کو اصح کہا ہے۔

خطابیؒ نے ایک اور طرح توجیہ کی ہے، جس کی ابن حجرؒ نے بھی تائید کی ہے، وہ یہ کہ اس دور میں ''البتۃ'' سے تین ہی طلاق مراد لی جاتی تھیں، دیکھو رکانہ والی حدیث میں اسی وجہ سے ایک طریق میں راوی نے ''البتۃ'' کو ''ثلاثـــہ'' کے لفظ ہی سے تعبیر کیا ہے مگر زمانہ خیر وصلاح کا تھا اس لیے مبتلا بہ کی نیت کا اس لفظ میں گنجائش ہونے کی وجہ سے اعتبار کرلیا جاتا تھا، مگر دورِ عمر میں جب وہ حال لوگوں میں نہ رہا، تو پھر نیت کا اعتبار چھوڑ دیا گیا، اور ''البتۃ'' سے تین ہی مراد لینے کا فیصلہ باجماعِ صحابہ کردیا گیا۔

حضرت عمرؓ کے فیصلہ کے الفاظ کے لوگوں نے غلط معنی لیے ہیں جس کی بنیاد پر اس کو ایکزیکوٹیو (Executive) یا سیاسی انتظامی فیصلہ قرار دے دیا ہے۔ حضرت عمرؓ کے قول کا مطلب یہ کہ پہلے ادوار میں لوگ تین طلاق ایک کے بعد ایک، مختلف طہروں میں دینے کے طریق پر عمل کرتے تھے، مگر جب وہ اس کے خلاف، جلد بازی کر کے اکٹھی تین طلاق بیک لفظ یا بسہ لفظ دینے لگے، تو ہم اس کو نافذ سمجھیں گے، جب انہوں نے خود ہی اپنا نقصان کرلیا تو ہم بھی تین ہی سمجھیں گے۔ جیسے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بھی اس طرح کی تین طلاق، تین ہی سمجھیں جاتی تھیں، تو حضرت عمرؓ نے تو سابقہ حکم ہی کی وضاحت کی تھی، یا یہ کہ لوگ سمجھتے تھے کہ شرعی تدریجی طریقہ پر تین طہروں میں طلاق دیں گے، تو تین کے بعد اگر نکاح کی نوبت آئی تو حلالہ کی ذلت اٹھانی پڑیگی، تو کیوں نہ تین طلاق اکٹھی ہی ڈال دیں۔ اور جا کر کہہ دیں گے کہ ہم نے تو ایک دی تھی، تو ایک ہی پڑے گی، رجوع کا بھی حق مل جائے گا اور حلالہ کی ذلت سے بھی بچ جائیں گے؛ نیز کبھی اس لیے بھی ایسا کرتے تھے کہ جس نئی عورت سے نکاح کرنا چاہتے تھے تو اس کو خوش کرنے کے لیے کہہ دیتے تھے کہ میں تیری خوشی کے لیے پہلی کو تین طلاقیں دیتا ہوں تاکہ وہ مطمئن ہو جائے۔ حضرت عمرؓ نے لوگوں کی صریح الفاظ میں ۳ رطلاق اکٹھی دینے پر قسم لے کر ایک قرار دینا بند کردیا اور دائمی علیحدگی جو اس شکل میں تھی جاری رہی، اور اس شکل کے بعد اگر دوبارہ نکاح کرنا چاہے تو حلالہ کی سزا باقی رکھی، تو کوئی نیا حکم نہیں دیا۔ اگر یہ توجیہ کی جائے تو حضرت عمرؓ جیسے جلیل القدر صحابی کا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول سے انحراف لازم آئے گا، نیز جو صحابی دین کے معاملہ میں انتہائی غیور تھے، ان کا ایک غلط فیصلہ پر خاموش رہنا لازم آئے گا، جو مداہنت ہے، اور صحابہ ''مداہنت فی الدین'' سے بری تھے۔

حامد: موجودہ دور میں اسلامی قوانین سے جہالت عام ہے، لوگ نہ طلاق کے طریقہ سے واقف ہیں اور نہ اس کے عواقب سے، وہ یہ سمجھتے ہیں کہ طلاق اگر دینا ہے تو وہ تب تک نہیں پڑتی جب تک تین مرتبہ نہ دی جائے جیسا کہ نکاح میں بھی وہ لوگ تین مرتبہ قبول کراتے ہیں، وہ سمجھتے ہیں کہ جب تک کوئی بات تین بار نہ کہی جائے پختہ نہیں ہوتی؛ گویا وہ ایک طلاق دینا چاہتے ہیں مگر تاکید کے لیے تین بار یہ الفاظ بولتے ہیں، تین طلاق دینے کا ارادہ نہیں ہوتا بلکہ ایک ہی طلاق کی تاکید در تاکید کرنا ہوتا ہے، جیسا کہ نکاح میں تین مرتبہ ''قبول کیا، قبول کیا، قبول کیا'' بولنے سے تین نکاح نہیں ہوتے بلکہ ایک ہی کو مؤکد کرنے کو یہ لفظ بولے جاتے ہیں، اسی طرح ایک طلاق کو مؤکد کرنے کے لیے بیک لفظ یا بسہ لفظ ایک مجلس میں یہ لفظ بولا جاتا ہے، لہٰذا کوئی شخص اگر قسم کھا کر یہ صراحت کرے کہ میرا ارادہ تاکید کا تھا تو اس کی بات پر یقین کرنا ضروری ہونا چاہئے۔

حمید: کسی قانون سے جہالت کبھی عذر نہیں سمجھی گئی ہے، کیا آپ بلاٹکٹ ریل میں بیٹھ گئے ہیں اور پوچھنے پر کہہ دیں کہ مجھے علم نہ تھا کہ ٹکٹ کے بغیر نہیں بیٹھنا چاہئے۔ ایسا کریں گے تو ٹکٹ کے پیسے مع جرمانہ ادا کرنے پڑیں گے۔ جب نکاح کا قانون آپ نے معلوم کیا اور نکاح پڑھانے والے کو بلایا، وکیل بنایا، گواہ مقرر کئے، تو یہ سب قانون معلوم ہوئے، مگر یہ کیوں معلوم نہ کیا کہ نکاح اگر کسی مجبوری سے ختم کرنا پڑے تو اس کا شرعی طریقہ کیا ہے؟ ۱۴ رسو سال اسلام کو آئے ہوئے ہو گئے، تب سے یہ نکاح ہو رہے ہیں اور طلاق بھی دی جاتی ہے، اب تک اس کا علم مسلم معاشرہ کو نہ ہوا، تو ڈوب مرنا چاہئے، ایسا اگر ہے تو نکاح کی مجلس میں نکاح سے پہلے جیسے نکاح کا طریقہ بتلایا جاتا ہے کہ اس میں وکیل چاہئے، گواہ چاہئے، اس میں یہ بھی بتلا دیا جایا کرے کہ خدانخواستہ اگر علیحدگی کی سخت ضرورت پیش آئے تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ تین طہروں میں الگ الگ ایک طلاق دی جاتی ہے، تین مرتبہ ''قبول'' کیا کہنے سے تین نکاح نہیں ہوتے، صرف تاکید ہوتی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ ''قبول'' کہنے سے نکاح ہو گیا، اب چاہے کتنی مرتبہ ''قبول'' کیا، کہتے رہئے، ایک ہی عورت سے اس مجلس میں نکاح ہو رہا ہے جو ہو چکا، بار بار قبول کیا، کہنے کی ضرورت نہیں ہے، مگر طلاق میں، تین حق دیئے گئے، جب بھی ایک حق کے بعد دوسرے حق کو استعمال کرے گا، تو وہ استعمال ہو جائے گا، پھر تیسرے کو استعمال کرے گا تو تیسرا حق استعمال ہو جائے گا، اگر کسی بندوق میں تین

گولیاں ہو، تو جتنی مرتبہ چلائے گا اتنی ہی مرتبہ شکار کے بدن پر لگے گیں، لیکن اگر ایک بندوق میں ایک ہی گولی ہو تو لب لبی دبانے سے ایک گولی چل جائے گی، اب بار بار لب لبی دباتے رہو، اب گولی ہے ہی نہیں، چلے گی کہاں سے، ہاں! لب لبی کی آواز چٹ چٹ کرتی رہے گی اس کا کوئی فائدہ نہیں۔

حامد: مولانا صاحب! آپ نے یہاں گولی کی مثال دی، میں اس مناسبت سے آپ سے سوال کرتا ہوں کہ آپ لوگ ایک بات یہ کہتے ہیں کہ طلاق بندوق کی گولی کی طرح ہے، اگر بھولے سے کوئی گولی چلادے، یا نشہ کی حالت میں چلادے یا مذاق میں چلادے تو گولی اپنا کام کر جاتی ہے۔ اسی طرح طلاق چاہے بھولے سے دے، چاہے مذاق میں دے، چاہے نشہ میں دے، وہ گولی کی طرح اپنا کام کر جاتی ہے۔ میں عرض کرتا ہوں، طلاق گولی کی طرح نہیں ہے، دیکھو پاگل سے یا سوئے ہوئے سے گولی چل جائے تو گولی لگ جاتی ہے، مگر پاگل کی طلاق یا سوئے ہوئے کی طلاق نہیں پڑتی۔ اسی طرح غیر نشہ کی چیز سے نشہ آگیا اور اس حالت میں طلاق دے تو طلاق نہیں پڑتی جبکہ ایسے شخص کی گولی لگ جاتی ہے۔ یا شراب پی اس سے نشہ ہوا، نشہ سے سر میں شدید درد شروع ہوا اور درد کی شدت کی وجہ سے ہوش نہ رہا اور طلاق دی تو طلاق نہیں پڑتی حالاں کہ گولی لگ جاتی ہے، اگر اکراہاً گولی چلوائی تو گولی لگ جاتی ہے مگر اکراہاً طلاق تین اماموں کے یہاں نہیں پڑتی، اور اکراہاً لکھوائی تو حنفیہ کے یہاں بھی نہیں پڑتی۔

حمید: گولی چلنے سے مرنے کے لیے بھی شرطیں ہیں کہ گولی سیسے کی ہو۔ بندوق میں رکھ کر چلائی گئی ہو، چلانے والے کے نشانہ نے خطا نہ کی ہو۔ جس کے ماری جارہی ہے وہ زیادہ فاصلہ پر نہ ہو، وہ گولی پروف صدری نہ پہنے ہوئے ہو، گولی بدن کے اس حصہ پر لگی ہو جس سے آدمی مرجاتا ہے، وغیرہ وغیرہ۔ اسی طرح طلاق گولی کی طرح اثر کرتی ہے مگر اس کی بھی شرطیں ہیں، کہ طلاق صریح ہو، دینے والا پاگل یا نیند میں نہ ہو، بالجبر لکھ کر نہ دے رہا ہو۔ جس کو دی جارہی ہے وہ اس کے لیے اجنبیہ نہ ہو بلکہ اس کے نکاح میں ہو؛ ایک طلاق سے بائنہ نہ ہو چکی ہو، وغیرہ وغیرہ۔

لہٰذا ان شرطوں کے ساتھ تشبیہ سمجھی جانی چاہئے، نیز اس کی نیت طلاق کی بھی ہو، اگر وہ کہے کہ طلاق کی نیت نہیں تھی، تو قضاءً تو پڑجائے گی مگر دیانۃً نہ پڑے گی۔

حامد: آج کے دور کی ایک دشواری یہ ہے کہ لوگ اتنے آوارہ اور بددین ہوگئے ہیں کہ

جوا، شراب، سٹہ، نہ کمانا، غلط جگہ پیسے برباد کرنا، آج کے نوجوان کی عام روش بن گئی ہے، پھر جب انسان اپنے اعمال بد کے بعد گھر آتا ہے تو اس کے غصہ کا تختۂ مشق اس کی بیوی ہی ہوتی ہے۔ جہاں ذرا سی خلاف طبیعت بات عورت سے سنی، یا اس نے گھر کے بچوں کی ضرورت کو ذکر کیا، یا بری عادت میں پیسہ ضائع کرنے پر قدغن لگانے کی بات کی، تو فوراً بلا سوچے سمجھے تین طلاق کا رکارڈ بجا دیا جاتا ہے، جس کو سن کر فضا میں ایک کہرام مچ جاتا ہے، عورت بے گھر، بچے برباد، خاندان میں جنگ، محلّہ میں شور، قبیلہ میں تناؤ پیدا ہو جاتا ہے؛ کئی بچوں کی ماں غربت کی ماری بیماریوں سے نڈھال یہ کہاں جائے، اس کو اس عمر میں اب کون قبول کرے؟ کنواریوں کو جب شوہر ملنا مشکل ہورہا ہے، تو اس سیکنڈ ہینڈ کھٹارے کو کون لے جائے گا؟ ماں باپ کا گھر خود افلاس کا شکار بلکہ بسا اوقات ایسی کئی بہنوں کے بوجھ تلے پہلے سے دبا ہوا، اس میں اور ایک نئے فرد کا اضافہ مع بچوں کے، مفتیوں کے پاس جاؤ تو وہ کہتے ہیں کہ رسی بالکل ٹوٹ چکی ہے، جڑنا مشکل ہے، آخر کیوں؟ نہ اس نقطۂ نظر سے فائدہ اٹھالیا جائے جس میں یہ کہا گیا ہے کہ جو شخص طلاق قرآن وحدیث میں مذکور طریقہ کے مطابق یعنی بتدریج نہیں دے گا، تو اس کی طلاق ہی نہیں پڑے گی، یا صرف ایک پڑے گی، چاہے سو دفعہ طلاق کا لفظ بول چکا ہو۔

حمید: آپ لوگوں کی اصلاح کے بجائے شریعت کی اصلاح کرنا چاہتے ہیں، اگر لوگ بگڑ گئے ہیں، شرابی کبابی ہوگئے ہیں، تو ان کو ٹھیک کرنے کی کوشش کی جائے گی یا یہ کہ خود شرعی قانون کو بدلنے کی؟ آج آپ ان مجبوریوں اور عورت ذات کی موجودہ حالات کا نقشہ کھینچ کر یہ منوانا چاہتے ہیں کہ تین کو ایک مان لیا جائے، کل آپ یہ کہیں گے کہ بہتر یہ ہے کہ آج کے حالات اور عورت کے تحفظ کے خاطر اگر طلاق کے اثر ہی کو اور حق ہی کو ختم کردیا جائے تو بہتر ہے، چاہے وہ کسی طرح دی گئی ہو، عورت کسی حال میں الگ نہ کی جائے، تو یہ قرآن کے خلاف عیسائی اور ہندو قانون کی پیروی ہوگی؛ جو بے چارے خود آج اسلام کے طلاق کے حق کے قانون ہی کو سب سے بہتر مان رہے ہیں، اور اپنے پرسنل لاء میں ترمیم کرا کر طلاق کے حق کو مان چکے ہیں۔ اس طرح اسلامی قانون کی برتری ان کو تسلیم کرلینی پڑی، کیا آپ اس امتیاز کو ختم کرنا چاہتے ہیں؟

حامد: طلاق مغلظہ کی وجہ سے عورت اور بچے برباد ہوتے ہیں، اس لیے تین کو ایک مان

کر رجوع کا حق دے دیا جائے، دیکھو قرآن نے عورت کی بربادی کے پیشِ نظر ظہار کی صورت میں طلاق کے بجائے کفارہ کے ذریعہ عورت کو علیحدگی سے بچایا ہے۔

حمید: آپ کا فرمانا کہ ظہار میں کفارہ کی رعایت دے کر طلاق پڑنے کے سابقہ زمانہ کے فیصلے کو ختم کر دیا گیا، یہ اس لیے ہے کہ اس پر نصِ قرآنی آچکی ہے، جب تک آیت نہیں آئی تھی آپ علیحدگی ہی کا فیصلہ فرماتے رہے۔ قرآنی وشرعی احکامات میں انسانوں کا اپنا فیصلہ معتبر نہیں، ورنہ شریعت خدائی قانون نہ رہے گی۔

آپ نے تصویر کا ایک رُخ سامنے رکھا ہے کہ تین طلاقوں کے وقوع سے عورت اور بچے برباد ہو جاتے ہیں۔ مگر دوسرا رُخ یہ بھی ہے کہ اگر تین طلاقوں کے بعد بھی رجوع کا حق رہے جیسا کہ دو طلاقوں تک یہ حق رہتا ہے، تو پھر عورت کبھی شوہر سے چھٹکارہ حاصل نہ کر سکے گی۔ بعض دفعہ عورت خود مرد سے اتنی بے زار اور اس کے برتاؤ سے اتنی تنگ آچکی ہوتی ہے کہ وہ خود سے چاہتی ہے کہ یہ شخص کسی طرح مجھے بالکلیہ چھوڑ دے۔ تاکہ روزانہ کی اس تنگ زندگی سے نجات مل جائے۔ کیا تین طلاق کے ذریعہ جو اس کو چھٹکارا، قدرت نے دیا ہے، آپ اس سے بھی اس کو محروم کر کے ہمیشہ کے لیے پھر اسی تنگی کا شکار بنا رہنے دینا چاہتے ہیں؟ اگر یہ مصلحت نہ ہوتی تو اللہ تعالیٰ یہ قانون کیوں دیتے؟ کیا انسان اپنی مصلحتوں کو نعوذ باللہ خدا سے بھی زیادہ جانتا ہے، جب کہ خدا تعالیٰ اس کا خالق اور اس کے جملہ مصالح کا خیال رکھنے والا ہے۔

حامد: مولانا صاحب! آپ سے اس مسئلہ میں مدلل اور مفصل، نیز دلچسپ و دوستانہ ماحول میں گفتگو کر کے، مجھے بے پناہ خوشی ہوئی ہے، مجھے اپنی ناسمجھی کا احساس ہوا ہے، مجھے اپنے دلائل کے مقابلہ میں آپ کے دلائل معقول اور ٹھوس معلوم ہوئے، آپ مجھے معاف فرمائیں کہ میں نے آپ کا بہت وقت لیا۔

حمید: آپ کا شکریہ کہ آپ نے میری باتوں کو توجہ سے سنا اور قبول کرنے میں کسی ضد کا مظاہرہ نہیں کیا، اللہ تعالیٰ ہم سب کو نیک توفیق عطا فرمائے۔ آمین! السلام علیکم

حامد: وعلیکم السلام۔

(۳۶) طاعون اور اسلام

سعید: رشید صاحب! السلام علیکم۔

رشید: وعلیکم السلام۔

سعید: رشید صاب! یہ آپ بھاگے بھاگے کہاں جارہے ہیں۔

رشید: آپ کو معلوم نہیں! سورت شہر میں پلیگ پھیل گیا ہے، رات دن مرغیوں کی طرح لوگ مررہے ہیں، میں فوراً اس شہر سے بھاگ جانا چاہتا ہوں ورنہ خطرہ ہے کہیں میرا پورا کا پورا خاندان ختم نہ ہو جائے۔ یہ بیماری جس جگہ بھی پھیلتی ہے، لاکھوں لوگ لقمۂ اجل بن جاتے ہیں، یہ وبائی اور متعدی بیماری ہے، ایک سے دوسرے کو فوراً لگ جاتی ہے، اس کے جراثیم بڑی تیزی سے پھیلتے ہیں۔

سعید: آپ نے دو باتیں کہیں: ایک تو یہ کہ آپ طاعون و پلیگ کو متعدی مرض مانتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ آپ اس بیماری کے خوف سے سورت شہر سے ہجرت کے لیے تیار ہیں۔ حالاں کہ ان دونوں باتوں سے اسلام نے مسلمانوں کو منع کیا ہے۔

رشید: کیا آپ یہ نہیں مانتے کہ بعض امراض کا متعدی ہونا اُن کا طبعی لازمہ ہے یعنی وہ لازمی طور پر دوسروں کو لگ جاتے ہیں۔ وہ تعدیہ کی علت ہیں اور علت سے معلول کا تخلف نہیں ہوتا۔

سعید: جی نہیں! حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی نفی فرمائی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''لا عدویٰ''، یعنی مرض علت تعدیہ نہیں یعنی دوسروں کو لازمی طور پر لگ جائے ایسا نہیں ہے۔

چناں چہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو جس نے اپنے اونٹوں میں ایک خارش زدہ اونٹ سے خارش پھیل جانے کا اظہار کیا، تو فرمایا کہ اس پہلے اونٹ میں خارش کس اونٹ سے پیدا ہوئی، جس طرح پہلے اونٹ کو خود سے یہ مرض لاحق ہوا، ایسے دوسرے اونٹوں کو بھی لاحق ہوا ہوگا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس جگہ پلیگ پھیلا ہو، وہاں سے بھاگنے کو منع فرمایا۔
آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک جذامی کو ایک ہی پیالہ میں اپنے ساتھ کھلایا۔
ان احادیث سے معلوم ہوا کہ امراض میں تعدیہ نہیں ہے، ایک کا مرض دوسرے کو نہیں لگتا، مرض تعدیہ کی علت نہیں ہے، اور یہ بات جس طرح نص حدیث سے ثابت ہے۔
اسی طرح مشاہدہ بھی اس کا ثبوت دیتا ہے، ورنہ تو پلیگ میں سارے ہی انسانوں کا صفایا ہو جایا کرتا بلکہ ڈاکٹر اور تیماردار تو سب ہی مرجایا کرتے، اس لیے کہ وہ مریض سے زیادہ قریب رہتے ہیں۔ حالاں کہ مشاہدہ ہے کہ ایسا نہیں ہوتا۔

رشید: جناب سعید صاحب! آپ نے احادیث کے صرف ایک رُخ کو دیکھا، دوسرا رُخ یہ بھی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''فِرَّ مِنَ الْمَجْذُوْمِ كَمَا تَفِرُّ مِنَ الْأَسَدِ'' جذامی یعنی کوڑھی سے ایسے بھاگو جیسے شیر سے بھاگتے ہو۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: صحت منداونٹ کو خارشی اونٹ کے ساتھ مت باندھو۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس جگہ طاعون پھیلا ہو، وہاں مت جاؤ۔ ان ارشادات سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض امراض متعدی ہوتے ہیں، وہ علت تعدیہ ہیں دوسرے کو لازمی طور پر لگ جاتے ہیں، لہٰذا ایسے مریض سے دور رہنا چاہیے۔
حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ان ارشادات کو آج کی سائنس نے بھی تسلیم کیا ہے، چناں چہ آج خوردبینوں کے ذریعہ امراض کے ان جراثیم کا پتہ لگایا گیا ہے جو مرض کا تعدیہ کرتے ہیں۔ اور یہ بات آج اتنی محقق ہو کر سامنے آچکی ہے کہ اسلام کی جانب سے اس کا انکار کرنا اسلام کی تضحیک کرانا ہے۔

سعید: رشید صاحب! آپ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس حکیمانہ ارشاد کے سمجھنے میں چوک ہو رہی ہے، فِرَّ مِنَ الْمَجذومِ كَمَا تفر مِنَ الأَسَدِ۔ یا اسی طرح خارشی اونٹ سے دوسرے اونٹ کو دور رکھنے یا طاعون رسیدہ شہر میں داخل ہونے سے منع کرنے کا حاصل یہ ہے کہ اگر چہ امراض علت تعدیہ تو نہیں ہیں مگر سبب تعدیہ یعنی سبب غیر لازم التاثیر، سبب غیر عادی مطلق، سبب بارادۂ خداوندی بن سکتے ہیں؛ اور سبب وعلت میں فرق ہے۔ علت بالکلیہ مفضی الی المعلول ہوتی ہے تخلف نہیں ہوسکتا، جبکہ سبب مفضی الی المسبب ہوتا ہے؛ جب بعض امراض کی یہ شان ہے جیسے جذام، پلیگ کہ وہ سبب

تعدیہ فی الجملہ بارادۂ خداوندی بن سکتے ہیں تو ان امراض سے محتاط رہنا چاہیے، کیونکہ یہ مرض مؤثر ''فی وقت دون وقت بمشیتِ الٰہی'' ہوسکتے ہیں، جیسے اطباء ادویہ کو مؤثر فی الجملہ مانتے ہیں اور شریعت بھی اس کا انکار نہیں کرتی۔
لہٰذا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پہلے ارشاد ''لاعدوی'' میں علت ہونے کی نفی تھی، اور دوسرے ارشاد ''فِرَّ مِنَ الْمَجْذُوْمِ'' میں، سبب غیر لازم التاثیر ہونے کا اثبات ہے، اس طرح دونوں ارشادوں میں کوئی تضاد نہیں ہے یا یوں کہو کہ جو تفویضی مزاج رکھتے ہیں ان کے لیے ''لاعدوی'' حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا، قولی نمونہ ہے، اور جذامی کو ایک ہی پیالہ میں اپنے ساتھ کھلانا، فعلی نمونہ ہے۔
اور جو لوگ اسباب کو فی الجملہ دخیل ماننے کا ذہن رکھتے ہیں ان کے لیے ''فِرَّ مِنَ الْمَجْذُوْمِ''، قولی نمونہ ہے؛ اور ایک جذامی کو اپنے پاس ملاقات کے لیے سفر کر کے آنے سے منع فرمایا یہ عملی نمونہ ہے۔
یا دوسرے الفاظ میں یوں کہہ لو، جو تفویض میں غلو کا شکار تھے ان کو ''فِرَّ مِنَ الْمَجْذُوْمِ'' کہہ کر اسباب کو تسلیم کرنے کی طرف متوجہ فرمایا، اور جو اسباب میں غلو کے مرتکب تھے، ان کو ''لاعدوی'' کہہ کر تفویض کی برتری بتلائی۔
رشید صاحب! جب یہ سمجھ گئے تو آپ یہ بھی سمجھ سکتے ہیں کہ طاعون رسیدہ شہر میں داخل ہونے سے پہلے کیوں منع فرمایا اور اس شہر سے بھاگنے اور فرار کو کیوں ممنوع قرار دیا۔
داخل ہونے سے اس لیے منع فرمایا کہ جب مرض فی الجملہ سبب بن سکتا ہے، تو اگر داخلے کے بعد مرض لاحق ہو گیا تو یہ کہیں اس کو علت اور لزوم طبعی مؤثر حقیقی نہ سمجھ بیٹھے جو فساد عقیدہ کی دلیل ہے، اس لیے کہ مؤثر حقیقی اور علت تو صرف ارادۂ خداوندی اور اس کی ذات ہی ہے، اور شہر سے بھاگنے سے اس لیے روکا گیا کہ یہ بھاگنا مرض کو مؤثر حقیقی اور علتِ تعدیہ ماننے کی ترجمانی کرتا ہے۔

رشید: سعید بھائی! آپ کے کہنے کے مطابق جب مرض سبب تعدیہ فی الجملہ بارادۂ خداوندی بن سکتا ہے، تو کیوں کہ اس میں احتمال ضرر موجود ہے، چاہے یقینِ ضرر نہ ہو، تب بھی احتمالِ ضرر پر شہر چھوڑنے کی اجازت ہونی چاہیے؛ جیسے گرتی دیوار اور لگتی آگ سے احتمالِ ضرر پر بھاگا جاتا ہے۔ حالاں کہ دیوار کا اس شخص پر گرنا اور آگ کا اسی شخص

تک پہونچ جانا یقینی اور ضروری نہیں۔

سعید: رشید صاحب! اس کا جواب یہ ہے کہ عقل ونقل نے ایک قاعدہ یہ بنا رکھا ہے کہ اگر کسی موقع پر ایک شخص کے احتمال ضرر سے بچنے میں دوسرے کا یقینی ضرر ہو، تو وہاں اس کو احتمال سے بچنے کی اجازت نہیں دی جائے گی، مثلاً کسی کے گھر میں آگ لگ جائے اور اس کا پڑوسی اس ڈر سے آگ بجھانے نہ آئے کہ کہیں میں جل نہ جاؤں، تو اس کو تماشا دیکھنے کی اجازت نہ ہوگی، بلکہ خطرۂ موہوم کی پرواہ کئے بغیر آگ بجھانے آنا پڑے گا۔ یا مثلاً تعددِ ازواج کی اجازت دینے میں پہلی بیوی کو طبعی گرانی ہوتی ہے، مگر ایک عمومی نفع کے خاطر جو تعددِ ازواج کی اجازت میں ملحوظ ہے، اس خاص انفرادی گرانی کو برداشت کرلیا گیا ہے؛ ایسے ہی طاعون زدہ شہروں سے بھاگنے میں پڑوسی کے حق، مثلاً اس کی موانست، دوادارو، دیکھ بھال، انتقال کی شکل میں کفن دفن، صلوٰۃ جنازہ وغیرہ کا ضائع ہو جانا یقینی ہے، لہٰذا اس یقینی ضرر کی خاطر اس موہوم خطرہ کا اعتبار نہیں کیا جائے گا جو مرض تعدیہ کی شکل میں تصور کیا جاتا ہے؛ چناں چہ محدث عبدالحق دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے شرح مشکوٰۃ میں: "اَلْفَارُّ مِنَ الطَّاعُوْنِ كَالْفَارِّ مِنَ الزَّحْفِ" کے تحت، طاعون سے بھاگنے کو جنگ سے بھاگنے کی طرح کبیرہ گناہ قرار دیا ہے، اور بھاگنے کو جائز سمجھنے والے کو جب کہ وہ ممانعت کی احادیث کو رد کرتا ہو اور مرض کو مؤثرِ حقیقی مانتا ہو، کافر قرار دیا ہے؛ البتہ احادیث کی تاویل کرنے والے کو جب کہ تاویل قوائد شرعیہ کے مطابق ہو، معذور کہا ہے۔

رشید: طاعون کو اسباب شہادت میں شمار کیا گیا ہے، لہٰذا طاعون سے موت شہادت ہوگی تو کیا اس کی اجازت ہوگی کہ کوئی شخص یہ دعا کرے کہ "اے اللہ! مجھے طاعون کے ذریعہ موت دے کر شہادت عطا کر"۔

سعید: رشید صاحب! نفس شہادت کی دعا کرنے کی تو اجازت ہے، لیکن طاعون کے ذریعہ شہادت عطا کر ایسی دعا کی تو اجازت نہیں ہے، بلکہ طاعون کی وباء کے موقع پر دعائے صحت اور علاج وغیرہ میں مصروف رہنے کی اجازت ہے؛ وجہ یہ ہے کہ اگر چہ امراض وبلیاتِ مریض کے حق میں اُخروی لحاظ سے موجبِ رحمت، کفارۂ سیئات، یا شہادت تک کے درجات سے سرفراز ہونے کا ذریعہ ہیں، تب بھی دنیا میں چوں کہ یہ

مصیبت اور تکلیف کا باعث ہیں، اس لیے دعائے صحت، تعویذ اور دوادارو جاری رکھنے کی ترغیب دی گئی ہے۔

رشید: سعید صاحب! کیا طاعون کے موقع پر شہر سے باہر میدان، باغات یا پہاڑ یا کسی اسکول کی عمارت میں جا کر رہنے لگنا بھی شہر چھوڑ کر چلے جانے کے گناہ میں شمار ہوگا؟

سعید: شہر سے ملحق یہ مقامات سب فناء شہر، شہر ہی کی حکم میں ہیں، لہٰذا ان مقامات پر چلے جانے سے شہر چھوڑنے کا گناہ نہیں ہوگا۔

رشید: کیا کسی عارض قوی مثلاً پورے شہر میں اتنی بد بو پھیلی ہوئی ہے جو نا قابل برداشت ہو، یا ضروریات زندگی کا فقدان ہوگیا ہو علاج کی ادنی سہولت بھی باقی نہ رہی ہو، یا چوری ڈاکے کا شدید خطرہ ہوگیا ہو، پورے شہر کی تمام آبادی منتقل ہوگئی ہو، جس کی وجہ سے تنہا کسی فرد یا خاندان کا رہنا مشکل ہو تو کیا ایسی شکل میں شہر چھوڑ کر دوسرے شہر چلے جانے کی اجازت ہوگی؟

سعید: ان سب شکلوں میں شہر سے چلے جانے پر کوئی گناہ نہ ہوگا؛ یہ سب شکلیں ممنوع خروج سے مستثنیٰ ہیں۔

رشید: سعید صاحب! اگر کوئی کسی شہر میں چند دن کے لیے گیا اور وہاں طاعون پھیل جائے اور اس مسافر کو اپنے پروگرام کے مطابق لوٹنا ہے، یا یہ کہ ایک شخص طاعون زدہ شہر کا ہی شہری ہے، مگر طاعون کے زمانہ میں دوسرے شہر میں اس کے والدین یا کوئی عزیز سخت بیمار ہوگیا یا انتقال کر گیا یا کوئی شخص سرکاری ملازم ہے اور طاعون ہی کے زمانہ میں حکومت نے اس کو کسی دوسرے شہر میں جانے کو کہا، تو کیا ان تمام صورتوں میں طاعون زدہ شہر چھوڑ دینے کی اجازت ہوگی، فرار کا گناہ نہ ہوگا۔

سعید: شہر چھوڑ دینا جائز ہے، فرار کا گناہ نہ ہوگا، اس لیے کہ ممانعت کا حکم مخصوص بھی ہے اور معلول بھی، اس طرح کہ ممانعت کی علت پڑوسی کے حق فوت ہونا اور فسادِ اعتقاد ہے۔

رشید: طاعون رسیدہ شہر میں داخل ہونے سے بھی روکا گیا ہے، تو کیا دوسرے شہر کے مسلم ڈاکٹروں، نرسوں اور حکومت کے ملازمین کو بھی جن کی ڈیوٹی متاثر شہر میں لگائی گئی ہو، داخلہ کی اجازت نہ ہوگی؛ اسی طرح دوسرے شہر کا آدمی متاثرہ شہر میں موجود ماں باپ

رشتہ داروں کی خبر لینے یا ان کے کفن دفن کے لیے بھی نہیں جا سکتا۔

سعید: جا سکتا ہے، داخلہ کی ممانعت بھی مخصوص ہے، غیر ضرورت مندوں کے ساتھ؛ نیز معلول بھی ہے کہ فسادِ عقیدے کا خطرہ ہے جو اندر جا کر مرض لاحق ہونے کی شکل میں مرض کو مؤثر حقیقی ماننے کی شکل میں پیدا ہو سکتا ہے۔

رشید: مسندِ احمد کی روایت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ دعا منقول ہے: اے اللہ! اپنے راستہ میں میری امت کا طاعون میں خاتمہ فرما، اور ابن ماجہ کی روایت میں طاعون سے پناہ مانگنے کا تذکرہ ہے؛ دونوں روایات میں تطبیق کی کیا شکل ہوگی؟

سعید: طاعون جب معصیت کی سزا میں بطورِ عذاب آئے تو اس سے پناہ مانگی ہے، جو درحقیقت معصیت سے پناہ ہے اور اگر بلا معصیت نازل ہو، تو وہ چوں کہ مؤمنین صابرین کے لیے رحمت اور شہادت ہے اس لیے یہ شہادت کی دعا ہے۔

رشید: لاتخرجوا سے ممانعت قرار معلوم ہوتی ہے، اور "فِرَّ مِنَ الْمَجْذُوْمِ" سے اجازت فرار۔ تو ترجیح فرار کو ہے، یا قرار کو؟

سعید: "لَاتَخْرُجُوْا" نص ہے، جو ممانعتِ فار پر دال ہے اور اجازت فرار کو "فِرَّ مِنَ الْمَجْذُوْمِ" پر قیاس کیا گیا ہے۔ اور نص قیاس پر مقدم ہوتی ہے، لہٰذا قرار کو فرار پر ترجیح ہوگی۔

رشید: جب طاعون عمواس پھیلا تو وہاں اسلامی لشکر کے سپہ سالار۔ ابوعبیدہؓ اپنے لشکر کے ساتھ دمشق میں موجود تھے، حضرت عمرؓ نے ان کو لکھا کہ آپ لشکر کو لے کر مدینہ آجائیں مگر وہ نہیں آئے اس لیے کہ ان کے نزدیک طاعون کے مقام سے خروج ممنوع تھا۔
حضرت عمرؓ نے ان کو لکھا کہ آپ جابیہ مقام پر جو بلندی پر واقع ہے وہاں چلے جائیں، مگر وہ نہیں گئے، ان کی وفات کے بعد عمرو ابن العاصؓ سپہ سالار مقرر ہوئے تو انہوں نے حضرت عمرؓ کے حکم کی تعمیل کی اور دمشق چھوڑ کر جابیہ چلے گئے، سوال یہ ہے کہ جب خروج ممنوع ہے تو حضرت عمرؓ نے ابوعبیدہؓ کو کیوں بلایا، یا جابیہ چلے جانے کو کیوں کہا؟ نیز جب ابوعبیدہؓ نے حکم نہیں مانا تو عمرو ابن العاصؓ نے کیوں مانا؟

سعید: حضرت عمرؓ کو لشکر کسی اور دوسری جگہ بھیجنے کی ضرورت ہوگی، نیز جابیہ مقام اس وقت دمشق شہر کی فناء میں داخل تھا، لہٰذا جابیہ چلے جانے سے شہر سے نکلنا نہیں پایا جاتا۔

ایک جواب یہ بھی دیا جاتا ہے کہ حضرت عمرؓ اس ممانعت کو معلل سمجھتے تھے اور علت فساد عقیدہ تھی جو ان حضرات میں مفقود تھی؛ شاہ عبدالعزیزؒ نے اپنی تفسیر "فتح العزیز" میں خروج کی ممانعت کی یہ علت لکھی ہے کہ صحت مندوں کے چلے جانے کی وجہ سے مریضوں کی دیکھ بھال میں دشواری پیدا ہوتی ہے اور جو نہ جا سکیں گے ان کی موانست کا ذریعہ ختم ہو جائے گا، اس طرح حق پڑوس کا ضائع ہونا لازم آئے گا، لیکن جب پورا کا پورا لشکر ایک جگہ سے منتقل ہو کر دوسری جگہ چلا جائے، تو بعض کو بعض کی دیکھ بھال اور موانست سے محرومی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، لہٰذا جب اس شکل میں علت مفقود ہوئی تو حکم بھی مفقود ہو جائے گا، انہیں وجوہات کی وجہ سے عمرو ابن العاصؓ نے خروج کیا، ابوعبیدہؓ اس ممانعت کو معلل نہیں سمجھتے تھے اس لیے انہوں نے تفویض پر عمل کیا۔

رشید: کیا صرف تعدیہ کا عقیدہ رکھنے والوں کو شہر چھوڑنا ممنوع ہے یا یہ حکم عام ہے؟ تعدیہ کا عقیدہ نہ رکھنے والوں کو بھی شامل ہے؟

سعید: یہ حکم ممانعت عام ہے، دونوں کو شامل ہے، اس لیے کہ یہ ممانعت معلل ہے اور علت حق پڑوس کا ضیاع ہے جو دونوں شکلوں میں ضائع ہوگا۔

رشید: طاعون رسیدہ جگہ چھوڑ کر جانا ممنوع ہے اور طاعون میں موت شہادت ہے، اب اگر کوئی ممانعت کے باوجود شہر چھوڑ کر بھاگ جائے اور دوسری جگہ جا کر طاعون ہی سے وفات پا جائے تو کیا اس کو شہادت کا ثواب ملے گا؟

سعید: جی ہاں! شہادت کا ثواب ملے گا البتہ بھاگنے کا گناہ کبیرہ گناہ ہے، وہ اس کے ذمہ ضرور رہے گا معصیت اور گناہ کے اقتران سے نفس شہادت پر جو طاعون کی موت پر موعود ہے کوئی اثر نہیں پڑے گا، جیسے معصیت کے ارادہ سے سفر کرنے والے کو بھی سفر کی سہولت اور رعایت جو قصر کی شکل میں دی گئی ہے برقرار رہتی ہے، البتہ سفر میں جو معصیت کرے گا، اس کا گناہ اس کے ذمہ الگ سے رہے گا۔

رشید: دخول اور خروج کی ممانعت میں انسانوں کی مصلحت کیا ہے؟

سعید: اگر باہر والے اندر گئے اور تقدیر الٰہی سے اس مرض میں مبتلا ہوئے تو وہ کہیں گے کہ اندر والوں نے ہمیں بیمار کر دیا اور اندر والے باہر آ کر کسی آبادی میں گئے اور وہاں کی آبادی میں تقدیر الٰہی سے طاعون پھیل گیا تو وہاں کے لوگ کہیں گے کہ یہ اندر سے آنے

والوں نے ہم میں طاعون پھیلایا ہے جیسا کہ سورت سے بھاگ کر جانے والوں سے لوگ بچھو کی طرح بچتے تھے، بہر حال خربوزہ چھری پر گرے، یا چھری خربوزے پر گرے موت خربوزے کی ہے، اسی طرح کوئی اندر جائے یا اندر والا باہر آئے دونوں صورتوں میں الزام اندر والے ہی پر آئے گا، اس لیے شریعت نے طاعون زدہ لوگوں کو الزام سے بچانے کے لیے دخول خروج دونوں ہی باتوں پر پابندی لگا دی۔

رشید: سعید بھائی! آپ نے تو بڑی مدلل اور معقول گفتگو کی، مجھے پوری طرح تسلی ہوگئی، اللہ تعالیٰ آپ کی عمر دراز کرے "وَ کثر اللّٰہ تَعَالیٰ اُمْثَالکم"۔

سعید: آپ کا شکریہ، آپ نے بڑے معقول سوالات کئے اور میرے جوابات کو غور اور سنجیدگی سے سنا اور معقول بات کو قبول کرنے میں کسی ضد کا مظاہرہ نہیں کیا، اللہ آپ کو ہمیشہ حق بات قبول کرنے کی توفیق بخشے۔ آمین! السلام علیکم

رشید: وعلیکم السلام۔

(۳۷) عورت اسلام کی نظر میں

سلیم: السلام علیکم۔

رفیق: وعلیکم السلام۔

سلیم: رفیق بھائی! وہ آپ نے آج کا اخبار دیکھا، بنگلہ دیش کی ایک عورت تسلیمہ نسرین نے کیا بکواس کی ہے، وہ کہتی ہے کہ قرآن پر نظر ثانی کرنی چاہئے۔

رفیق: اچھا! مسلم ملک اور وہاں کی پیدا شدہ لڑکی اور اس طرح کی کفریا بکواس، کیا وہ پڑھی لکھی عورت ہے؟ کیا اس کی کوئی کتاب شائع ہوئی ہے؟ جس میں اس نے یہ بکواس کی ہے۔

سلیم: رفیق بھائی وہ پڑھی لکھی سمجھی جاتی ہے، پیشے کے اعتبار سے ڈاکٹر ہے، اس نے کئی کتابیں اور ناول لکھے ہیں، وہ شاعر بھی ہے۔

رفیق: سلیم تو اس نے یہ بکواس، کس کتاب میں کی ہے۔

سلیم: اس نے اسلام مخالف باتیں تو اپنی ہر کتاب میں کی ہیں، مگر فی الحال اس کا ایک ناول "لجا" کے نام سے بنگالی زبان میں شائع ہوا ہے، اس میں اس نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ اسلام کی ہدایات اور قوانین عورت ورگ کے بارے میں انصاف نہیں کرتے بلکہ اس کے احکامات، احادیث اور قرآن کی آیات سے عورت کی تحقیر اور توہین سمجھ میں آتی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ مسلم علماء کا یہ کہنا غلط ہے کہ اسلام نے عورت کو عزت دی۔ اس کو حقوق دیئے، اس کو پستی اور ذلت سے نکال کر باعزت زندگی عطا کی۔ اس کا کہنا ہے کہ قرآن وحدیث اور فقہاء کے قوانین اس کی تصدیق نہیں کرتے۔ چنانچہ اس نے اپنی ذہنیت کے پیش نظر قرآن پر نظرِ ثانی کی بات بھی کر ڈالی ہے۔

رفیق: افسوس! ایک پڑھی لکھی عورت بھی اتنی غلط بات کہہ سکتی ہے، اس بات سے تو وہ کافر ہوجاتی ہے۔

سلیم: اُس پر کفر کا فتویٰ لگایا جا چکا ہے، نیز توہین اسلام اور توہینِ خداوندی کا اس پر

مقدمہ بھی دائر کیا جا چکا ہے۔

رفیق: دنیا کے لوگوں نے اس کے ان اسلام مخالف خیالات پر کیا تبصرہ کیا ہے۔

سلیم: یورپ اور اسلام مخالف ملکوں میں تو خوشی کی لہر دوڑ گئی، ایک ڈاکٹر مسلم عورت نے جب ان کے اپنے مطلب کی بات کہہ دی تو میڈیا نے اس سے اتنی دلچسپی لی کہ اس کو ہیرو بنا دیا۔ اس کی ہر بات چھاپی گئی، اس کے خلاف فتوے اور قتل کی دھمکیوں، اور اس پر دائر مقدمہ کی مذمت کی گئی، ان باتوں کو قلم اور خیالات وفرد کی آزادی کے خلاف کہا گیا، اس کے خلاف اٹھنے والوں کو دہشت گرد قرار دیا گیا اور عجیب بات یہ ہے کہ ان یورپی اور مغربی ملکوں کو اپنے ایجنٹ بنگلہ دیش میں بھی مل گئے، وہاں کے نام نہاد دانشوروں نے بھی تسلیمہ نسرین کی خوب حمایت کی، تجویزیں پاس کیں؛ یورپ کے ملکوں نے بنگلہ دیش میں اس کے عدم تحفظ کو دیکھ کر اپنے یہاں پناہ دینے اور ویزہ دے کر بلانے کے فون کئے اور بالآخر اس کو بعض ملکوں نے اپنا مہمان بنا لیا۔

رفیق: آخر لوگ، کہنا کیا چاہتے ہیں؟

سلیم: بعض تو صرف اسلام دشمنی کی رو میں بہہ رہے ہیں؛ مگر بعض کا کہنا ہے کہ جب کوئی لکھنے والا کوئی بات لکھے، تو مسلمانوں کو اس کا جواب دینا چاہئے، اس کی غلط فہمیاں دور کرنا چاہئے، جب معقول جواب سامنے آئیں گے، تو لوگ خود لکھنے والے کو رد کر دیں گے، ہر بات پر مار ڈالنے اور مقدمہ چلانے اور کافر گرداننے کی بات کیوں کی جاتی ہے۔

رفیق: جواب تو جب دیا جائے جبکہ کوئی بطور شبہ کے یا خلجان کے کوئی بات اہل علم سے پوچھے اور اس میں نیت درست ہو، بات جب معقول انداز میں سمجھا دی جائے، تو اس کو ماننے کا جذبہ ہو، پھر یہ کہ وہ یہ بکواس کسی کو خوش کرنے اور اپنے آپ کو مشہور کرنے کے لیے نہ کر رہا ہو، وہ سمجھنا چاہتا ہو، لیکن جب مقصد سمجھنا نہ ہو، اسلامی کتب اور احکامات کا مطالعہ ہی نہ کیا ہو، محض بیٹھے بٹھائے اپنے غلط سلط خیالات کی اشاعت شروع کر دی جائے اور اس میں اس درجہ پر اتر آئے کہ مسلمان کے خلاف ایسی باتیں ظاہر کی جائیں یا ایسے دعوے کئے جائیں جن پر کفر کا فتویٰ یا اس توہین وتحقیر پر سخت سزا حتی کہ قتل کی سزا بھی دی جاتی ہوگی تو وہ دی جائے گی، اس کا مطالبہ کیا جائے گا۔

سلیم: ان کا کہنا ہے کہ یہ تو آزادی کا دور ہے، جس کے دل میں جو آئے وہ لکھے یا کہے، کسی کو اس کے خلاف آواز اٹھانے کا کوئی حق نہیں۔

رفیق: یہ تو آزادی کا غلط مفہوم ہے کیا اس کے قائل اپنے یا اپنے ماں باپ یا اپنی حیثیت عرفی کے خلاف لکھنے یا بولنے والے پر ہتک عزت کا مقدمہ دائر نہیں کرتے ہیں اور حکومتوں نے بھی ہر شخص کی عزت کی ضمانت دی ہے اس کے ہتک عزت کے دعوے کو عدالت سنتی اور مجرم کے خلاف فیصلہ دیتی ہے تو ایک شخص خدا کے رسول کی اس کی کتاب کی توہین کرے تو اس کے خلاف کوئی مقدمہ نہیں کیا جا سکتا جبکہ ساری دنیا خدا کو مانتی ہے کروڑوں انسان رسالت کا عقیدہ رکھتے اور ان پر ایمان لاتے ہیں۔ خدا کی کتاب اور اس کے قوانین پر عمل کرنا اپنے ایمان کا تقاضا سمجھتے ہیں۔ بھلا اتنے انسانوں کے مقتداء یا مذہبی کتاب کی توہین کر کے، کروڑوں انسانوں کے دل کو دُکھانے والے جملوں کی پکڑ نہیں کی جائے گی۔ یہ کونسا انصاف ہے، کونسی منطق ہے، اور کونسی آزادی ہے، جو اپنی تحریروں سے پوری قوم کے معتقدات کی توہین کر رہا ہو، اس کے قلم کو کیسے بے لگام رہنے دیا جائے گا۔

سلیم: لوگ کہتے ہیں کہ اس کی باتوں کا جواب دینا چاہئے نہ کہ دھمکی۔

رفیق: بات میں معقولیت ہو تو جواب دیا جائے بلا وجہ کی باتوں کا کیا جواب دیا جائے اور پھر ۱۴ سو سال سے جوابات بھی دیئے جا رہے ہیں، پھر تسلی نہیں ہوتی مطالعہ کیا نہیں جاتا، اسلام کی تعلیم سے کورے اہل علم سے متنفر ان لوگوں کو کون سمجھائے۔ اچھا چلو آپ ایک ایک کر کے تسلیمہ نسرین کی وہ باتیں ذکر کرو، جو وہ اپنی کتابوں میں لکھتی ہے، میں جواب دیتا ہوں۔

سلیم: مثلاً تسلیمہ نسرین کا کہنا ہے کہ قرآن نے: الرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَى النِّسَاءِ کہہ کر عورت ذات کی تحقیر کی ہے، اس پر مرد کی برتری بتلا کر مرد کو عورت پر ظلم کرنے کا جواز فراہم کر دیا ہے اور عورت کو احساس کمتری میں مبتلا کر دیا ہے۔

رفیق: یہ تو عجیب سمجھ ہے، جس بات سے عورت کی عزت اور مرتبہ کا پتہ چل رہا تھا، اسی کو کمتری اور تحقیر پر محمول کر لیا گیا، مرد کو اس آیت میں عورت کا باڈی گارڈ، محافظ اس کے معاملات کا قیم گردانا گیا ہے جو عورت کا اعزاز ہے۔ ''الرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ'' کی تشریح کی

اس تعبیر میں غور فرمالیں، کہیں اس سے عورت کا اصل اور مرد کا تابع ہونا یا عورت کی مرد کے اوپر برتری تو نہیں ثابت ہورہی ہے۔ اس لیے کہ باڈی گارڈ اور محافظ تو بادشاہ کو نصیب ہوتے ہیں، اس کا حفاظتی دستہ ہوتا ہے، جس سے اس کی شان، اس کی بڑائی اور قدر ظاہر ہوتی ہے نہ کہ تحقیر؛ اللہ تعالیٰ نے عورت کے لیے شوہر کی شکل میں اس کو ایک محافظ، ایک باڈی گارڈ اور فداکار اور اس کا قدردان، اس کے جملہ امور کا نگہبان اور ضرورت کا مہیا کرنے والا اعطا کردیا ہے۔ کیا یہ خبر عورت کے لیے تحقیر اور ذلت کا باعث بن سکتی ہے؟ کیا جس بادشاہ کے باڈی گارڈ ہوں، وہ احساس کمتری کا شکار ہوجاتا ہے؟ ہرگز نہیں، بلکہ وہ اس کی شان وشوکت اور منصب کا تقاضہ ہے تو کیا شوہر کی شکل میں عورت کو یہ شان ومنصب کا دیا جانا احساس کمتری کا ذریعہ بنے گا، کیا باڈی گارڈ رکھنا، باڈی گارڈ کو بادشاہ پر ظلم کا جواز فراہم کرتا ہے؟ ہرگز نہیں، تو پھر "اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْن" سے یہ مطلب نکالنا بھی قطعاً غلط ہے اور نا سمجھی کی بات ہے۔

سلیم: تسلیمہ کا کہنا ہے کہ قرآن مجید نے وراثت میں لڑکی کو لڑکے کے مقابلہ میں نصف کا اعلان کرکے عورت کو مرد سے کمتر حیثیت میں مانا ہے، حالاں کہ دونوں ایک ہی ماں باپ سے پیدا ہوئے، ایک ہی گھر میں پلے، بڑھے، پھر یہ امتیاز کیوں کیا؟ یہ لڑکی کا قصور ہے کہ وہ لڑکی کیوں ہے؟

رفیق: اس کی وجہ یہ ہے کہ لڑکی بڑی ہوکر اپنے شوہر کی کفالت میں چلی جاتی ہے، جہاں اس کو مہر بھی ملتا ہے، نان ونفقہ اور مکان بھی ملتا ہے، اور اس کی ضروریاتِ زندگی بھی سب شوہر کے ذمہ واجب ہوتی ہیں، اور ادھر باپ کی میراث بھی بھائی سے آدھی پائی جاتی ہے، جبکہ بھائی، وراثت تو گرچہ بہن سے ڈبل پاتا ہے، مگر اس کو اس ڈبل میں سے اپنی بیوی کا مہر، اس کا نفقہ، سکنیٰ اور ضروریات کی کفالت کرنی پڑتی ہے، جس کے نتیجے میں اس کو یہ ڈبل سنگل سے بھی کم پڑتا ہے، تو چوں کہ لڑکی کو اسلام دوسرے سے دلوارہا تھا، اس لیے لڑکے سے نصف وراثت بھی اس کو کافی تھی اور لڑکے کو بجائے دلانے کے، اسلام اس سے خرچ کرانے جارہا تھا، اس لیے اس کو ڈبل دلوایا، ایک کی کمی کو دوسری جگہ سے پورا کردیا، دوسرے جگہ کی زیادتی کو دوسری ذمہ داری ڈال کر کم کردیا، تو دونوں برابر کی پوزیشن میں آگئے، بلکہ بعض دفعہ لڑکی نفع میں رہتی ہے، البتہ یہ نفع سماج کو جب ہی

نظر آئے گا جبکہ سماج اسلامی قانون کو عمل میں لائے۔

سلیم: تسلیمہ کا کہنا ہے کہ مہر دلاکر اور نان ونفقہ کا کفیل شوہر کو بنا کر شریعت نے عورت کو خود کفیل بننے سے روک دیا اور اس کا اقتصادی استحصال کیا ہے، اس سے کما کر دولت کا مالک بننے کی صلاحیت کو چھین لیا ہے اور اس کو اپنی ضروریات کے لیے کلی طور پر شوہر کا دست نگر، بھکاری بنا کر گھر کی چہار دیواری میں محبوس کرکے قیدی اور غلاموں جیسی زندگی گذارنے پر مجبور کردیا ہے، جو شخص اپنی ضروریات کو پورا کرنے میں دوسرے کا دست نگر ہو، اس کی خود کی کوئی آمدنی نہیں، اس کی جیب ہر وقت خالی ہو، اس میں کیا احساس برتری پیدا ہوگا، وہ ہمیشہ احساس کمتری اور بے بسی کا شکار رہے گا۔

رفیق: افسوس! جو چیز عورت کو تمام فکروں سے فارغ کرکے اور تمام مشقتوں سے نجات دلا کر آرام وراحت اور سکون فراہم کرتی تھی اسی کو غلامی اور قید بتلایا جارہا ہے، کسی سے پوچھو کہ تم جب چار پانچ سال کے بچے تھے تم کو ہر چیز تمہارے والد دلاتے حتی کہ تمہاری ہر چھوٹی بڑی ضرورت کا خیال رکھتے تھے، تم کو اپنے بارے میں اس دور میں کوئی فکر نہیں تھی، ہر بات کا جواب یہ تھا کہ ہم کو کیا فکر، ہمارے ماں باپ سلامت چاہئے ہم کو کس بات کا غم، وہ اس عمر میں اپنے پاس اپنے پیسے بھی نہیں رکھتا تھا، اپنی ماں کو دے دیتا تھا کہ یہ بھی تم رکھو میں کہاں ان کی حفاظت کے جھنجھٹ میں پڑوں گا؟ بتاؤ! وہ اچھا تھا یا یہ کہ اب بڑا ہوکر کمانے اور گھر بسانے کی ذمہ داری میں اور سیکڑوں جھمیلوں میں پڑ گیا، یہ دور اچھا ہے؟ ظاہر ہے کہ ہر آدمی کا یہی خیال اور تمنا رہتی ہے کہ وہ دن کوائے جوانی دے دے ادھار بچپن۔

تو کیا ہی خوش قسمت ہے وہ لڑکی جو بڑی ہوکر بھی وہ ہی بچپن کے عیش اور بے فکری کی دولت سے نوازی گئی ہے کہ نہ کمانے جانا، نہ مارے مارے پھرنا، نہ ٹوٹے گھاٹے کی فکروں میں جان کھپانا، بلکہ آرام سے گھر میں رہ کر اپنے پھول جیسے بچوں کے بیچ میں زندگی گذارنا ہے اور ساری ذمہ داری اللہ کی طرف سے اس کے شوہر کو سونپ دی گئی ہے کہ وہ تمہاری ہر ضرورت کا کفیل اور تمہاری ہر خواہش کا ضامن ہے، افسوس کہ اس کو اس کا استحصال کہا جارہا ہے، غلامی کہا جارہا ہے، احساس کمتری کہا جارہا ہے۔

ع سچ ہے جنون کا نام پڑ گیا خرد اور خرد کا جنون

سلیم: نسرین کا کہنا ہے کہ اسلام نے مرد کو طلاق کا حق دے کر مرد کو ظلم کا جواز فراہم کیا ہے اور عورت کو ہر وقت محل خطر میں چھوڑ دیا ہے جیسے موت کے وقت کا کسی کو علم نہیں ایسے ہی مرد کب طلاق دے عورت کو خبر نہیں، دس بچوں کی ماں ہو اور ۶۰ رسال کی عمر ہو گئی ہو، پیٹ میں نہ آنت ہو، نہ منہ میں دانت، تب بھی نکاح کا یہ معاہدہ طلاق کی شکل میں ایک لفظ سے کینسل ہو جاتا ہے۔

رفیق: طلاق کا حق مرد کو دینا عورت پر ظلم کا جواز فراہم نہیں کرتا بلکہ مرد کو اس اقدام سے گھر کے برباد ہونے، بچوں کے ضائع ہونے اور ان کی پرورش کی مصیبت میں گرفتار ہو جانے کا خوف دلاتا ہے، کہ عورت تو طلاق لے کر مائیکے چلی جائے گی، مگر اس کی یاجوج ماجوج کی فوج کو اب کون سنبھالے گا؟ ان کی چڈی کون دھوئے گا؟

نیز مرد کے پاس طلاق کے حق نے عورت کو ہر وقت محل خطر نہیں رکھا بلکہ آزادی پانے کا ذریعہ بنایا ہے اور عورت کی اس آزادی کے ساتھ شوہر کی قید گھر بار اور بچوں کی نگرانی وغیرہ کے ذریعہ شروع ہو جاتی ہے؛ طلاق کا حق مرد کے ہاتھ میں ایسا ہے جیسے کوئی اپنی ہی کلہاڑی سے اپنی ٹانگ کاٹ رہا ہو، بخلاف عورت کے کہ اس کو تو آزادی ہے، اب گھر میں رہنے سے آزادی، ہی آزادی، بچوں کی دیکھ بھال سے آزادی، خدمت سے آزادی، دوسرے جگہ شادی کر لینے کی آزادی، اس معاہدہ کے کینسل ہونے سے اس کو حاصل ہو گی۔

سلیم: نسرین کا کہنا ہے کہ طلاق کا حق عورت کو بھی دینا چاہئے تھا، کیا اس کو آزادی کی ضرورت عدم موافقت کی وجہ سے نہ ہو گی، یہ حق صرف مردوں ہی کو کیوں دیا؟ یہ انصاف کے خلاف نہیں ہے؟ کیا اس میں عورت کو کمتر سمجھ کر اس کے حق کو ضائع نہیں کیا گیا ہے؟

رفیق: ماں باپ کا وصف ممتا، بچوں سے پیار اور ان کی محبت ہے۔ شوہر جب طلاق استعمال کرتا ہے تو بچے اس سے نہیں چھوٹتے، اس کے پاس رہتے ہیں، لیکن اگر عورت کو طلاق کا حق دیا جاتا اور وہ اس کو استعمال کرتی تو یہ اس کی ممتا پر ایک دھبہ ہوتا کہ اس کو بچوں سے پیار نہیں، اس لیے ان کا خیال نہیں کیا، ان کو چھوڑ کر چلی گئی، ایسی عورت سے پھر کون شادی کرتا جو محبت کے جذبات سے عاری ہو۔

اس لیے اس کو یہ حق نہ دے کر اس کی ممتا جو عورت کا اصل سرمایہ ہے، جس کی وجہ سے وہ

ماں کہلاتی ہے، اس ممتا کی حفاظت کی گئی ہے، ورنہ جذبات میں اگر وہ اس ممتا کا خون کر بیٹھتی، تو اس آزادی کو وہ بہت بڑی قیمت چکا کر حاصل کرتی، جس کے بعد وہ ماں کے وصف سے خالی گردانی جاتی اس لیے یہ حق نہ دے کر تو اس کی عزت رکھ لی گئی ہے اور اس کو گھر بگاڑن کے مذموم لقب سے بچالیا گیا ہے، اب وہ بھگوڑی نہیں کہلائے گی، طالب عیش نہیں سمجھی جائے گی پھر بھی اگر مردوں کا چال چلن خراب ہو، وہ ذمہ داریوں سے فرار اختیار کرتے ہوں اور ظلم وتشدد کے عادی ہوں، شراب وکباب کے اکثر شیدائی ہوں، عورت کو نان نفقہ اور خرچ سے محروم کرنے کے عادی ہوں، تو شرعاً عورت کو حق طلاق کی ایک شکل یہ ہے کہ بوقت نکاح ایک کابین نامہ لکھ کر شوہر کے دستخط کرا لیے جائیں، جس میں یہ صراحت ہو کہ اگر شوہر اِن اِن شرائط کا لحاظ نہیں رکھے گا، تو اُس وقت شوہر کی طرف سے عورت کو اپنے آپ خود طلاق دینے کا حق رہے گا، اس تحریر پر شوہر اور گواہوں کے دستخط لے لیے جائیں، لہٰذا جب بھی شوہر طے کردہ وقبول کردہ شرائط کے خلاف عمل کرے تو عورت کو شرعاً حق ہوگا کہ وہ اپنے اوپر خود سے طلاق ڈال کر شوہر سے علیٰحدگی اختیار کر لے، نہ شوہر کے طلاق دینے کے انتظار کی ضرورت ہے، نہ عدالت میں مقدمہ لے جانے کی۔ صرف دو شخصوں کا یہ گواہی دے دینا کافی ہے کہ اس شوہر نے طے کردہ اور تسلیم کردہ شرائط پر عمل چھوڑ دیا ہے اور اب عورت نکاح کے وقت شوہر کی طرف سے دیئے ہوئے حق کے تحت طلاق اپنے اوپر ڈالنے کی حق دار ہو گئی ہے۔

سلیم: تسلیمہ نسرین کا کہنا ہے کہ شہادت کے باب میں مرد کے مقابلہ میں ۲ رعورتوں کو ایک مرد کے قائم مقام قرار دینا عورت کی تحقیر اور اس کی حیثیت کو مرد کے مقابلہ میں کمتر سمجھنا ہے، جس سے اس میں احساس کمتری پیدا ہوتا ہے۔

رفیق: اس کی وجہ عورت کا مزاج اور اس کی خلقت ہے، وہ بارد مزاج ہے، اس کے بدن سے مرد کے مقابلہ میں رطوبتوں کا خروج بھی زیادہ ہے اور بارد مزاج کا خاصہ ہے کہ اس میں نسیان گرم مزاج والے کے مقابلے میں زیادہ ہوتا ہے، لہٰذا عام طور پر عورتیں نسیان اور بھول جانے کی عادی ہوتی ہیں، ان کو صحیح تاریخ اور واقعات کی اصل حقیقت یاد نہیں رہتی، نیز اس کی پرورش چوں کہ ناز ونعم میں ہوتی ہے، اس لیے وہ نزاع اور خصومت کے مواقع پر کوئی واضح بات بھی نہیں کر پاتی۔ چنانچہ قرآن مجید نے اس کی ان دونوں باتوں

کو ذکر کیا ہے: اَنْ تَضِلَّ اِحدٰاھُمَا فَتُذَکِّرَ اِحدٰاھُمَا الْاُخرٰی۔ کہ اگر ایک بھول جائے تو دوسری یاد دلا دے گی اور کہا: اَوَمَنْ یُّنَشَّؤُا فِی الْحِلْیَةِ وَ ھُوَ فِی الْخِصَامِ غَیْرُ مُبِیْنٍ۔ کہ جو ناز و نعم میں پلا ہو، وہ خصومت کے مواقع پر واضح بات نہیں کر پاتا، کیوں کہ اس کے مزاج اور طبیعت میں اکثر ایسا پایا جاتا ہے۔ لہٰذا اس کا لحاظ رکھ کر اس کے ساتھ ایک عورت کو اور جوڑ کر اس کو تقویت دے دی گئی ہے اس طرح اس کو عدالت اور شہادت کی مجلس میں تنہائی اور شرم سے بھی بچا کر۲ کو ساتھ بلا کر اس کی بات کو پختگی بخشی گئی ہے، کیا زنا کے شاہدوں کی توہین ہے؟ ہرگز نہیں، بلکہ معاملہ کی سنگینی اور سزا کی اہمیت کے پیش نظر ایسا کیا گیا ہے، یہ مشاہدہ ہے کہ عدالت میں بیان اور شہادت کے موقع پر عموماً عورت ذات کمزوریوں اور غلطیوں کا شکار ہوئی ہے، تو کسی طبقہ کے مزاج اور حالات کو سامنے رکھ کر اس کے باب میں کوئی قید لگانا، اس کی تحقیر نہیں ہے، کیا آپ قدرت سے کہیں گے کہ اس نے عورت میں MC (حیض) سسٹم لگا کر اس کی بے عزتی کی ہے، جبکہ مرد میں یہ سسٹم نہیں ہے۔ ایسا نہیں کہہ سکتے، کیوں کہ آپ جانتے ہیں یہ سسٹم عورت میں بحیثیت عورت کے لگایا گیا ہے، اس سے اس کے بچہ جننے اور رحم میں بچے کی غذا کا تعلق ہے مرد کو اس کی ضرورت نہیں تھی اس لیے اس میں کمتر اور بے عزت کرنے کا سوال کھڑا نہیں ہوتا۔

سلیم: تسلیمہ کا کہنا ہے عورت کو پردہ کا حکم دے کر اس کی آزادی چھین لی گئی ہے اس کو گھر میں بند کر کے مرد نے اس کو رِزرو کر لیا ہے اور خود اَن رِزرو، آزاد پھرتا ہے۔

رفیق: عورت اپنی پیدائشی اور فطری کمزوری اور حسن و جمال کی دولت کی وجہ سے غیر محفوظ ہے وہ اپنا دفاع کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی، اس کو اپنی فیکٹری سے خالص اصلی بلا ملاوٹ اولاد پیدا کرنا ہے۔ وہ اپنے بچے کے نسب کو محفوظ رکھنا چاہتی ہے، اس کے لیے اس کو اپنے کو بڑا محفوظ رکھنا پڑے گا، پردہ بھی کرنا پڑے گا، اِدھر اُدھر آزادانہ تنہا پھرنے اور اپنے پارٹنر کے علاوہ کسی کو کمپنی دینے سے بچنا ہوگا، اپنے پارٹنر اور اس کی نسل کو دوسری کمپنی کے مال سے ممتاز رکھنا ہوگا، وہ صرف اپنی ہی ایجنسی کے لیے مال سپلائی کرے گی، اپنے سپلائر کا ہی مال امانت رکھے گی، عورت کی اسی حیثیت کے پیش نظر اس کو محتاط رہنے کی ہدایت ہے، مرد کا پیٹ کسی امانت کا بینک نہیں ہے، اس لیے اس پر اس پابندی

کی ضرورت نہیں تھی، نیز مرد میں اپنے تحفظ اور دفاع کی صلاحیت بھی موجود ہے اور وہ مظہر حسن و حیا بھی نہیں۔

سلیم: تسلیمہ کہتی ہے عورت کو اسلام نے قیادت کا حق نہیں دیا یہ بھی اس کو کمتر سمجھنے کے مترادف ہے۔

رفیق: اس میں بھی اس کی فطری اور خلقی اور مزاجی کمزوریوں کا لحاظ رکھا گیا ہے، نیز قدرت نے اس کو جس مصرف کے لیے پیدا فرمایا ہے وہ مشاغل بھی اس کو اس کام کے لیے فارغ نہیں رکھتے، پھر اس کی قیادت کا میدان اس کا اپنا گھر اور اس کے بچے و گھر کا کام کاج اور خاندان و رشتہ دار ہیں۔ جن میں اس کو اپنی حسنِ معاملگی اور ایک اعلیٰ مربی کا ایسا کردار ادا کرنا ہے تاکہ اس کے زیرِ تربیت بچے باہر کی قیادت اور زیر تربیت بچیاں کسی دوسرے گھر کی ذمہ داریاں سنبھالنے کی اہل ثابت ہوں۔ مرد اپنی فطری اور خلقی و مزاجی صلاحیتوں اور طاقتوں کی وجہ سے اس قیادت کے دوران پیش آنے والی ہر دشواری سے نمٹنے کی بھرپور صلاحیت رکھتا ہے اور قدرت نے اس کے اوقات کو ان مشاغل سے فارغ رکھا ہے جو عورت کو بہ حیثیت عورت ہونے کے مشغول رکھتے ہیں۔

سلیم: تسلیمہ کہتی ہے مرد کو بیک وقت چار عورتوں کو اپنے نکاح میں رکھنے کے حق نے عورت کو مرغیوں اور بکریوں کے ریوڑ میں لا کھڑا کیا ہے، یہ اس کے لیے طبعی کوفت اور قلبی گرانی کا باعث نہیں ہے؟

رفیق: ایک بڑے اور عمومی نفع کی خاطر بعض انفرادی اور خاص گرانیوں کو برداشت کر لیا جاتا ہے، یقیناً یہ عورت کی طبعی گرانی کا باعث ہے مگر خود عورت ورگ کی بعض سماجی و اقتصادی و عفت و عزت و تحفظ اور کفالت کے سیکڑوں مصالح کی خاطر اس کی اجازت دی گئی ہے، ایک کنویں کا پانی کئی گھڑوں میں بھرا جا سکتا ہے لیکن ایک گھڑا کئی کنوؤں کا پانی اپنے اندر ہر ایک کے امتیاز کے ساتھ امانتاً نہیں رکھ سکتا۔

جب لحاف کم پڑ رہے ہوں تو نہ چاہتے ہوئے بھی کئی کئی لوگوں کو ایک ہی لحاف میں سونا پڑتا ہے۔ اسی طرح بے سہارا لوگوں کو سہارا ملتا ہے، مردوں عورتوں میں عددی عدم توازن، بسا اوقات اس فیصلہ کو ناگزیر بنا دیتا ہے کہ تعدد کی اجازت دی جائے۔

نسلِ انسانی کی افزائش اور بقا جو اس عالم کی بقا اور اس کی آبادی کی زیادتی کا موجب

ہے، وہ تعدد ازواج میں زیادہ ترقی پذیر ہوتی ہے کہ ایک مرد چار عورتوں سے بیک وقت چار بچے حاصل کر سکتا ہے جب کہ تعدد شوہر سے یہ مقصد حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ نیز وحدت حاکم اور تعدد محکوم دشواریوں کا باعث نہیں، لیکن اس کا عکس دشواریوں کا داعی ہے، یہ ہی سب مصالح تھیں جن کی وجہ سے عورتوں کے تعدد کو برقرار رکھا گیا، لیکن شوہر کے تعدد کو برداشت نہیں کیا گیا جو عورت کی فطرت کے لیے بھی گراں اور باعثِ تحقیر اور اختلاط نسب کا باعث تھا۔

سلیم: تسلیمہ کا کہنا ہے کہ اسلام کی ہر ہدایت لڑکی کی حیثیت کو کم کر کے دکھلا رہی ہے، کس کس کو گنائیں، دیکھیے بچے کی پیدائش خوشی کا باعث ہونا چاہیے، چاہے لڑکا ہو یا لڑکی، دونوں کی خوشی یکساں منانی چاہیے، اور جس عمل سے بھی اس خوشی کا اظہار کرنا ہے وہ دونوں کے لیے یکساں ہونے چاہیے، لیکن اسلام نے عقیقے میں لڑکے کے لیے دو بکرے اور لڑکی کے لیے صرف ایک بکرا ذکر کر کے، فرق کی دیوار اور امتیاز کے خیال کو تقویت دے دی ہے۔

رفیق: یہ امتیاز کا مسئلہ نہیں بلکہ عقیقہ میں بچہ مرہون ہوتا ہے، جس بچے کا عقیقہ کر دیا جائے وہ ماں باپ کا نافرمان نہیں رہتا اور ظاہر ہے کہ نافرمانی کے جذبات لڑکی کے مقابلہ میں لڑکے میں زیادہ ہوتے ہیں، لہٰذا اس کے عقوق کو ختم کرنے میں زیادہ صرف کرنا چاہیے تھا بخلاف لڑکی کے، اس لیے لڑکے کے لیے دو، اور لڑکی کے لیے ایک جانور کافی سمجھا گیا ہے، نیز لڑکے کو وراثت میں بھی لڑکی کے مقابلہ میں ڈبل ملتا ہے، لہٰذا اس کی طرف سے اس کے شکریہ اور بدلہ میں دو جانور ہی مناسب تھے؛ اور فطری لحاظ سے آدمی بچی کے مقابلہ میں بچے کی پیدائش سے زیادہ خوش ہوتا ہے کہ وہ اس کی نسل کے بقاء اور اس کے گھر میں اس کا نشان اور بدل و جانشیں ہوتا ہے، اس لیے بھی اس کو خوشی میں ذبح ہونے والے جانوروں کا عدد لڑکی کے مقابلہ میں بڑھا ہوا ہونا چاہیے تھا۔

سلیم: تسلیمہ نسرین کا کہنا ہے کہ عورت کو ''ناقص العقل والدّین'' کہا گیا، یہ عورت کی توہین نہیں تو اور کیا ہے۔

رفیق: یہ کہہ کر عورت کو کوئی مجرم یا گنہگار قرار نہیں دیا گیا، بلکہ ایک حقیقی اور واقعی پوزیشن کی صرف خبر ہے کہ دیکھو تم لوگ نسیان کے لحاظ سے ایسی واقع ہوئی ہو کہ تمہارا عدد شہادت

مرد کے مقابلہ میں ڈبل لیا گیا ہے، دوسرے یہ کہ تم کو ایسے طبعی اعذار درپیش رہتے ہیں، کہ جن کی وجہ سے کچھ ایام تم کو نماز جیسے متبرک فریضہ سے بوجہ خروج نجاست کے دور رکھا گیا ہے، یہ ایسا ہی ہے جیسے اللہ کی مخلوق گنّا بھی ہے اور بانس بھی ہے، لہٰذا بانس سے کہا جائے کہ تم باوجود گنّے جیسے ہونے کے، گنّے کی صفات اور خاصیت نہ ہونے وجہ سے ناقص ہو، تم سے شکر حاصل نہیں کی جا سکتی، اس معاملہ میں تم گنّے کا مقابلہ نہیں کر سکتے، تم سے ٹوکریاں تو بن سکتی ہیں مگر شکر نہیں بن سکتی۔

سلیم: تسلیمہ کا کہنا ہے کہ حدیث میں عورتوں کا زیادہ تعداد میں دوزخ میں جانے کی وعید سنائی گئی ہے، کیا یہ عورت ذات کو اللہ کے نزدیک مبغوض بتلانے کے مترادف نہیں ہے؟

رفیق: مبغوض دکھلانے کی بات نہیں بلکہ ان کی عمومی عادتوں پر توجہ دلا کر اس سے بچنے کا علاج بتلایا گیا ہے کہ ناشکری تمہاری عام عادت ہے، جو خدا کو ناپسند ہے، اس کے نتیجہ میں عذاباً دوزخ میں جانا ہوگا، لہٰذا اس سے بچنے کے لیے مال کی وہ محبت جس کی وجہ سے شوہر کی ناشکری کی نوبت آتی ہے کم کرنے کے لیے زیادہ سے زیادہ صدقہ کرو، تا کہ لینے سے زیادہ دینے کا ذہن بنے۔

سلیم: تسلیمہ کہتی ہے کہ عورت کو امامت کبریٰ، نبوت اور امامت صغریٰ، نماز کی امامت دونوں سے محروم کر کے اس کے ساتھ قدرت نے امتیاز برتا اور اس کو اس طرح کم تر گردانا ہے۔

رفیق: سلیم اس کی مثال تو ایسی ہے کہ کوئی کہے کہ قدرت نے بکری کو سواری اور بار برداری کا اہل قرار نہ دے کر اس کے ساتھ ناانصافی کی ہے۔

جناب! جس صنف میں جس کی صلاحیت تھی اُس سے وہ امور قدرت نے متعلق کیے ہیں، عورت اپنی خلقت نہاد، سرشت خانگی مصروفیات اور طبعی اعذار کی وجہ سے ان دونوں امامتوں کی اہل نہیں تھی، لہٰذا اس کو ان ذمہ داریوں سے سبک دوش رکھا گیا ہے۔

سلیم: تسلیمہ نسرین کا کہنا ہے کہ سورۂ یوسف میں عورت کی فطری حیاء و عفت کے خلاف اس کی تصویر کھینچی گئی ہے، جس سے عورت رسوا ہوئی ہے۔

رفیق: عام حالت میں تو عورت حیا کی وجہ سے مرد کی طرف رغبت کے اظہار میں ضبط نفس

سے کام لیتی ہے اور مرد عورت کے بہ نسبت اس مسئلہ میں کمزور واقع ہوا ہے وہ اپنے جذبات پر عام طور پر قابو نہیں رکھ پاتا۔

قرآن مجید نے اس قصے سے بتلایا کہ باوجود اس وصف کے بعض دفعہ حسن کی کشش عورت کو عفت کا دائرہ توڑنے پر مجبور کر دیتی ہے، اور بعض دفعہ ایک مرد اگر اس کو غیرت اور اولوالعزمی کی دولت ملی ہو تو گناہ کے تمام مواقع اور اسباب بآسانی مہیا ہونے کے باوجود خوفِ خدا اس کو کوہِ عفت بنا دیتا ہے اور کسی کی بڑے سے بڑی آمادگی اور دعوت اس کے پائے استقامت اور خوفِ خداوندی کے دائرے سے باہر لانے میں ناکامیاب ہو جاتی ہے اور یہ سب اللہ کی مدد سے ہوتا ہے۔

سلیم: رفیق صاحب! آپ نے ایسے جوابات دیئے ہیں کہ اگر کسی میں عقلِ سلیم ہو اور کسی معقول بات کے ماننے کی سچی طلب ہو تو وہ آپ کے جوابات سے پوری طرح مطمئن ہو جائے گا۔

رفیق: اللہ تعالیٰ ہر شخص کو عقلِ سلیم اور جاننے کا جذبہ عطا فرمائے۔ آمین

سلیم: السلام علیکم۔

رفیق: وعلیکم السلام۔

(۳۸) جہیز اور اسلام

رشید: سعید صاحب! السلام علیکم۔

سعید: وعلیکم السلام۔

رشید: سعید بھائی! آپ یہ بیناڈور میں الماری، ٹی وی، ریفریجیٹر، کولر اور برتن کے کارٹون لے کر کہاں جا رہے ہیں۔

سعید: رشید صاحب! میری بیٹی کی شادی الحمدللہ اسی ماہ میں ہونے والی ہے، لڑکی کے سسرال والوں نے ان تمام چیزوں کا بطور جہیز کے مطالبہ کیا ہے اس لیے یہ سب فرمائشی اشیاء خریدنے پر مجبور ہوں۔

رشید: سعید بھائی یہ لڑکے کے گھر والوں کو کیا ہو گیا کہ بیچارے لڑکی کے باپ سے اتنا لمبا چوڑا مطالبہ کر کے اس کو قرض دار بناتے ہیں اسلام اس کو پسند نہیں کرتا، اس نے تو شادی کو انتہائی آسان اور کم خرچ طریقہ پر کرنے کی ہدایت کی ہے اُسی میں برکت ہے۔

سعید: رشید صاحب یہ بات آپ میرے داماد اور سمدھی کو سمجھایئے مجھے بتلانے سے کیا فائدہ میں تو ان کی فرمائش کے آگے مجبور ہوں آخر لڑکی کے ہاتھ تو پیلے کرنے ہی ہیں، کب تک گھر میں روکے رہیں گے۔

رشید: ارے خلیل بھائی! آپ ہی کے فرزند ارجمند کی شادی خانہ آبادی سعید بھائی کی دختر نیک اختر سے ہونے والی ہے۔

خلیل: جی ہاں! دعا فرمایئے۔

رشید: اللہ تعالیٰ مبارک کرے، مگر خلیل بھائی میں آپ سے ایک بات پوچھنا چاہوں گا آپ خفا تو نہ ہوں گے۔

خلیل: ہرگز نہیں! خفا ہونے کی کیا بات۔

رشید: میں نے سنا ہے کہ آپ نے لڑکی والے سے بہت سا قیمتی سامان جہیز میں مانگا ہے اور مال دینے کی شرط پر ہی شادی طے کی ہے۔

خلیل: آپ نے بالکل صحیح سنا ہے۔

رشید: مگر آپ تو دیندار اور نیک آدمی ہیں جہیز کا مطالبہ تو غیر شرعی بات ہے۔

خلیل: کس نے کہا کہ غیر شرعی ہے، خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بیٹی فاطمہ کو کئی چیزیں جہیز میں دی تھیں جن کی تفصیل حدیث پاک میں موجود ہے۔
نیز حضرت خدیجہؓ جو اُم المؤمنین ہیں، انہوں نے اپنی بیٹی حضرت زینبؓ کو ایک ہار بطور جہیز دیا تھا، جس کو بدر کے موقع پر انہوں نے اپنے قیدی شوہر کو چھڑانے کے لیے بطور فدیہ کے مدینہ بھیجا تھا، جس کو دیکھ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم رو پڑے تھے اور ماں کی یادگار بیٹی کے پاس رہے اس لیے اس کو سب مسلمانوں کی اجازت سے واپس کر دیا تھا۔

رشید: ان معمولی چیزوں کو آج کے اتنے گراں ترین جہیز سے کیا نسبت؟

خلیل: وہ اس وقت کا تمدن اور معیار زندگی تھا، اس وقت ان ہی چیزوں کو کافی سمجھا جاتا تھا، اب زمانہ بہت ترقی کر چکا ہے، معیارِ زندگی بڑھ گیا ہے، ضرورت اور راحت کی چیزوں کا معیار بلند ہوا ہے، لہٰذا آج کے دور میں اسی کے مطابق جہیز میں چیزیں دی جاتی ہیں۔

رشید: خلیل بھائی! دی جائیں، بخشی جائیں، یہ اور بات ہے، دینے کو تو لڑکی والا اپنا پورا مکان دے دے، یہ اس کے اختیار کی بات ہے، مگر مطالبہ کر کے اور بالجبر لینا اور دینے کی شرط پر ہی شادی کے لیے تیار ہونا، یہ سب ناجائز ہیں۔

خلیل: رشید بھائی! آپ اس بات کو اس طرح نہ دیکھیں بلکہ یوں سوچئے کہ جب مسلم سماج میں لڑکی کو وراثت دینے کا فریضہ ترک کیا جانے لگا اور لڑکی والد کے ترکہ سے پوری طرح محروم کر دی گئی، تو اس کی تلافی کی شکل داماد اور لڑکے والوں کی طرف سے یہ نکال لی گئی کہ جہیز میں اتنا مانگ لو کہ لڑکی خالی ہاتھ نہ رہے، تو یہ درحقیقت اس گناہ کی سزا ہے جو وراثت کے فریضہ کے ترک کی شکل میں لڑکی کے اولیا کی طرف سے کیا جاتا ہے، لہٰذا بطور سزا کے ان سے جہیز ضرور وصول کرنا چاہئے۔

رشید: وراثت نہ دینے کا گناہ تو لڑکی کے باپ کے وارثین کرتے ہیں، اس کی سزا خود خدا تعالیٰ ان کو دیں گے، نیز وراثت لڑکی کا حق ہے وہ لے یا نہ لے، سسرال والے مانگنے والے کون؟

سسرال والے ان کو سزا دینے کا حق نہیں رکھتے، وہ تو بالجبر جہیز کی اشیاء وصول کر کے جس پر بجائے لڑکی کے وہ خود قابض ہو جاتے ہیں، ظلم کا ارتکاب کرتے ہیں، اور یہ مال ان کے لیے حرام ہے، لہٰذا ایک مسلمان کو اس سے بچنا چاہئے۔

خلیل: آپ جہیز کی جبری وصولی کے خلاف تو حرمت کے فتوے لگانے میں لگے ہیں، مگر وراثت جیسے اہم فریضہ سے مسلمانوں کی غفلت کے خلاف کوئی مہم نہیں چلاتے۔

رشید: ہم وہ مہم بھی چلا رہے ہیں خدا کرے کہ مسلمان قرآن پاک کے وراثتی قانون پر عمل کرنے والے ہو جائیں، اس کی وجہ سے انشاء اللہ جہیز کے جبری مطالبات ختم ہو جائیں گے۔

خلیل: آپ نے جہیز کو غیر شرعی فرمایا حالاں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اپنی بیٹی کو دیا تو پھر وہ غیر شرعی کیوں کہلائے گا۔

رشید: خلیل بھائی! آپ ایک بات سمجھ لیں کہ اسلامی قانون میں بیوی کی تمام ضروریات کی کفالت شوہر کے ذمہ ہے، بیوی جس معیار زندگی کی عادی ہو، شوہر اپنی گنجائش کے مطابق اس کی کفالت کا مکلّف ہے، حتیٰ کہ بیوی اگر مالدار بھی ہو تب بھی نان، نفقہ اور سکنیٰ، شوہر کو دینا لازمی ہے؛ جب یہ قانون ہے تو پھر شوہر کا بیوی کے والد سے گھر کے سامان، فرنیچر، روپیہ، زیورات اور قیمتی اشیاء کے مطالبہ کا کوئی حق نہیں ہے چہ جائے کہ جبری طور پر اس سے وصول کرنا اور نہ دینے پر دھمکی دینا، عورت کو طلاق دینا، یا اس کو اتنا تنگ کرنا کہ وہ خودکشی کا اقدام کر بیٹھے، کونسی انسانیت ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو حضرت فاطمہ کو کچھ ضروری خانگی سامان دیا تھا، اس کی وجہ یہ تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اولاد کی طرح پالا تھا، شادی کراتے وقت وہ لڑکی والے بھی تھے اور لڑکے والے بھی، لہٰذا آپ نے جو کچھ دیا وہ حضرت علی کی طرف سے ان کے گھر کی ضرورت مہیا کی تھی، اگر چہ اس کو جہیز کہہ دیا گیا تھا۔ جہیز اس سامان کو کہا جاتا ہے جو باپ اپنی بیٹی کو نکاح کے بعد رخصت کرتے وقت بطور بخشش اور یادگار دیتا ہے۔ اسی طرح حضرت زینبؓ کو حضرت خدیجہؓ نے جو ہار دیا تھا وہ بھی ماں کی طرف سے بیٹی کو ایک یادگار تحفہ تھا، نہ کہ شوہر کے مطالبہ پر جبری جہیز۔

سابقہ زمانہ میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی کہ لڑکے والے لڑکی کے ماں باپ سے کسی رقم یا

سامان کا مطالبہ کریں، ہاں لڑکی والوں کی طرف سے لڑکے والوں سے کچھ مال لینے کے واقعات پیش آتے تھے، اس کو بھی شدت سے روکا گیا اور اس کو رشوت میں شمار کیا گیا۔

خلیل: رشید صاحب! لڑکی کو وراثت دینا لوگوں نے ترک کر دیا ہے، تو اگر کوئی باپ اپنی حیات ہی میں اپنے ترکہ کا حساب لگا کر جتنا لڑکی کا حق ہوتا ہے، اتنی مقدار اس کی شادی میں بطور جہیز دے دیا کرے تو اس میں کیا حرج ہے۔

رشید: وراثت تو اس کو کہتے ہیں جو مرنے کے بعد میت کے مال میں سے اس کے ورثا کو دی جائے، زندگی میں اولاد کو عطا اور بخشش کا قانون یہ ہے کہ لڑکا اور لڑکی کو برابر دیا جائے، جب کہ موت کے بعد لڑکی کو لڑکے سے آدھا ملتا ہے، لہٰذا زندگی میں برابر برابر دینا پڑے گا، نیز اگر حیات میں دے دیا پھر مرنے تک جو اور کمائے گا اس میں بھی تو لڑکی کا حق ہوگا، وہ مرنے کے بعد کون دے گا؟ اس کے علاوہ بہت سے والدین ایسے ہیں جن کے پاس کوئی مال نہیں ہے، جتنا محنت مزدوری سے کماتے ہیں اتنا کھا لیتے ہیں، وہ زندگی میں وراثت کا حساب لگا کر کہاں سے دیں گے۔

بہر حال یہ جبری جہیز ماں باپ یا تو قرض سے دیں گے یا ان کی لڑکیاں اس گراں جہیز کے مہیا ہونے کے انتظار میں بوڑھی ہو جائیں گی یا غم میں مر جائیں گی یا خودکشی کر لیں گی یا آوارہ ہو کر گھر کو خیر باد کہہ دیں گی۔

اس لیے معاشرہ کو فساد سے بچانے کا بہترین علاج یہ ہے کہ جہیز کا قطعاً مطالبہ نہ کیا جائے، وقتی طور پر اگر لڑکی کے والدین اپنی خوشی سے کچھ سامان دے دیں تو اس کو قبول کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

کتنے بے غیرت ہیں وہ شوہر جو بیوی کے باپ کے مال سے اپنی زندگی شروع کرنا چاہتے ہیں، غیور شوہر کبھی بیوی یا اس کے باپ کی دولت پر للچائی نگاہ نہیں ڈال سکتا۔

خلیل: رشید بھائی! آپ نے بڑی دل لگتی نصیحت کی ہے، میں ان شاء اللہ اس پر سختی سے عمل کروں گا اور آپ کا یہ پیغام تمام مسلمان نوجوانوں کو پہنچاؤں گا۔

اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ السلام علیکم

رشید: وعلیکم السلام۔

(۳۹) شراب اور اسلام

وسیم: سلیم صاحب! السلام علیکم۔

سلیم: وعلیکم السلام۔

وسیم: سلیم صاحب! یہ نیا ٹرک آپ نے کب خرید لیا۔

سلیم: ایک ہفتہ ہوا ہے۔

وسیم: کیا آپ خود اس کو چلاتے ہیں۔

سلیم: جی ہاں۔

وسیم: تب تو آپ ڈرائیور بھی ہیں مگر بھائی سلیم شراب مت پینے لگنا، یہ لوگ شراب کے عادی ہو جاتے ہیں، الا ماشاء اللہ۔

سلیم: لوگ پوچھتے ہیں کہ شراب پینے میں کیا حرج ہے؟

وسیم: حرج کیوں نہیں، شراب اسلام میں حرام ہے، اس پر سخت وعیدیں قرآن وحدیث میں موجود ہیں۔

سلیم: یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں، قرآن میں تو شراب کو نفع بخش کہا گیا ہے، چناں چہ قرآن میں جوئے اور شراب کے بارے میں کہا گیا ہے، "اِثْمُهُمَا اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا" معلوم ہوا نفسِ نفع تو موجود، اگر چہ گناہ نفع سے زائد ہے۔

وسیم: یہ آیت تو شراب کی حرمت سے پہلے کی ہے، اس آیت کے بعد تو قطعی حرمت کی آیت نازل ہوگئی تھی جس سے شراب ہمیشہ کے لیے حرام قرار دے دی گئی، اس کو "رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ" کہہ کر "فَاجْتَنِبُوْهُ" فرما دیا گیا، لوگ کیوں کہ شراب کے بہت عادی تھے، ایک دم نہیں چھوڑ سکتے تھے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اصلاح کی حکمت کے تحت بتدریج اس کو حرام کیا ہے۔

سلیم: جب شراب اسلام سے پہلے حرام نہ تھی اور اسلام میں بھی ابتدائی دور میں حرام نہ تھی، لوگ پوچھتے ہیں، پھر کیوں حرام کر دیا گیا؟

وسیم: جس طرح انسانی تمدن نے آہستہ آہستہ ترقی کی ہے، اسی طرح انسانی تدیّن کے قوانین بھی اللہ کی طرف سے انسانی ہدایت، اصلاح اور رہبری کے لیے نازل کیے جاتے رہے ہیں، یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دنیا سے پردہ فرمانے سے پہلے انسانی اخلاق ہدایت اور اصلاح کو اس درجہ تک پہنچا دیا گیا، جس کے بعد کوئی درجہ نہیں ہے، اسی قانون قدرت کے تحت شراب کی حرمت بھی بتدریج نازل کی گئی ہے۔

سلیم: شراب کی حرمت کی علت عقل کو خلل سے بچانا ہے جو اپنے اچھے برے میں تمیز کا ذریعہ ہے اور انسان کا وصف ممتاز ہے، لہٰذا اگر کوئی شخص تھوڑی سی شراب پیئے جس سے عقل خلل سے محفوظ رہے تو اس میں کیا حرج ہے۔

وسیم: شراب میں حرمت کی علت اس کا شراب ہونا ہے، عقل کو خلل سے بچانا تو ممانعت کی حکمت ہے اور ممانعت کا حکم علت پر دائر ہوتا ہے نہ کہ حکمت پر، لہٰذا کوئی کتنی ہی کم شراب پیئے تب بھی حرمت کا حکم لگایا جائے گا، قلیل وکثیر کا ایک ہی حکم ہے، جناب تھوڑی پیتے پیتے ہی پھر زیادہ کی عادت ہو جاتی ہے جو سیکڑوں مضرتوں کی حامل ہے۔

سلیم: کوئی پوچھے اس میں کیا مضرت ہے؟ بہ ظاہر تو اس سے نشاط پیدا ہوتا ہے، آدمی زیادہ دیر تک محنت کا کام کر سکتا ہے، کھانا خوب ہضم ہوتا ہے، نیند بھی خوب آتی ہے، جسم مضبوط اور فربہ ہو جاتا ہے، پھیپھڑے کی کمزوری دور ہو جاتی ہے، بہت سی دوائیوں میں اس کو مفید گردانا جا رہا ہے، شراب ملے مشروبات دیر سے خراب ہوتے ہیں، بڑے صدمات اور دماغی انتشار کی حالت میں شراب نوش مست ہو کر اپنا غم غلط کر لیتا ہے، جس کی وجہ سے کچھ وقت کے لیے اس کو سارے غموں سے نجات مل جاتی ہے اور سکون نصیب ہو جاتا ہے، شاعروں کو تو نشے کی حالت میں اشعار کی اتنی آمد ہوتی ہے جو ہوش کی حالت میں نہیں ہوتی، شراب کی تجارت سے لوگ لاکھوں کا نفع کما رہے ہیں، اس کاروبار سے لاکھوں انسانوں کو دھندا ملا ہوا ہے، حکومت بھی اس کی کشید اور فروخت کے ٹھیکے اور ٹیکس کے ذریعہ کروڑوں کما رہی ہے۔

وسیم: سلیم صاحب! آپ نے تصویر کے صرف ایک رُخ کو دیکھا، اس کا دوسرا رُخ یہ بھی ہے کہ اس کے استعمال سے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کے ساتھ ساتھ جسمانی، معاشرتی، تمدنی، اقتصادی، اخلاقی اور امن وامان کے اعتبار سے بے پناہ نقصانات ہیں اور وہ

نقصانات اتنے عام ہیں کہ ہر شخص ان سے واقف ہے، حکومتیں اس کی روک تھام پر لاکھوں روپیہ خرچ کر رہی ہیں، منشیات کی روک تھام آج پورے عالم کا مسئلہ ہے، لاکھوں کا لٹریچر اشتہار، پوسٹر اس کے نقصانات سے آگاہ کرنے کے لیے چھاپے جا رہے ہیں، صحت کے لیے بے حد مضر ہے، وقتی طور پر کچھ توانائی آ بھی گئی تو نشہ اترنے کے بعد تمام اعضاء کمزور ہونے لگتے ہیں، طرح طرح کے جسمانی امراض پیدا ہو جاتے ہیں، ہر مرض میں شرابی کی شفایابی دشوار ہوتی ہے، معاشرے میں شرابی کا کوئی اعتبار نہیں، وہ نشے میں بعض دفعہ بہن بیٹی پر بھی ہاتھ ڈال سکتا ہے، اس کی اولاد اس سے نالاں رہتی ہے، طلاق دینا اس کے لیے ایک کھیل ہے، شرابی آدمی کی اقتصادی حالت چوپٹ رہتی ہے، وہ کبھی پیسہ نہیں بچا سکتا، اس کے گھر کے لوگ پریشان ہو جاتے ہیں، وہ کمائی کے باوجود ترقی کے لحاظ سے پچھڑا رہتا ہے، جائداد بک جاتی ہے، وہ تشدد پر اتر آتا ہے، شراب کے نشے میں بعض دفعہ وہ ملک کی بڑی سے بڑی شخصیت کو موت کے گھاٹ اُتار دیتا ہے، کبھی اپنے ہی مال یا اولاد کو اپنے تشدد کا نشانہ بنا لیتا ہے، گاڑیوں کے اکثر ایکسیڈینٹ نشے ہی کی وجہ سے ہوتے ہیں، جس میں شرابی اپنی جان کے ساتھ دوسرے بہت سے انسانوں کی جان ضائع کرنے کا ذریعہ بن جاتا ہے، ان تمام خرابیوں کی وجہ ہی سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے شراب کو "اُم الخبائث" فرمایا، یہ تمام بُرائیوں کی جڑ ہے، شرابی آدمی اسلام کی تمام عبادات اور اعمال سے دور ہو جاتا ہے اور خطرہ رہتا ہے کہ مرتے دم ایمان بھی کھو دے، آج جو مغربی ملک اس کے دلدادہ تھے وہ بھی اس کی مضرتوں سے تنگ آ کر اس پر روک لگانے پر مجبور ہیں، اس لیے ایک باعزت صحت مند اور دوراندیش انسان بننے اور آخرت میں عذاب سے نجات پانے کے لیے شراب سے ہمیشہ پرہیز ضروری ہے۔

سلیم: وسیم صاحب! آپ نے تو میری دل کی آنکھ کھول دی، واقعتاً شراب ایک لعنت ہے، ہر مسلمان کو اس سے پرہیز ضروری ہے، انشاء اللہ میں آپ کی یہ بات اپنے تمام ڈرائیور بھائیوں کو ضرور پہونچا دوں گا۔ السلام علیکم۔

وسیم: وعلیکم السلام۔

(۴۰) قمار (جوا) اور اسلام

حمید: حامد صاحب! السلام علیکم۔

حامد: وعلیکم السلام۔

حمید: حامد صاحب! آج آپ بہت خوش نظر آ رہے ہیں، مٹھائی کے پیکٹ خرید کے لے جا رہے ہیں، کیا بات ہے؟

حامد: حمید بھائی! آج میری لاٹری نکل آئی ہے، ایک لاکھ روپیہ ملا ہے، اب تو میں ایک شاندار مکان بناؤں گا۔

حمید: حامد صاحب! لاٹری تو جوا ہے، اسلام نے جوے کو حرام قرار دیا ہے، اس کے ذریعہ حاصل ہونے والی رقم کے آپ مالک ہی نہیں ہوتے، اس کا استعمال حرام ہے۔

حامد: جوا تو ایک قسمت آزمائی ہے اور ایک کھیل ہے، ایک بازی ہے، آدمی اس کھیل کے ذریعہ اپنی دولت کو قسمت آزمانے کے لیے خرچ کرتا ہے، اگر کامیاب ہو گیا تو ایک کے لاکھ بن جاتے ہیں، ورنہ تو ایک بھی چلا جاتا ہے۔ جوا مختلف طرح سے کھیلا جاتا ہے۔ بعض طریقوں میں انسان کی ذہانت کو بھی دخل ہوتاہ۔ بہر حال سامنے والے سے وہ پیسہ اس کی رضامندی سے ملتا ہے، وہ اسی شرط کے ساتھ کھیلتا ہے کہ تم جیتے تو میں دوں گا اور میں جیتا تو تم دوگے، تو جب تراضیِ طرفین ہے تو اس میں کیا حرج ہے۔

حمید: جوے میں دوسرے کا مال بلا کسی عوض کے لے لیا جاتا ہے، لہٰذا وہ چاہے اس کی رضامندی سے لیا ہو، ناجائز و حرام ہے، قرآن نے اس کو گناہ اور شیطانی فعل قرار دے کر اس سے باز رہنے کا حکم دیا ہے۔

حامد: حمید صاحب! لوگ پوچھتے ہیں کہ اسلام نے بالآخر اس کو کیوں حرام قرار دیا ہے، جب کہ دولت کمانے کے ذریعوں میں یہ بھی ایک ذریعہ ہے اور کمانے کی تو اسلام نے ترغیب دی ہے؟

حمید: حامد صاحب! یاد رکھئے کسی بھی معاشرے کی خوش حالی اور ترقی کا مدار اس بات پر

ہے کہ ہر شخص اپنی خدمت، محنت، مصنوعات، پیداوار دوسرے کے لیے فراہم کر کے اس سے مال حاصل کرے، مال کسی نہ کسی چیز کا بدلہ ہو، اگر بلا کسی عوض کے دوسرے کا مال حاصل کیا جائے گا تو اس سے پیداوار مصنوعات، خدمت، محنت کاروبار تمام وہ اعمال جس سے ایک قوم کی ضرورت مہیا ہوتی ہیں یہ سب ٹھپ پڑ جائیں گے اور انسان جوے میں جیتنے کی امید میں نہ تو خود کوئی کام کر کے دوسرے کی ضرورت مہیا کرے گا اور نہ اپنی دولت کو کسی کاروبار میں لگائے گا، جب اس کو بلا عوض بیٹھے بیٹھائے دولت ہاتھ آنے کی امید ہوگی تو وہ مشقت کے کام کیوں کرے گا، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ بازار میں اشیاء کی رسد ختم ہو جائے گی جس کے نتیجے میں صارفین اپنی ضروریات سے محروم ہو جائیں گے؛ یہ دنیا ایک دوسرے کے تعاون اور ضروریات کو اپنے ہنر اور صلاحیت کے ذریعہ معاشرہ کو فائدہ پہنچانے کے نظام کے تحت چلتی ہے، جوا کھیلنے والے ان وسیع تر مفاد کے خلاف اپنے اس فعل کے ذریعہ اپنے آپ کو معطّل کر لیتے ہیں؛ پھر خود کھیلنے والے کو بھی ذاتی طور پر نقصان ہے، ہر وقت جیتنا ضروری نہیں، زیادہ تر تو ہار ہی ہوتی ہے، یہ لوگ ہمیشہ کنگال ہی بنے رہتے ہیں؛ جوے میں زیورات، مال و دولت، گھر مکان تک بک جاتا ہے، سارے گھر والے اپنی ضروریات سے محروم ہو جاتے ہیں، جیتنے کے خیال سے دولت لگاتا رہتا ہے اور بار بار ہار کے نتیجے میں ساری دولت ضائع ہو جاتی ہے، ایک منٹ میں مال دار ہونے کے خواب دیکھنے والا ایک منٹ میں فقیر ہو جاتا ہے، اس طرح فرد اور سماج دونوں کی بربادی ہوتی ہے۔

حامد: مگر آج تو پوری دنیا کے ملک، مختلف طرز پر ایسے کاروبار میں لگے ہیں جن میں جوا پایا جاتا ہے، ایسے کھیل اور مشین ایجاد ہوئی ہیں جن میں پیسے ڈال کر قسمت آزمائی جاتی ہے، لاٹری بھی اسی کی ایک شکل ہے، لہٰذا آج کے دور کے ان کھیلوں سے تھوڑی دیر کے لیے تفریحاً فائدہ اٹھا لیا جائے تو کیا حرج ہے؟

حمید: حامد صاحب! اگر چہ یہ سب شکلیں نئی معلوم ہوتی ہیں مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بھی اسی سے ملتی جلتی جوے کی بہت سی شکلیں رائج تھیں، لوگ تفریحاً بھی اور قسمت آزمائی کے طور پر ایسے شغل رکھتے تھے، مگر کیوں کہ یہ عاشرے کی اقتصادی اور تمدنی ترقی کے لیے ایک بے پناہ مضرت اور فرد کی بربادی کا ذریعہ تھا، اس لیے قرآنِ

پاک نے اس کو شیطانی فعل قرار دے کر باز رہنے کی سخت ہدایت کی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آمدنی کو حرام قرار دیا، اس لیے ایک مسلمان کو بہ حیثیت مسلمان، اس عادت کو ہمیشہ کے لیے ترک کر دینا ضروری ہے، ورنہ دنیا و آخرت دونوں کا خسارہ ہے۔

حامد: حمید! آپ نے سچ فرمایا، بس اس سے توبہ کرتا ہوں، اللہ استقامت عطا کرے، آپ دعا فرمائیں، السلام علیکم۔